

پاکستان کے سب سے بڑے اور سب سے زیادہ پڑھنے والے ماہنامے

کراچی

پہلی کہانیاں

JUNE
2013

PDFBOOKSFREE.PK



ان شہادتے میں
میں نے کہا ہے کہ آپ بیعتوں کو جگ بیعتوں میں جگتی کہانیاں
”آتش جنوں“ سلیم فاروقی کے قلم سے
ایک نیا نا قابل فراموش سلسلہ ”مکسٹری“ اور شہزاد احمد کے قلم سے
”مسئلہ یہ ہے“ قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل



کھیل

مملکتِ خدا اڈیا پاکستان کو درپیش بے شمار مسائل دہشت گردی

اور دھماکوں کے درمیان بس یہی شور تھا۔

ایکشن..... ایکشن..... اور ایکشن.....!

سیاست دان، دانشور سماجی رہنما، میڈیا، عدلیہ، افواج پاکستان اور عوام.....

سب کا یہی کہنا تھا کہ ہمارے ملک کو درپیش موجودہ ہر مسئلے کا حل ایکشن ہے!!!

لیکن کیا واقعی ایکشن کے بعد ہمارے ملک کو لاحق تمام مسائل اور بحرانوں کا

خاتمہ ہو جائے گا؟؟

خدا کرے کہ ایسا ہی ہو!..... ورنہ تو یہ ایکشن اس شاعرانہ خیال کی تصویر

ہوگا۔

یہ ایک کھیل ہے ہم خوش عقیدہ لوگوں کا

دیے جلا کے ہوا کی آمان میں رکھنا

ناصر رضا

احوال

سلیم فاروقی قارئین کے درمیان

دوستو.....! ایک طویل عرصے بعد خود کو اپنے قارئین کے درمیان پا کر دل کی عجیب سی کیفیت ہے۔ لگ رہا ہے گویا ہم ایک بار پھر ماضی میں پہنچ گئے ہوں لیکن یہ صرف اور صرف ہمارا تصور ہے۔ کبھی دانش دیروی صاحب (مرحوم) کی آواز کانوں میں گونجتی ہے اور محترم سہام مرزا مرحوم اپنی مخصوص اور بادقار مسکراہٹ کے ساتھ ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ کبھی شمیم نوید (مرحوم) کی پیار بھری ڈانٹ سنائی دیتی ہے۔ غرض یادوں کی ایک یلغار ہے جس نے ہمیں گھیر رکھا ہے۔ کیسے الہڑ سہنے تھے جو دور جنوں میں ٹوٹ گئے! ہم نے جو کچھ بھی سیکھا ان ہی بزرگوں سے سیکھا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مغفرت فرمائے۔ ایسا لگتا ہے جیسے قدرت کے کارخانے میں ایسے لوگ بنا ہی بند ہو گئے ہیں۔ غالباً اللہ نے وہ سانچہ ہی توڑ دیا ہے جس میں ایسے بے لوث، بے غرض اور اپنے کام سے جنون کی حد تک عشق کرنے والے لوگ ڈھلا کرتے تھے۔ ہم تو صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ اب انہیں ڈھونڈ چرائی زین زبیا لے کر!

جب سچی کہانیاں نکالنے کا منصوبہ بنایا جا رہا تھا تو اکثریت نے اس کی مخالفت کی کہ اس زمانے میں اتنے ڈائجسٹ نکلا کرتے تھے جتنے آج کل کی وی چینلر ہیں۔ اکثر یہی خواہوں نے سہام مرزا صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا کہ بھائی ڈائجسٹ میں سرمایہ ضائع کرنے کی بجائے کسی فلاحی ادارے کو دے دو تا کہ کچھ کار خیر ہی ہو جائے کہ ڈائجسٹوں کے اس ”جنگل“ میں ”سچی کہانیاں“ بھی کہیں گم ہو جائے گا لیکن وہ سہام مرزا ہی کیا جو کسی بات کا ارادہ کر لیں اور اسے عملی جامہ نہ پہنائیں۔ وہ اپنی بات پڑے لے رہے اور ”سچی کہانیاں“ نکال کر ہی دم لیا پھر اللہ کے فضل و کرم اور ہماری محنت سے اس کے پہلے ہی شمارے میں ڈائجسٹوں کی دنیا میں گویا ایک لرزہ طاری کر دیا۔ اس کی کوچ کراچی سے خیبر تک سنی گئی۔ ”سچی کہانیاں“ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ یہ پاکستان کا پہلا ڈائجسٹ ہے جس کے دوسرے ہی شمارے کی اشاعت پہلے کے مقابلے میں دگنی سے بھی زیادہ تھی۔

یہ سمجھ لیں کہ ہم نے اس پورے کو اپنے خون جگر سے سنبھالا ہے اس زمانے کے سرد و گرم سے بچایا، ہم نے اسے سجانے، سنوارنے اور اس کا مفرد معیار برقرار رکھنے میں بساط سے بڑھ کر محنت کی۔ شمیم نوید، ہم اور سہام مرزا (معروف ڈراما رائٹر) ابتدائی طور پر اس کے شعبہ ادارت میں تھے۔ اللہ کے فضل و کرم سے یہ پودا چند ہی برس میں ایک تناور درخت بن گیا تو مخالفین کی زبانیں بھی خود بخود

بند ہو گئیں۔ اس دوران میں وقت کی تندوتیز آندھی نے کتنے ہی ڈانچوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ بھارتی الیکٹراک میڈیا کی یلغار نے بے شمار ڈانچوں کو زخمی کر دیا لیکن بفضلِ تعالیٰ ”چچی کہانیاں“ اسی آن بان سے سینہ تانے کھڑا رہا جو ہمیشہ سے اس کا خاصہ رہی ہے۔ اصل میں جس درخت کی جڑیں زمین میں چستی گہری ہوتی ہیں وہ وقت کی تندوتیز آندھیوں کے سامنے اسی طرح کھڑا رہتا ہے اور ”چچی کہانیاں“ کا فخر اس کے مداح ہیں اسے پسند کرنے والے ہیں اور کسی بھی ڈانچسٹ کے مداح ہی اصل میں اس کی ”جڑیں“ ہوتے ہیں۔ ان کی پسندیدگی محبت اپنائیت اور خلوص اگر نہ ہو تو کوئی بھی پرچاتی طویل جنگ لڑ کے فتح یاب نہیں ہو سکتا۔ ”چچی کہانیاں“ پڑھنے والے اسے پسند کرنے والے اور اس میں لکھنے والے ہی تو اصل میں ہماری متاع اور اثاثہ ہیں۔

آپ میں سے بے شمار لوگ مجھے نہیں جانتے ہوں گے کہ جس وقت ”چچی کہانیاں“ سے میرا ناتو ناتو تھا وہ لوگ نرسری میں ہوں معدودے چند لکھاریوں کے جو روز اول سے ہمارے ساتھ ہیں۔ میں ”احوال“ کے توسط سے ”چچی کہانیاں“ کے اُن تمام پڑھنے والوں اور اس میں لکھنے والوں سے درخواست کروں گا کہ اپنی گونا گوں مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر ایک دفعہ پھر ”احوال“ میں شرکت کریں اپنی نگارشات بھیجیں اور ماحول کو اسی طرح گرمادیں جس طرح میرے دور میں ہوتا تھا۔ میں اپنے اُن ساتھیوں سے بھی گزارش کروں گا جو میرے بعد اس کارواں میں شامل ہوئے کہ وہ بھی پابندی سے اور زیادہ سے زیادہ اپنی نگارشات ارسال کریں۔ میں آپ لوگوں کے لیے نیا ضرور ہوں لیکن ”چچی کہانیاں“ تو آپ کے لیے نیا نہیں ہے۔

میں ”چچی کہانیاں“ کے تمام پڑھنے والوں سے خصوصی طور پر یہ درخواست بھی کروں گا کہ وہ ڈانچسٹ کو خوب سے خوب تر بنانے کے لیے تجاویز بھیجیں۔ ادارہ آپ کی رائے اور تجاویز کا احترام کرے گا اور منہ بہ منہ مرزا صاحبہ ناصر رضا صاحب راجا محمود صاحب اور مجھ سمیت ادارتی بورڈ اُن تجاویز پر سنجیدگی سے غور کرے گا اور قابل عمل ہونے کی صورت میں ان پر عمل بھی کیا جائے گا۔

میری کوشش ہے کہ آپ کو آنے والے شماروں میں کچھ خوش گوار تبدیلیاں نظر آئیں۔ اس سلسلے میں آئندہ شمارے سے ”چچی کہانیاں“ میں ایک دلچسپ سلسلے ”اعترافات“ کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ اس سے قبل بھی ”چچی کہانیاں“ میں خاصا مقبول رہا ہے۔

”چچی کہانیاں“ کے قارئین میں بے شمار افراد کو شوہر سے لگاؤ ہے سوان کے ذوق مطالعہ کی تسکین کے لیے آئندہ ماہ سے ”شوہر کہانی“ کا آغاز کیا جا رہا ہے۔ اس میں آپ موجودہ اور ماضی کے شوہر اشارز کی زندگی کے دلچسپ حالات و واقعات پڑھ سکیں گے۔

آخر میں تمام لکھنے والوں اور احوالیوں کے لیے ایک خوش خبری! اول دوم اور سوم آنے والی کہانیوں کی انعامی رقم میں بھی جلد ہی اضافہ کر دیا جائے گا اور ”احوال“ میں چھپنے والے بہترین خط کو بھی انعام سے نوازا جائے گا۔ کہیے یہ خوش خبری پسند آئی؟ اگر اللہ کی رحمت اور آپ دوستوں کا تعاون حاصل رہا تو آئندہ بھی آپ کو بہت سی خوش خبریاں سننے کو ملیں گی۔

یہ تو تھا ہمارا احوال جو کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا۔

آئے اب آپ کے خطوط کی طرف چلتے ہیں۔

☒ (یہ انتہائی محنت سے تیار شدہ سچا سنورا خط ہمیں سرگودھا سے بھیجا ہے مریم شاہ نے۔ انہوں نے اس خط کی آرائش مختلف رنگوں اور شیشوں سے کی ہے۔ محبت ہے ان کی، لکھتی ہیں۔ ”محترمہ منزہ سہام مرزا صاحبہ! خدا تعالیٰ سے دُعا گو ہوں کہ آپ کو غموں کی دھول سے دُکھوں کے گرداب سے شگفتگی کی کڑواہٹ سے اور دشمنوں کی عداوت سے ہمیشہ محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین! ثم آمین!) ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ مورخہ 26 اپریل 2013ء بروز جمعہ المبارک کو بذریعہ رجسٹری ڈاک ملاجئے دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اشتہارات کو نظر انداز کر کے سیدھے ناصر چاچو کے پاس ادارہ میں حاضر کی لوٹائی۔ ناصر چاچو! آخر ہم کب تک حالات کے بدلنے کا انتظار کرتے رہیں گے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ سترہ کروڑ عوام متحد ہو کر اپنے حق کے لیے اٹھ کھڑے ہوں؟ اور جس انقلاب کی بات یہ نام نہاد سیاست دان کرتے ہیں وہ انقلاب کیا عوام نہیں لاسکتے؟ آہا! دیوانے کا خواب! (آپ نے تو خود ہی اپنے خواب کی تعبیر بتا دی۔) راجا جی! آپ تو واقعی زندہ کہانی کے راجا ہو۔ کیا اسٹوری لائے ہیں! ایک دم پرفیکٹ، ”چھلاوا“ ویسے میری بھی ملاقات ہو چکی ہے ایک چھلاوے سے۔ اسے میں نے آفر کی تھی کہ ہمارے ساتھ رہو مگر اس نے ہاتھ جوڑ کر معذرت کر لی۔ (کہ میں کبھی ”چھلاوی“ کے ساتھ نہیں رہ سکتا، یہی بات ہے نا؟) اس ماہ کی خاص کہانی ”ہے یہ عجب کہانی“ واقعی خاص کہانی تھی۔ سڑک کہانی میں ”مداری کا نانک“ بہت پسند آیا۔ گل رخ کی کہانی ”مر کے بھی چین نہ آیا“ اور کوئٹہ قبرستان اور لڑکیاں ایک عجیب شخص وہ میری دشمن جاں اور وہ کون تھے؟ اچھی کہانیاں تھیں۔ سب سے زبردست اور بہترین تجارتی ”پانچواں کلب“ عبدالرؤف تاجوڑ پراسرار محافظ، طیل جبار مومن کا ہتھیار پروفیسر مشتاق حسین رُوح کا سفر، رام زہرا اسرار مٹھی، محمد اقبال زمان صاحب کی رہیں۔ سلسلے وار کہانیوں میں ظاہر ہے آتش جنوں اور مٹھنی کا کون سا مقابلہ کر سکتا ہے؟ شہید کی ڈائری تو ہے ہی لا جواب بے مثال! مجھے سچی کہانیاں کی ایک بات بہت بری لگتی ہے بھلا کیا؟ ”بھئی“ یہ مہینے میں صرف ایک بار آتا ہے اور ختم بھی جلدی ہو جاتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ یہ اتنا اتنا اتنا، اتنا ضخیم ہو کہ اسے پڑھتے ہوئے بھی کم از کم دو مہینے لگ جائیں لیکن پھر بھی دل سیر نہ ہو۔ واہ! کتنا مزہ آئے گا نا! اگر ایسا ہو جائے۔ (آپ کو تو مزہ آ جائے گا لیکن ناصر رضا اور راجا محمود صاحب کی جان ناتواں اس کی تحمل نہیں ہو سکتی۔) ”کچھ اپنے بارے میں“ پروین حیدر صاحبہ کے بارے میں جان کرا چھاگا۔ خیال آرائی میں آصف ریاض کی خیال آرائی بہت اچھی لگی۔ آپ کی ڈائری کے لیے سب کا انتخاب اچھا تھا۔ آخر میں اپنی کہانی کے بارے میں اتنا ہی کہوں گی کہ یہ سب ناصر چاچو کی ذرہ نوازی ہے ورنہ بندی اس قابل کہاں! ارے ہاں! شوق شیکی جی، پہلے تو خلوص بھرا سلام قبول فرمائیے۔ آپ نے میرا سیدہ پسند کیا، شکر ہے۔ ویسے آپ کو میرے خط سے کس قسم کی خوشبو آتی ہے؟ قسم لے لیں، میں نے آج تک کوئی خوشبو استعمال نہیں کی بے شک ”سچی کہانیاں“ سے تصدیق کر لیں، صاف اور سیدھا سادہ سا کاغذ پر قلم سے لکھ بھیجتی ہوں اور تو کوئی بات نہیں۔ (لفظوں کی بھی ایک مہک ہوتی ہے مریم! ان کی مہک تو ہم بھی محسوس کر رہے ہیں۔) اچھا اب خط طویل ہو گیا اس لیے اجازت ہاں ایک عد کہانی بھی ساتھ ہے۔ (کہانی مل گئی ہے قابل اشاعت ہوئے کی صورت میں شائع ہو جائے گی۔)

☒ عمران مظہر، ژوب، بلوچستان سے لکھتے ہیں۔ ”محترم انکل سلیم فاروقی، السلام علیکم! سب سے پہلے خوش

آمدید! ایک عرصے بعد آپ کو احوال میں دیکھ کر اچھا لگا۔ نوے کی دہائی یاد آگئی۔ کیا وقت تھا؟ کیا کیا سہمی تھے۔ امید ہے کہ آپ کا اور ہمارا سفر اچھا رہے گا اور آپ کا تعاون ہمارے ساتھ رہے گا۔ (انشاء اللہ!) سہمی کے شمارے کا سرورق متاثر نہ کر سکا۔ (یہ بھی تو بتائیں کیوں؟) ادارے کا کیا کہنا ناصر سراسر خوبصورتی سے بات کرتے ہیں کہ انسان کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے۔ حالات کو اچھے طریقے سے بیان کیا۔ میرے سوئٹ سے سر ناصر صاحب نے جعفر جمالی صاحب! منزہ صاحبہ کی تعریف کے بعد اب تو مجھے بھی آپ سے ملنا ہے۔ عبدالعزیز جی آ! اکل! آپ ہمیشہ ناراض ناراض سے کیوں رہتے ہیں؟ سب اتنا برا بھی تو نہیں ہے اور نبی کی شادی مبارک ہو۔ تحسین جو خوبصاحب! cool down یہ بتائیے آپ کی سینئر سسٹرز آج کل کہاں ہیں اور کیا کر رہی ہیں؟ راجا جمالی صاحب کی ”چھلاوا“ ناول رہی۔ محمد رضوان قیوم کی ”یہ ہے ایک عجب کہانی“ دلچسپ تحریر تھی۔ اس بار بشیر احمد بھی کی سڑک کہانی واقعی منفرد تھی۔ آتش جنوں بہترین انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ پروین حیدر کی ”وہ ایک جنون“ قاری کو سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ سنبل کی ”مجید نہ کھل سکا“ مریم شاہ کی ”جیسی کرنی ویسی بھرنی“ سلسلی غزل کی ”وہ کون تھے؟“ عبدالرؤف تاجوری ”پانچواں کلہر“ ناول تھیں جگدہ خلیل جبار کی ”پراسرار محافظ“ اچھی سبق آموز تحریر تھی۔ اس کے علاوہ نیناں احمد کی ایک عجیب شخص شازی سعیدی کی لمبیاں لافانی ہیں انجم فاروق کی پراسرار کرا، شتیق شکی کی قبرستان اور لڑکیاں رملہ شاہد کی روم نمبر 38 کارا، قاسم بیخ کی وہ میری بیوی تھی اور کریم بخش پہوڑ کی یہ سچ ہے پڑھنے کے لائق تھیں جبکہ مریم مسعود کی اودر کوٹ بہت مشکل لگی اور پروفیسر مشتاق حسین کی ”مومن کا ہتھیار“ متاثر نہ کر سکی۔ ارشد علی ارشد کی تحریر ”مہسنی“ لاجواب ہے۔ بہترین انداز بیان زبردست واقعات! ہر چیز پرفیکٹ، مستقل سلسلے، سارے بہترین لگتے ہیں سوائے خیال آرائی کے، آپ کی ڈائری کے لیے صفحہ 243 پر ”ترانہ“ نام کا اقتباس میں نے تو نہیں بھیجا تھا پھر میرے نام سے کیوں شائع ہے؟ کوئی اور تو میرے نام سے تحریریں نہیں بھیج رہا؟ (غلطی سے ایسا ہوا ہوگا۔) اور سلیم فاروقی صاحب، اتنا عرصہ آپ کہاں رہے؟ (ہم کہاں رہے؟ اس کے لیے الگ سے ایک شمارہ نکالنا پڑے گا۔) ناصر سر کیسے ہیں؟ انہیں میرا خصوصی سلام دیجیے گا۔ اس کے علاوہ کاشی بھائی کو بھی خصوصی سلام کہیے گا۔ (دونوں حضرات بہ فضل تعالیٰ بہ خیریت اور خوش و خرم ہیں۔ آپ کا سلام ان تک پہنچا دیا ہے۔) راجہ محمود صاحب، قیوم صاحب، منزہ صاحبہ سب کے لیے تسلیات! دعاؤں میں یاد رکھیے گا!

✉ حیدر آباد سے آصف ضیاء رقم طراز ہیں۔ ”امید ہے، مزاج بخیر ہوں گے۔ میری جانب سے سچی کہانیاں اور دوروشیزہ کے اسٹاف کے لیے بے شمار دعائیں اور نیک خواہشات۔ (بہت شکریہ!) پراسرار نمبر سچی کہانیاں میں میری پہلی ہی کہانی کو جو پذیرائی ملی ہے اس کے لیے میں آپ کی اور تمام قارئین کی بے حد ممنون ہوں۔ جنہوں نے میری کہانی کو پڑھا، سراہا اور اپنی گرانقدر آراء سے میری حوصلہ افزائی کی۔ جناب خلیل جبار صاحب، سائل ابرو صاحب، حافظہ مومن شاہ، سدرہ انور علی اور تحسین جو خوبصورت تمبرہ تو اتنا اچھا اتنا خوبصورت تھا کہ میری ساری محنت وصول ہوگئی۔ ان تمام افراد کا ایک بار مزید شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ انشاء اللہ اتنے پیارے پیارے قارئین کے لیے اپنی مزید تخلیقات لے کر سچی کہانیاں کی بزم میں آتی جاتی رہوں گی۔ (ضرور آصف! ہمیں بھی آپ کا انتظار رہے گا۔) بھائی ناصر رضا صاحب! اپریل کے شمارے میں انعامی مقابلے کی فز فز فرست میں اپنا نام دوسرے نمبر پر دیکھ کر خوشی کی انتہا نہیں رہی۔ اس انعام کے لیے میں

ادارہ سچی کہانیاں، محترمہ رخصانہ سہام، آپ کی اور قارئین کی شکرگزار یوں۔ انعام کا اعلان ہونے تقریباً ایک ماہ ہو گیا ہے، 20 مارچ بروز بدھ، شمارہ میرے ہاتھ میں تھا لیکن انعامی رقم مجھے ابھی تک موصول نہیں ہوئی۔ امید ہے آپ اس سلسلے میں مجھے ضرور مطلع فرمائیں گے۔ نوازش، کرم، مہربانی، ٹیٹی فونک رابطہ میں اس لیے نہیں کرتی ہوں کہ آپ کی مصروفیت میں خلل نہ پڑے۔ (اکاؤنٹ کے شعبے سے معلوم کر کے آپ کو اطلاع دیں گے۔ ایسا کبھی ہوتا تو نہیں ہے۔) محترمہ رخصانہ سہام مرزا کی خدمت میں سلام ادب پیش کرتی ہوں۔ امید ہے وہ بفضلِ ربی بخیر ہوں گی۔ (آپ کا سلام اُن تک پہنچ گیا۔ وہ بھی آپ کو دعائیں دے رہی ہیں اور اللہ کے فضل و کرم سے بخیریت ہیں۔)

✍ کراچی سے ہمارے ایک دیرینہ کرم فرما فرید عالم نقشبندی کی آمد! ”محترم ناصر رضا بھائی اینڈ سلیم فاروقی! السلام علیکم! (وعلیکم السلام!) چمکتی دکھتی محفل احوال، سچی کہانیاں کے ساتھیوں اور اسٹاف! آپ سب کو سلام و دعائیں! پراسرار کہانی نمبر 2 منظر عام پر آ کر ہمارے دل میں بس گیا۔ احوال میں 25 تبصرہ نگاروں نے پراسراریت کے خطوط روانہ کر کے پراسرار نمبر کو جگمگا دیا۔ پراسرار نمبر 2 میں 27 پراسرار سبق آموز اور بہترین کہانیوں نے مزہ دیا۔ آپ کی ڈائری، خیال آرائی، پسند اپنی اپنی یاد کے گہرے ساگر میں نقد، ہنر، آپ کی خبر بازداشت، تمام کہانی کاروں اور ان سب کو عقیدت، محبت اور خوشیوں بھرا سلیوٹ مار کر میں ان سب کو مبارک اور سلام پیش کرتا ہوں۔ ناصر رضا بھیا اور منزہ آبی آپ چوپال جیسا سلسلہ شروع کر دیں اور ہاں، تقریباً ایوارڈ سچی کہانیاں کب شروع کر رہے ہیں بتائیں؟ (ادارہ اس جو یز پر بھی سنجیدگی سے غور کر رہا ہے۔ بہت جلد آپ کو خوش خبری سننے کو ملے گی۔“

✍ ساحل اہدؤ ذرہ اللہ یار سے لکھتے ہیں۔ ”باجی منزہ! میں خیریت سے ہوں اور اللہ پاک سے دعا ہے کہ آپ بھی بخیریت ہوں گی۔ باجی منزہ! میں ایک گھنٹے سے سوچ رہا ہوں کہ میں خط میں کیا لکھوں اور کہاں سے لاؤں رنگ برنگے الفاظ جن کی خوشبو سے یہ ادبی محفل مہک اٹھے۔ بہر حال اللہ کرنے ہماری ادبی محبت ہمیشہ ترقی کی راہ پر گامزن رہے اور خاص کر سچی کہانیاں کے خوبصورت رائٹر ہر وقت ہم نوجوان نسل تک ادبی پیغام پہنچانے میں گریز نہ کریں۔ باجی منزہ! اپریل کا شمارہ مجھے کافی تاخیر سے ملا جس کی وجہ سے میں احوال میں شرکت نہیں کر سکا اور اب تک مئی کا شمارہ بھی نہیں ملا ہے جو میں تحریروں پر تبصرہ لکھتا۔ لیٹ آنے کی کیا وجہ ہے؟ یہ تو آپ ہی بتا سکتی ہیں ورنہ یہ پرچہ 25 کو مل جاتا تھا۔ (چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر ایسا ہوا ہے۔ اب انشاء اللہ سچی کہانیاں آپ کو مقررہ تاریخ کو پہنچے گی۔) باجی منزہ! ایک چھوٹی سی تحریر ارسال کر رہا ہوں، اسے قریبی اشاعت میں جگہ دے کر ہمیں شکر یہ کا موقع دیں ورنہ ردی کی ٹوکری ہی ہی تھی۔ (آپ کی کہانی مل گئی تھی اور افسانہ بھی قابل اشاعت ہونے کی صورت میں شائع ہو جائے گا۔) اور ہاں باجی منزہ! ادارے کی طرف سے بھیجا ہوا انعام مجھے مل گیا، بہت بہت شکر یہ۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ احوال میں شرکت کرتے رہیں گے۔“

✍ راولپنڈی سے اصغر علی آسی فیروز پوری پہلی دفعہ تشریف لائے ہیں۔ (خوش آمدید جناب آسی!) السلام علیکم! میرا نام اصغر علی ہے۔ الحمد للہ، عمر کی پیاسی بہاریں گزار چکا ہوں۔ عرصہ پینتیس سال سے ماہانہ ڈائجسٹ کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ ماہانہ سچی کہانیاں ستمبر 2012ء صفحہ نمبر 21 پر آپ کی دی گئی پیش کش پر آپ کے قلم قبیلے میں شامل ہونے کا خواہش مند ہوں۔ گرقبول افتدز ہے عز و شرف! آج سے تقریباً 30 سال پہلے خود پہ

گزری ہوئی ایک واردات، کیفیت بہ عنوان ”خود فراموشی“ کے نام سے ارسال خدمت ہے۔ اگر آپ نے اسے شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کی تو آئندہ بھی حسبِ مقدر لکھ کر بھیجتا رہوں گا۔ (آپ کی کہانی قابلِ اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔) چونکہ میں آپ کے مرویہ قواعد و ضوابط سے نااہل ہوں اور نہ ہی کوئی پختہ کار لکھنے والا ہوں، اگر میری تحریر میں کوئی غلطی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔“

✉ (شیخوپورہ سے) فیصل ندیم شکیل رقم طراز ہیں۔ السلام علیکم! جناب! میرا نام فیصل ندیم شکیل ہے۔ شیخوپورہ کا رہنے والا ہوں۔ میں گزشتہ تین سال سے لاہور کے ایک ڈائجسٹ کے لیے اسٹورین لکھتا رہا ہوں اور اس کے ساتھ تجزیہ بھی۔ اس پر پے کے علاوہ میں نے ملک بھر کے تمام معروف ڈائجسٹوں کے لیے لکھا ہے۔ اس بار سوچا ہے کہ آپ کے ڈائجسٹ سچی کہانیاں میں بھی اپنی تحریر شائع کرواؤں۔ اس کے لیے میں نے ایک کہانی تحریر کی ہے ”ارمانوں کا لہو“ امید کرتا ہوں قارئین کو پسند آئے گی۔ جناب عالی! میں پہلی بار آپ کے ڈائجسٹ میں شرکت کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ آپ ضرور حوصلہ افزائی کریں گے۔ (خوش آمدید بھائی شکیل! آپ کی تحریر معیاری ہوئی تو ہم بھی اسے ضرور شائع کریں گے۔) اگر آپ نے اپنی محفل میں مجھے جگہ دی تو میں آپ کے ڈائجسٹ میں مستقل کہانیاں لکھوں گا۔“

✉ (کوئٹہ سے) شاد ہند رانی کی خیال آرائی! امید ہے کہ آپ اور آپ کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوگی۔ اللہ کے کرم اور آپ کی دعاؤں کی بدولت میں بھی خیریت سے ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین!) دیگر احوال یہ ہے کہ مئی 2013ء کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ سائل بہت حسین اور خوبصورت لگ رہا تھا۔ ناصر بھائی کا لکھا ہوا ادارہ اچھا لگا۔ واقعی آج کل ہمارے ملک پاکستان کے حالات روز بروز ٹھیک ہونے کی بجائے بگڑتے جا رہے ہیں۔ ہر طرف بے چینی کا سماں پھیلا ہوا ہے۔ موجودہ حالات ایک خوفناک منظر نامہ پیش کر رہے ہیں جس کی وجہ سے قوم کا ہر فرد بے چینی کا شکار ہو رہا ہے۔ آئے روز دھماکے اور ٹارگٹ کلنگ کے واقعات میں کئی معصوم جانوں کا ضیاع ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے پیارے ملک کے حالات کو درست کر دے۔ (آمین! تم آمین!) اس مرتبہ میں کسی کہانی پر اظہارِ خیال نہیں کروں گا کیونکہ جب تک مکمل پڑھوں گا تو احوال میں شامل نہیں ہو پاؤں گا ویسے بھی ماہنامہ سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی ہر کہانی کا اپنا ایک انداز ہے۔ اس میں لکھنے والا ہر لکھاری ٹکری انداز میں لکھتا ہے اس لیے اس کا ہر لفظ معیاری ہونے کی ضمانت ہے۔ میں نے پہلے بھی ایک خطہ ذریعہ رجسٹری آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس میں ایک افسانہ ”حوالی بے بسی“ اور ایک آزاد نظم بھی وہ ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ اب بھی آپ کی خدمت میں ایک افسانہ ”بیٹے لمبے“ اور ایک آزاد نظم بھیج رہا ہوں۔ برائے مہربانی قریبی شمارے میں جگہ دے دیجیے گا۔ میری طرف سے ماہنامہ سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کو محبت بھر اسلام! (سچی کہانیاں کی پوری ٹیم کی طرف سے) علیکم السلام! آپ کا افسانہ ”بیٹے لمبے“ اور آزاد نظم مل گئی ہے۔ قابلِ اشاعت ہونے کی صورت میں جلد ہی شائع ہو جائے گی۔“

✉ سرگودھا سے ممتاز احمد کا نامہ! ”بہت اچھی بہنا منزہ جی! السلام علیکم! آپ کی صحت، سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے رب کے حضور دعا گو ہوں۔ مئی کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ احوال کی خوب صورت چمکتی دکتی محفل میں حاضر ہوں۔ سب سے پہلے اُن تمام دوستوں اور بہن بھائیوں کا دل سے ممنون و مشکور ہوں جنہوں نے

جون 2013ء

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر سیر حاصل تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا، اگر یہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام اور مکمل پتہ:

ا س و ا

میری کہانی ”ہوس زر“ کو پسند فرمایا اور ان کی پسندیدگی کے نتیجے میں پانچویں انعام کی حقدار ٹھہری۔ اپنی چھوٹی اور بیماری بہنوں سدرہ انور علی اور صائمہ سحر کو ان کی سالگرہ پر اپنی اس دعا کے ساتھ پیش کرتا ہوں کہ خوشیاں عزت سکون پیار اور صحت زندگی کو بہت خوبصورت بناتے ہیں۔ اللہ آپ کی زندگی میں کسی ایک کی بھی کمی نہ کرے۔ (آمین!) قابل عہد احترام برادر محترم عبدالعزیز جی آ صاحب جناب! کیسے ہیں آپ؟ میرا خلوص بھرا سلام قبول فرمائیں۔ جی آپ کچھ بات ہو جائے شماره مئی کے بارے میں۔ احوال میں سب دوستوں کے خطوط اور تبصرے شان دار تھے۔ ادارے میں ناصر رضانا عمدہ الفاظ میں حالات کے بارے میں لکھا۔ شہید کی ڈائری میں سفر آخرت کے حوالے سے ایک اچھی کاوش اور چھبھوڑ دینے والا بہت ہی فکر انگیز پیغام تھا۔ مجموعی طور پر اپنے پراسرار موضوع کی مناسبت سے تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ سب لکھاریوں نے اپنے اپنے قلم کے خوب جوہر دکھائے۔ کہانیوں کا معیار قابل تحسین تھا۔ ”آپ کی ڈائری کے لیے“ میں شریل اقدس کا انتخاب بہت عمدہ تھا۔ آخر میں تمام پیاروں کو شفا یابی اور مرحومین کی بخشش و مغفرت کے لیے پاک پروردگار کی بارگاہ میں بہت سی التجاؤں اور دعاؤں کے ساتھ اس پیغام کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ کسی دوست کو فضول نہ سمجھیں کیونکہ جو درخت پھل نہیں دیتا وہ سایہ ضرور دیتا ہے۔ اللہ کریم سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین!) انشاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو! خدا حافظ! ”آپ کی خبر“ کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ 26 جولائی کو میری سالگرہ ہے۔ آپ سے اور سب دوستوں سے دعاؤں کی درخواست ہے۔ (ہماری طرف سے سالگرہ کی ایڈوا اس مبارک باد بھائی ممتاز! ہمیشہ خوش رہیں۔)

✍️ (جنک آباد سے ہماری ایک اور ہم درینہ اور سچی کہانیاں کے ہراول دستے کی ساتھی صفیہ سلطانہ مغل کی آمد! لکھتی ہیں۔ محترم ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! ڈیڑھ منظرہ جی! سلامت رہو۔ حیران ہو رہی ہوگی کہ مخاطب تو ناصر رضا کو کیا ہے؟ آداب آپ کو کرتی ہوں؟ (اور جواب سلیم فاروقی دے رہے ہیں۔) دراصل گزشتہ کئی برس سے قلم اس نام سے اتنا مانوس ہو چکا ہے کہ خود بہ خود ہی پھیل جاتا ہے اور سنائے منظرہ جی! کیا حال ہیں؟ تمہارے تباہ کن بارشوں نے ہمارے گھر وندے کو مٹا ڈالا تھا۔ (بہت افسوس ہوا صفیہ.....!) اب الحمد للہ ہم نے نکاح کا چن کر پھر ایک آشیانہ بنالیا ہے۔ اس تک دو ویں اتنے من رے کہ دو شیزہ اور سچی کہانیاں میں تو اتنے سے خط ہی نہ لکھ سکے۔ اب یکم اپریل کو ہم اپنے نئے گھر میں شفقت ہو گئے ہیں مگر زندگی کی طرف لوٹنے میں ابھی بہت وقت لگے گا۔ (زندگی کی طرف لوٹنے میں؟ اسی کا نام تو زندگی ہے صفیہ! اچھے چپے حب روایت ملتے رہے۔ دو شیزہ باہم بہت تاخیر سے ملتا رہا سوچنے اور مصروفیت کے چند لمحات کشید کرنے میں ہی تاریخیں بدلتی رہیں۔) اب دو شیزہ بھی انشاء اللہ آپ کو بروقت ملے گا۔ ناصر رضا صاحب کی بے پناہ پیار بھری ڈانٹ پر (اس میں بھی پیار ہی ہوتا ہے اور اصرار بھی۔) پراسرار کہانی لکھی مگر سامان زندگی کی منتظر کی پروہ بھی ایسا ہو گئی سو بے حد معذرت امانی ڈیڑھ کہانیاں پڑھیں اب ان کی پراسرار میت میں وہ اسرار نہیں رہا اس لیے کہ واقعات میں یکسانیت ہے۔ اب ”جن“ حضرات نے بھی ہار تسلیم کر لی ہے کہ انسان ان سے بہت آگے ہیں۔ پروین حیدر کے بارے میں پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں لیکن بہت اچھی نہیں۔ کہنا قدرے مشکل ہے۔ منظرہ جی! اس بار فقط اتنا ہی وقت کم ہے۔ (اور مقابلہ سخت!) اگلے ماہ وعدہ ہے کہ بہت مصل خط ہوگا اور ہاں شریف اکیڈمی (جرمنی) یا اکیڈمی حاجی شریف احمد کے بیٹے شفیق مراد صاحب نے ان کے نام پر بنائی ہے جس میں تعلیم

جون 2013ء

سچی کہانیاں

میں اپنی پسند کا تراشہ بھیج رہا رہی ہوں جسے میں نے

نامی کتاب کے صفحہ نمبر..... سے اتارا ہے۔

میرا نام و پتہ:

MINI MAG

جون 2013ء

میرا پسندیدہ شعر الگ کاغذ پر ہے اسے شامل کر دیں

شاعر:

شعر بھیجنے والے کا نام:

پتہ:

پسند
اپنی
اپنی

دلچسپ اور انفرادیت کی حامل۔ شہید کی ڈائری منظرہ سہام کا ایک بہترین سلسلہ ہے۔ اگر ممکن ہو تو اس میں کسی شہید کا مختصر مختصر تذکرہ بھی ہو تو کیسا رہے گا؟ تاریخی شہر خوشاں مکی قبرستان پہ محمد اقبال زمان کی تحریر بھی اچھی تھی۔ معروف رائٹر پروین حیدر کی ادب سے وابستگی کو سلام پیش کرتے ہیں۔ سچی کہانیاں جس طرح اپنے پرانے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے وہ یقیناً قابل ستائش ہے۔ عکاشہ سحر نے خالد احمد کو اچھے الفاظ میں یاد کیا: خالد احمد ایک درویش صفت وضع دار اور انکسار کا پیکر تھے۔ ان کی بہنیں حاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور ادب کا ایک بڑا نام ہیں۔ اسی طرح بڑے بھائی تو صوف احمد خان کا شمار بھی معروف کالم نگاروں میں ہوتا ہے۔ سہام مرزا صاحب کا آخری صفحہ ”بارگشت“ آج بھی ہمارے حالات کا حقیقی عکاس ہے۔ الیکشن قریب ہیں ہر پارٹی اپنی اپنی ذیلی اپنا اپنا راگ بجا رہی ہے جو تلوڑ کے ذریعے اپنا مفاد بچ جائے اقتدار مل جائے ملک رہے نہ رہے۔ ایک گلہ تھا آپ نے پراسرار نمبر 11 کے حوالے سے گزشتہ دو ماہ سے اس پراسرار نمبر کے لیے لکھنے والوں کا نام ایک اشتہار کی صورت دیتے رہے مگر جب نمبر شائع کیا گیا تو اس میں اس ناچیز کی تحریر نہیں تھی۔ (عین وقت پر یہ بات ہمارے علم میں آئی تھی کہ آپ کی کہانی نہیں ہے۔) امید ہے آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گے۔

✉ (راولپنڈی سے یہ خط ہے ہمارے ہمدردیرینہ محمد سلیم اختر کا، لکھتے ہیں۔ ”عزیزہ منظرہ بہن! السلام علیکم! امید ہے آپ بہ خیریت ہوں گی۔ دوشیزہ اور سچی کہانیاں کی کامیاب و کامران مدیرہ اعلیٰ ہونے کے ساتھ ساتھ کالم نگاری مبارک ہو۔ ایک بھائی ہونے کے ناتے مجھے آپ کا یہ نیا سفر نہ صرف خوب صورت لگ رہا ہے بلکہ سفر بھی ہو رہا ہے۔ کوشش ہوگی کہ آپ کا کوئی کالم اور کوئی کتاب پڑھنے سے رہ نہ جائے۔ آپ کی مزید کامیابیوں اور کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔ برادر محمد سلیم فاروقی کو احوال کی باگ سنبھالنے پر مبارک باد! خوش آمدید بھائی بی! (شکر یہ سلیم بھائی! اب آپ پابندی سے ”احوال“ میں حاضری بھی لگوا میں گے۔) مئی 2013ء کا پراسرار نمبر اسامنے ہے۔ مسائل خوبصورت ہے، ”کل کیا ہوگا؟“ اس بارے میں اب ہم کیا کہیں کل کیا ہوگا؟ شاید سوال کرتے کرتے اس کا جواب طلب کرتے ہوئے زندگی گزر جائے گی ناصر بھائی! مگر ہمیں اس کا جواب نہیں ملے گا۔ (استاد امان کا ایک شعر ہے۔

کی ہونا ہے کی ہووے گا؟

اے سوچ دے سوچ دے مر جاں گے)

میں ان تمام بہن بھائیوں اور دوستوں کا شکر یہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میری والدہ صاحبہ کی وفات پر دکھ کا اظہار کیا اور میرا غم بانٹا۔ بھائی ممتاز احمد برادر مرانا محمد شاہد و قاسم حسین، بہن نصرت سرفراز، عزیز ی حسین، جو بیو بی بی مریم شاہ، سمدہ انور علی، کنول عمران خان، بہنا نام عادل، محترم خلیل جبار اور دیگر تمام احوالیو! میں آپ سب کا ممنون ہوں اور آپ کے احساسات اور جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ پروردگار آپ سب کو کبھی رکھے۔ (آمین!) (بھائی سلیم اختر! ہمیں تو اس سامنے کا علم ہی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!) راجا محمود صاحب نے اسرار کی دنیا کے ایک اہم کردار ”چھلاوا“ سے بھر پور انداز میں متعارف کرایا ہے۔ مبارکباد کے ساتھ دعا میں اور یہ امید کہ ان کا قلم یوں ہی موتی بکھیرتا رہے گا۔ شہید کی ڈائری ”ہر بار دل و دماغ اور سوچ کے نئے باب کھولتی ہے اور یہ آپ کے قلم کا ہنر اور کمال ہے۔“ مداری کا نالگ، بشیر احمد بھٹی نے عوامی کہانی لکھ کر سچی

کے فروغ کے لیے اقدامات کیے جاتے ہیں۔ دنیا بھر کے ادباء اور شعراء کو ایک پلیٹ فارم پر لایا گیا ہے، ان کی کتابوں کی اشاعت میں معاونت کرنا، ایوارڈز دینا اور ان کی کتابوں کی بلامعاوضہ دنیا بھر میں ترسیل کرنا! میں اس کا مکمل تعارف لکھ کر ارسال کر رہی ہوں کیوں کہ میں جب تک آباد میں اس اکیڈمی کی ڈائریکٹر ہوں۔ اس کا سالانہ کنونشن 16 اپریل 2013ء کو لاہور میں ہوا تھا۔ پلیز! اسے ضرور شائع کیجیے گا۔ اس کی تصاویر میں پرچے کے ای میل ایڈریس پرنٹل کر دیتی ہوں۔ 8 اپریل کو جس دن ہماری روانگی تھی اس روز ہم رضوانہ کوٹر کے بے پناہ اصرار پر ان کے گھر بھی گئے لیکن زمر نعیم اور نسیم نیازی سے ملاقات نہ ہو سکی۔“

✉ (مور شاہد حسین نظام کی قلمر شہداد کوٹ سے آمد! (بھائی شاہد! قلمر اور شہداد کوٹ دو الگ الگ نام ہیں۔ ہم خود قلمر کے ہیں اس لیے جانتے ہیں کہ قلمر شہداد کوٹ ضلع تو ہے لیکن دونوں میں بہت فاصلہ ہے۔) قابل احترام اہل سلیم فاروقی! السلام علیکم! بھلی کرے آیا۔ ہم آپ کو اس حسین محفل میں دلی گہرائیوں سے well come کہتے ہیں۔ اللہ سائیں آپ کو سدا خوش سلامت رکھے۔ (آمین!) انکل ایک گزارش ہے کہ آٹھی منظرہ سہام نے پنجابی صاحبہ کو خوب چلایا۔ اب بے چاری تھک چکی ہوگی۔ پلیز! پنجابی صاحبہ کو آپ مکمل آرام کرنے دیں تاکہ ہم کچھ باتیں شیئر کر سکیں۔ (اصل میں پنجابی صاحبہ فضول باتیں برداشت نہیں کرتیں اور تھکنے کا تو یہ نام بھی نہیں لیتیں۔) بچپن کی محبت راس نہیں آئی۔ (شاہد صاحب! یہ تو آپ کے پڑھنے لکھنے کے دن ہیں محبت وغیرہ کے لیے تو ابھی عمر بڑی ہے۔) آپ اپنی بینا تاج! اسلگرہ مبارک ہو۔ صائمہ آپی! اسلگرہ اپریل میں تھی اور آپ نے بتایا ہی نہیں؟ سسر حسین جو پنجابی صاحبہ! پلیز! آپ بھی کوئی تحریر پڑھنے کو دینا! آپ نے صرف پڑھنے کا ٹھیکہ لیا ہے؟ سدرہ انور علی! بہنا! یاد رکھنے کا بے حد شکر یہ۔ شاہد فراز بھائی! السلام علیکم! کیسے ہیں بھائی! آپ؟ پیارے انکل! کچھ مصروفیات کے باعث چند کہانیاں پڑھی ہیں بہت پسند آئی ہیں۔ اسرار سے بھر پور ہیں۔ انشاء اللہ، سولا خیر کرے! اگلی بار مکمل تمہرہ کریں گے۔ آٹھی منظرہ سہام اور انکل ناصر رضا کی خدمت میں سلام و دعائیں پیش ہیں۔ اب ایک کہانی اور غزل کے ساتھ حاضر ہوں! اگر سچی کہانیاں کے معیار پر پوری اترے تو کسی قلمی شارے میں جگہ دے کر شکر یہ ادا کرنے کا موقع دیں۔ اب اجازت! آپ کی کہانی اور غزل موصول ہوئی۔ قابل اشاعت ہونے کی صورت میں شائع ہو جائے گی۔“

✉ (بورے والا سے رانا محمد شاہد لکھتے ہیں۔ ”مئی کا سرورق پیلر گلوں کے ساتھ ملا۔ ماڈل کا زود تھوڑا کم ہوتا تو زیادہ اچھا لگتا۔ گزشتہ دو ماہ سے سرورق بائیں طرف سے جڑا ہوتا ہے اس کی کوئی خاص وجہ؟ (اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ دو ماہ سے ٹائل دو تہہ میں جا رہا ہے۔) ناصر بھائی کے ادارے کے حوالے سے تو یہی کہیں گے کہ حالات اب اتنی جلدی بدلنے والے نہیں ہیں! تبدیلی کا نعرہ اپنی جگہ مگر جو حالات برسوں میں خراب ہوئے ہوں وہ چند ہفتوں، مہینوں یا برس میں ٹھیک نہیں ہو سکتے۔ مئی میں الیکشن ہیں۔ دُعا ہے کہ ایسے لوگ سامنے آئیں جو حالات کی بہتری کی بنیاد رکھیں کیونکہ جب تک بنیاد ہی صحیح نہ رہی جائے گی حالات ٹھیک ہونے کی امید رکھنا کار عبث ہے۔ خصوصی خط میں آپ کے استاد محترم شاہد حسن کی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ رسالے کی سرکولیشن بڑھانے کے لیے خلیل جبار کی تجویز بہت معقول ہے ویسے بھی آج مارکیٹنگ کا دور ہے جب تک آپ اپنی چیز کی ایڈورٹائزنگ نہیں کریں گے اس کی پیل میں اضافہ نہیں ہوگا۔ ایک طلسماتی کردار ”چھلاوا“ پہ راجا صاحب کی تحقیق دلچسپی اور معلومات سے بھر پور تھی۔ رضوانہ قیوم کی کہانی دانوشی عجب کہانی تھی

ہوگی۔ اب آتے ہیں رسالے کی جانب پر اسرار نمبر ۱۱، گزشتہ تمام پر اسرار نمبروں ہی کی طرح پر اسراریت، حیرت انگیز واقعات، سسپنس اور ماورائی و آسبئی مخلوقات کے واقعات سے مزین تھا۔ رات میں پڑھنے سے حتی الامکان پڑھیں، کیا کہ میرا دل ویسے بھی کمزور ہے۔ اگر رات میں حسب عادت پڑھتی تو شاید اگلا پورا مہینا ڈرتے ہوئے ہی گزرتا۔ بہر حال یہ جہان فانی ایسے واقعات سے بھر ہوا ہے جسے ہماری معلومات اور علم میں اضمات کے لیے ”سچی کہانیاں“ کی پوری ٹیم نے کھل اور آسان زبان میں پھر پورا انداز میں ہم تک پہنچایا۔ یوں تو چھلاوا (راجا محمود) سے لے کر اسرارِ مکملی تک ہر کہانی پھر پورا اسرار لیے تھی مگر پھر بھی خاص طور پر مداری کا نائیک (نشیہ احمد بھٹی) کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی، بہترین نائیک پر زبردست کہانی رہی۔ شہید کی ڈائری میں منظرہ سہام نے گناہ شہید کے ایسے راز افشا کیے جو کامیابی کا راز ہیں۔ واقعی دنیا تو عارضی پڑاؤ ہے اصل سفر تو آخری سفر ہے۔ کئی آسان اور سادہ زبان میں انہوں نے ایک ملک سے دوسرے ملک کے سفر کی مثال دے کر یہ بتایا کہ زاد راہ کی کس قدر اہمیت ہے اور اگلے پڑاؤ کی تیاری ہی اصل کامیابی ہے۔ سچ لکھا، اچھا دوست اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اور ہم احوالیوں کو سچی کہانیاں کی پوری ٹیم اچھے اور پر خلوص دوستوں کی طرح شمسوں ہوتی ہے جو بے غرض بے لوث پیار قارئین میں تقسیم کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک دفعہ احوال میں شمولیت کے بعد دل چاہتا ہے کہ یہ پر خلوص رابطہ برقرار رکھا جائے اور اپنی ہزار ہا مصروفیات کے باوجود ہم احوال میں ضرور شامل ہونا چاہتے ہیں۔ سچی کہانیاں کے تمام لکھنے والے اس رسالے کی کہکشاں میں جھلملاتے ستاروں کی طرح ہیں، دل چاہتا ہے میرا خط بھی خصوصی خط کے طور پر احوال میں شامل ہو جائے۔ اس دفعہ تو مشکل ہے شاید یہ آرزو بھی نہ بھی پوری ہو ہی جائے۔ ایک کہانی ایک سوچ اور ایک شاعری روانہ کر رہی ہوں۔ امید ہے کہ اگر قابل اشاعت ہوئی تو شامل اشاعت کر کے شکر یہ کا موقع ضرور فراہم کریں گی۔ واقعی لگتا ہے کہ حالات ساکت ہیں۔ ایک جمود طاری ہے۔ سازشیں جوڑ توڑ مفاد پرستیاں جو سہام مرزا (مرحوم) نے 1993ء کے ادارے میں لکھا، آج بھی من و عن ہیں ہے۔ قوم کے لیے مکی کا مہینا ایکشن کی تو یاد لایا ہے، کیا یہ ایکشن ہمارے ملک کی تقدیر بدل دے گا؟ کیا ہم بھی باوقار قوموں کی طرح سر اٹھا کر جینا سیکھ لیں گے؟ ہم 1993ء سے لے کر آج 2013ء تک معجزوں کے انتظار میں ہیں، معجزے بلٹ پروف گاڑیوں میں بیٹھ کر فن خطابت کے مظاہرے دکھانے سے نہیں آتے۔

موج بڑھے یا آندھی آئے دیا جلانے رکھنا ہے
گھر کی خاطر سو دکھ جھیلے گھر تو آخر اپنا ہے

ویسے بھی بقول سہام مرزا ویسے جلا کے ہوا کی امان میں رکھنا ہی تو ہم خوش عقیدہ لوگوں کا کھیل ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ آنے والے ایکشن کا نتیجہ جو بھی ہو، کوئی معصوم جان نہ جائے۔
۰۷ مئی تک مجھے جو خطوط موصول ہوئے، وہ شامل احوال کر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد جو خطوط موصول ہوں گے، میں آئندہ شمارے میں ان کی صرف رسید ہی دے سکوں گا۔
اب اجازت دیں۔ زندگی رہی تو آئندہ ماہ ملاقات ہوگی۔

آپ کی دُعاؤں کا طالب
سلیم فاروقی

کہانیاں کی شان بڑھائی ہے۔ بھائی سلیم فاروقی کی ”آتش جنوں“ حسب معمول تیز رفتار اور جنوں کی گردش تیز کرنے والی تحریر ہے جو عرصہ تک یاد رکھی جائے گی۔ تینوں ناقابل یقین کہانیاں واقعی ناقابل یقین ہیں۔ بہن پروین حیدر نے جنوں کو بھر پورا انداز میں نمایاں کیا ہے۔ ان کی کہانی ان ہی کی زبانی نے ان کی زندگی کے گوشوں کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی زندگی اور خدمات کو بھی اجاگر کیا ہے۔ پروین بہن! آپ نے خوب اور سچ لکھا اور بہت اچھا لکھا۔ میری دُعا میں آپ کے ہمراہ ہیں۔ آسب کہانی میں مریم معبود کی ”اور کوٹ“ اور انجم فاروق کی ”پر اسرار کمرہ“ نے مزہ دیا، مبارک باد! ارواح کہانی میں مریم شاہ کی ”جیسی کرتی ویسی بھرتی“، ”سرفہرست زہی“، جرم و سزا کے موضوع پر بہترین کہانی ہے۔ مریم شاہ! مبارک باد! اندازِ تحریر بھی بھلا تھا۔ عروہ و عدنان اور عدنان فردوس کی کہانیاں بھی واقعی لحاظ سے کم نہ تھیں ان کے لیے بھی مبارک اور دعا میں۔ جناب شری، سلمیٰ غزل بھی اچھی کہانیاں لے کر آئی ہیں اور پرچے کی رونق میں اضافہ کر رہی ہیں۔ ”پر اسرار محافظ“ خلیل جبار حسب معمول چین کر تحریر لائے ہیں۔ ارم زہرا کی میرے شہر کی کہانی اور محمد اقبال زمان کا ”اسرارِ مکملی“ حسب معمول رہا۔ ”مٹھنی“ دل میں اترنے والی تحریر ہے۔ ارشد علی ارشد کا قلم دل کو چھو رہا ہے، مبارک باد! سید مستقیم نوشاہی کے خالد زاد بھائی کی وفات کا دکھ ہوا۔ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ گو شہید کے بھانجے رانا محمد شاہد صاحب کے والد سدرہ انور علی کی بہن عائشہ انور کی صحت اور سلامتی کے لیے دُعا میں۔ پروردگار ان کے ساتھ عافیت والا معاملہ فرمائے۔ (آمین!) بھائی عبدالعزیز جی آ کو بیٹی حنا عزیز کی شادی مبارک ہو۔ پروردگار اس کی ازدواجی زندگی کو حسین بنانے رکھے۔ (آمین!) بہن صفیہ سلطانہ صاحبہ! بیٹے کی منگنی کی مبارک یاد قبول کریں۔ دو شیزہ میں بارشوں کی وجہ سے آپ کے گھر کے نقصان کا پڑھا۔ بھائی کے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کریں۔ آپ کا مجھ پر ایک احسان ہے جسے میں بھلا نہیں سکتا۔ میری طرف سے اسٹاف کے تمام اراکین کو سلام اور دعا میں۔ یاد آیا، آپ نے مجھے بہترین کارکردگی پر ”سچی کہانیاں“ کے ایوارڈ سے نوازا تھا۔ اب 13 اپریل 2013ء کو مجھے ہانمانہ ”ٹریٹمنٹ ڈائجسٹ“ لاہور نے بھی ایوارڈ سے نوازا ہے۔ اس تقریب میں دو شیزہ اور سچی کہانیاں کے رائٹرز سٹیج بھی ایوارڈ لینے آئے تھے۔ بہن نسیم نیازی زمر نعیم اور نسیم ناز صدیقی کو بھی مبارک باد! ایک تحریر اگست کے شمارہ کے لیے ”آزادی کی قیمت“ کمپوز شدہ جو یہ کہ نام سے ارسال ہے۔ (تحریر موصول ہو چکی ہے بھائی!.....)“

✉ (اسلام آباد سے نصرت سرفراز لکھتی ہیں۔ ”مدیر اعلیٰ منظرہ سہام ناصر رضا صاحب“ راجا محمود صاحب اور سلیم فاروقی صاحب! السلام علیکم! (وعلیکم السلام!) ماہ مئی 2013ء کا سچی کہانیاں دیدہ زیب سروق کے ساتھ 28 اپریل کو ہاتھ میں تھا۔ ماڈل کی ہلکے پیلے لباس میں رونمائی گرمی کی آمد کا پتا دے رہی تھی۔ (کیا پیلا رنگ گرمی کی علامت ہے؟) سروق ماہ گزشتہ کی طرح بیروت ہی تھا۔ احوال میں ہر دو روز پر مدیر اعلیٰ منظرہ سہام قارئین کے درمیان موجود ہیں جنہوں نے آئندہ ماہ سے احوال میں سلیم فاروقی صاحب کی موجودگی کی نوید سنانی، خوش آمدید سلیم صاحب! (بہت شکر یہ!) گزشتہ ماہ منظرہ سہام سے ٹیلی فون پر گفتگو کا شرف حاصل ہوا۔ احوال میں وہ جس قدر پر خلوص انداز میں احوالیوں کو جوابات دیتی ہیں، ٹیلی فون پر گفتگو میں اور بھی زیادہ پر خلوص اور دوستانہ مزاج کی محسوس ہوئیں۔ میری خوش قسمتی کہ ان سے بات کرنے کا اعزاز حاصل ہوا اور ان کا بہت شکر یہ کہ انہوں نے مجھ ناچیز سے بات کرنے کا وقت نکالا۔ احوال میں ان کی کمی شدت سے محسوس

راجہ محمود

اُس ”کھیل“ سے اس ”کھیل“ تک

اوج یعقوبی کا خیال

تو فیض عزم ہو تو مسافت کا کیا سوال
منزل یہاں سے پاس نہ منزل یہاں سے دور

کرکٹ کے میدانوں سے سیاست کے خارزاروں تک چینی عمران خان کی دلچسپ کہانی

کرکٹ بننا اس کا شوق تھا جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ جنون میں تبدیل ہوتا چلا گیا اور یہ جنون اس پر اپنے ننھیالی کزنز کو دیکھ کر سوار ہوا تھا حالانکہ وہ ابھی نو برس کا تھا مگر اُس نے قومی کرکٹ ٹیم میں کھیلنے کا خواب دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اُن دنوں جاوید برکی اور ماجد خان کا نام کرکٹ کے حوالے سے ملک بھر میں گونج رہا تھا۔ یہ دونوں اُس کے ننھیالی کزنز تھے یعنی اس کی والدہ کے خاندان سے تھے۔ انہیں دیکھ کر اُس کے دل میں بھی یہ خواہش شدت کے ساتھ انگڑائیاں لیتی تھی کہ وہ بھی اس کھیل میں نام پیدا کرے اور اپنے اُن کزنز کی طرح گیند بے سے نمایاں کارنامے انجام دے۔ اُس بچے کا تعلق پٹھان قبیلے سے تھا اور پٹھان کے دماغ میں جو سودا سما جائے یا وہ جس چیز کے حصول میں لگ جائے اسے حاصل کر کے ہی چھوڑتا ہے چنانچہ وہ بچہ بھی پڑھنے کے ساتھ ساتھ کرکٹ میں بھی محنت کرنے لگا۔ نیازی قبیلے سے تعلق رکھنے والے اس بچے کا نام عمران خان نیازی تھا۔ اس کے والد اکرام اللہ خان نیازی سول



”اعترافات“

قارئین! ”سچی کہانیاں“ میں آپ کی شرکت اور دلچسپی کے لئے ایک بار پھر مقبول سلسلے ”اعترافات“ کا آغاز کیا جا رہا ہے جس میں آپ اپنے تجربات ہمارے ساتھ شیئر کر سکتے ہیں جو کہ آپ کے دل و ضمیر پر بوجھ بن گئے ہیں۔ اپنے اس بوجھ کو آپ کاغذ پر منتقل کیجئے اور ہمارے حوالے کر دیجئے اور ہو سکتا ہے آپ کا یہ اعتراف کسی اور کو بھی بھٹکنے سے پہلے راہِ راست پر لے آئے، آپ کا یہ اعتراف نہ صرف آپ کا بوجھ ہلکا کرے گا بلکہ معاشرے کے سدھار کا بھی باعث ہوگا۔

انجینئر اور گورنمنٹ کٹر لیکٹر تھے۔ پنجاب کے شمال مغربی علاقے میانوالی میں برسوں سے رہنے والی یہ پڑھی لکھی ایریڈل کلاس ٹیچی اپنی پشتون روایات سے بندھی ہوئی تھی۔

25 نومبر 1952ء کو لاہور میں آنکھیں کھولنے والے عمران خان نے گھر میں جو ماحول دیکھا وہ عام پٹھان گھرانوں سے قدرے مختلف تھا۔ والدین خود پڑھے لکھے تھے اس لیے تعلیم کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ گھر میں وہ ختیاں بھی نہ تھیں جو عموماً خواتین کے معاملے میں پٹھانوں میں صدیوں سے نافذ تھیں۔ اکرام اللہ کے پانچ بچے تھے جن میں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا عمران تھا تاہم گھر میں بیٹیوں کو بھی وہی اہمیت دی جاتی تھی جو عمران کو ملتی تھی۔ بیٹیاں بھی اپنی خاندانی روایات میں رستے ہوئے علم کے زیور سے آراستہ ہو رہی تھیں۔ چونکہ گھر میں کوئی بھائی نہیں تھا اس لیے عمران کی پرورش چاروں بہنوں کے درمیان ہوئی تھی شاید یہی وجہ تھی کہ شروع ہی سے اس کی شخصیت میں شرمیلا پن آ گیا تھا۔ وہ اکثر خاموش خاموش سا خوابوں کی دنیا میں کھویا رہتا۔ گھر میں روپے پیسے کی کمی نہ تھی لہذا عمران کا بچپن تمام تعیشات کے ساتھ گزارا۔ فرمائش منہ سے نکلنے کی دیر ہوتی تھی، پلک جھپکتے میں پوری ہو جاتی تھی۔ ماں اور بہنیں بھی اپنے اگوتے بھائی کے تمام لاڈ پیار کے باوجود تربیت کے معاملے میں کسی بھی لاڈ خوب خوب اٹھاتیں تاہم اس طرح کا سمجھوتہ نہ تھا۔ باپ کا رویہ یوں تو بچوں کے ساتھ دوستانہ اور پیار و محبت سے لبریز ہوتا تھا مگر جب کسی سے کوئی خطا ہو جاتی تو برداشت نہیں کیا جاتا تھا۔ ایسے موقع پر والد روایتی پٹھان کے روپ میں نظر آتے تھے۔ وہ بچوں کو سرزنش بھی کیا کرتے اور اکثر سزا بھی دیتے۔ تربیت کے اس متوازن عمل کے باعث

عمران کو بہت چھوٹی عمر میں ہی احساس ہو گیا تھا کہ زندگی کچھ خاص اصولوں اور قواعد و ضوابط کے ساتھ گزرتی ہے اور زندگی میں صرف عیش و آرام کی چھاؤں ہی نہیں بلکہ محنت و مشقت کا تپتا صحرا بھی ہے جسے پار کیے بنا کامیابی کا ملنا محال ہے لہذا اس نے بچپن میں ہی سوچ لیا تھا کہ زندگی سے جو کچھ حاصل کرنا ہے اس کے لیے وہ جان توڑ محنت اور کوشش کرے گا اور اپنے مقصد کو حاصل کر کے رہے گا۔ بچپن میں خود سے کیا جانے والا یہ عہد تمام عمر زاوہہ کی صورت اس کے ہمراہ رہا اور وہ زندگی کے ہر موڑ پر اپنے اس عہد پر مضبوطی سے ثابت قدم رہا۔ عمران کا تعلیمی سلسلہ لاہور کے کیتھڈرل اسکول سے شروع ہوا۔ اس انگلش میڈیم اسکول میں اس نے ابتدائی کلاسز بہت ہونہاری سے پاس کیں اور پھر اسے انگلینڈ بھیج دیا گیا جہاں وورسٹر کے رائل گرامر اسکول میں اس کا ایڈمیشن ہوا۔ انگلینڈ میں کرکٹ سب سے پسندیدہ کھیل ہے اور مختلف کاؤنٹیز کی اپنی اپنی ٹیمیں ہیں جن کے درمیان سال بھر مقابلے ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں آ کر عمران کو اپنے کرکٹ کے شوق کو بہت جلا ملی اور ماہر کھلاڑیوں کے ہمراہ کھیلتے ہوئے اس کے کھیل میں بھی نکھار آتا گیا۔ انگلینڈ کی ٹھنڈی فضاؤں میں گزرے وہ ماہ و سال عمران کی زندگی میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اسے بہت کم عمری میں ہی انگریز قوم کو قریب سے دیکھنے اور ان کے مزاج، عادات اور فطرت کے بارے میں آگاہی ہو گئی تھی جو اس وقت اس کے بہت کام آئی جب وہ ایک انٹرنیشنل کھلاڑی کے روپ میں انگلینڈ میں کاؤنٹی کرکٹ کھیلنے گیا۔ انگلینڈ سے واپسی پر اس نے لاہور اپنی کن کالج میں داخلہ لیا اور پھر 1972ء میں بیس برس کی عمر میں کالج آکسفورڈ چلا گیا جہاں



کرکٹ چھوڑ کر جانا پڑتا تھا۔ اس دوران اس نے آکسفورڈ یونیورسٹی ٹیم کے لیے بھی کرکٹ کھیلی۔ 1971ء سے 1976ء تک وورسٹر شائر کے لیے کاؤنٹی کرکٹ بھی کھیلی۔ اس وقت عمران اوسط درجے کے میڈیم پیس بولر کی شناخت بنا چکا تھا۔ اسی عرصے کے دوران عمران نے پاکستان

میں مختلف اداروں کی ٹیموں کے لیے بھی کھیلا جن میں ڈاؤنڈسٹریز اور بی آئی اے شامل ہیں یوں اس دوران اس نے ہر طرح کی کرکٹ کھیلی خواہ وہ فرسٹ کلاس کرکٹ ہو، کاؤنٹی کرکٹ ہو، ادارتی کرکٹ ہو یا پھر قومی کرکٹ۔ اتنی زیادہ اور مختلف ماحول کی کرکٹ سے اس کے کھیل میں تیزی سے نکھار آتا چلا گیا اور وہ بہترین کرکٹر کے روپ میں ابھرنے لگا تھا۔ عمران کے ون ڈے کیریئر کی ابتدا ٹیسٹ کیپ ملنے کے تین برس بعد ہوئی۔ ٹیسٹ کی طرح اپنا پہلا ون ڈے بھی اس نے انگلینڈ کے خلاف ہی کھیلا تھا جو انگلیم کے مقام پر ہوا تھا۔ گریجویٹیشن کرنے اور وورسٹر شائر سے کاؤنٹی کرکٹ کا دورانیہ مکمل کرنے کے بعد 1976ء میں عمران کی واپسی ہوئی تو اس نے باقاعدہ طور پر قومی کرکٹ ٹیم کو جوائن کر لیا۔ اب وہ ٹیم کا مستقل ممبر تھا۔ اُن دنوں 1976-77ء کے کرکٹ سیزن کا آغاز تھا۔ اس سیزن میں اسے نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے خلاف سیریز کھیلنے کا موقع ملا۔ ان دونوں سیریز میں نوجوان عمران پہلے کے مقابلے میں قدرے تیز بولر کے روپ میں سامنے آیا تھا۔ اس کی رفتار بھی بڑھ گئی

فلسفہ سیاست اور معاشیات جیسے مضامین کا انتخاب کیا۔ کالج (Eble College)۔ اس نے سیاست میں لینڈ کلاس اور معاشیات میں تھریڈ کلاس میں گریجویٹیشن کیا۔ تعلیم کے دوران ہی عمران کے کرکٹ کیریئر کا آغاز ہو گیا تھا۔ سولہ سال کی عمر میں اس نے لاہور

1992ء میں ورلڈ کپ اٹھائے تقریر کرتے ہوئے

سے اپنے فرسٹ کلاس ڈیبیو (debut) کیا تاہم یہ کوئی حتمی کن آغاز نہیں تھا۔ اس کی رفتار ٹیسٹیں رہی۔ 1970ء کے اوائل میں وہ چند سال لاہور کی مختلف ٹیموں کے لیے کھیلا جن میں لاہور اے، لاہور بی، لاہور گرین اور آخر میں لاہور شامل ہیں۔ فرسٹ کلاس کرکٹ کا یہ عرصہ 1969ء سے 1971ء تک تھا۔ ان چند سالوں میں اس نے جتنی کرکٹ کھیلی وہ بی بی سی کے سلیکٹرز کو اپنی جانب راغب کرنے کے لیے کافی تھی۔ یوں ٹیسٹ کرکٹ کھیلنے کے لیے اسے زیادہ دن انتظار نہیں کرنا پڑا۔ سال 1971ء میں عمران کا ٹیسٹ ڈیبیو ہوا۔ اپنا پہلا ٹیسٹ اس نے انگلینڈ کے خلاف برمنگھم میں کھیلا۔ وہ عمران کے لیے ایک یادگار دن تھا اس روز جب اسے ٹیسٹ کیپ ملی تو فخر سے اس کا سینہ تن گیا۔ گراؤنڈ میں اترتے ہوئے اس کے ذہن میں بس یہی بات گردش کر رہی تھی کہ وہ دنیا بھر میں اپنے کھیل کے ذریعے خود کو منوانے گا۔ قومی ٹیم میں اس کے سفر کا آغاز ہو گیا تھا مگر یہ سفر تسلسل سے جاری نہیں تھا کیونکہ 19 سالہ عمران اُن دنوں آکسفورڈ میں پڑھ رہا تھا۔ تعلیمی مصروفیات کے باعث اسے

تھی اور اس میں ورائٹی بھی آگئی تھی ساتھ ہی مختلف کنڈیشنز کو کس طرح استعمال کرنا ہے اس کے بارے میں وہ بہت حد تک واقف ہو گیا تھا۔ اب وہ انتہائی مہارت سے بار کر بھی پھینکتا تھا باؤنسر بھی کرتا تھا آؤٹ سوئنگ اور ریورس سوئنگ بھی کرتا تھا کیونکہ 1971ء سے 1976ء تک اس نے بہت کرکٹ کھیلی تھی اور ہر قسم کی کنڈیشن میں اسے اپنے جوہر دکھانے کا موقع ملا جس سے وہ منجھ گیا تھا۔ آسٹریلیا کی سیریز کے بعد عمران ویسٹ انڈیز گیا جہاں اس کی ملاقات ٹونی گریگ سے ہوئی جس نے عمران کو کیری پیکرز اور لڈ سیریز کرکٹ کے لیے سائن کر لیا۔ ان ہی دنوں پر تھ میں تیز رفتار بولرز کا مقابلہ ہوا جس میں دینائے کرکٹ کے اُس وقت کے تمام ہی فاسٹ بولرز نے حصہ لیا۔ اُن میں نوجوان عمران خان بھی شامل تھا۔ اس مقابلے میں اس نے 139.7 کلومیٹر کی رفتار سے باؤننگ کرا کے دنیا کے تیسرے تیز رفتار بولر کا اعزاز حاصل کیا۔ یہ مقابلہ جیف تھا سن نے جیتا تھا جبکہ دوسرے نمبر پر مائیک ہولڈنگ رہے تھے تاہم عمران کے لیے اعزاز کی بات یہ تھی کہ ڈینس لی اور اینڈی رائٹس جیسے بولرز رفتار میں عمران سے پیچھے رہے تھے۔



خانگی زندگی کے خوشگوار ایام خان اپنی سابقہ اہلیہ جمنا کے ساتھ

1982ء وہ سال ہے جب عمران فاسٹ بولر کی حیثیت سے پیک پر نظر آیا۔ اس سال اس نے محض 9 ٹیسٹ میچوں میں 13.29 کی اوسط سے 62 وکٹیں حاصل کیں۔ یہ کسی بھی فاسٹ بولر کا ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ میں ایک

28 برس بعد فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس میچ میں عمران کی انفرادی کارکردگی اور کپتانی دونوں ہی زبردست رہیں۔ یہی نہیں، قیادت کے پہلے سال خان کی کرکٹ عروج پر رہی۔ اس نے فاسٹ باؤنسر اور آل راؤنڈر کی حیثیت سے اپنی کارکردگی سے اُن ناقدین کے منہ بند کر دیئے جو کپتانی ملنے پر تنقید کر رہے تھے کہ اس کی انفرادی کارکردگی متاثر ہوگی مگر خان کو



عمران خان جمنا اور لیڈی ڈیانا

کھلاڑیوں کو پہنچاتا تھا۔ میرا مطلب ہے ابتدائی دنوں میں ٹیم میٹنگز میں شرم و جھجک کی وجہ سے میں اپنے ساتھیوں سے براہ راست بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عمران نے 48 ٹیسٹ میچوں میں کپتانی کی جن میں سے 14 میں کامیابی حاصل ہوئی 8 میں شکست اور 26 ٹیسٹ میچ ڈرا ہوئے۔ اسی طرح بطور کپتان 139 ایک روزہ میچوں میں 77 جیتے 57 ہارے اور ایک ٹائی ہوا۔ یوں ناقد کی حیثیت سے اس کی کامیابی کا تناسب شاندار رہا۔ کپتان کی حیثیت سے اپنے دوسرے میچ میں ہی عمران نے پاکستان کو لارڈز کے میدان میں انگلینڈ کے خلاف شاندار فتح دلوائی۔ یہ جیت اس لحاظ سے بھی شاندار تھی کہ انگلش سرزمین پر پاکستان کو

عمران خان میں خامیاں سہی مگر لالچی نہیں ہیں سابقہ اہلیہ جمائما



جمائما خان نے ایک بار عمران کے کردار کے حوالے سے بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ انہوں نے عمران خان کو کچھ رقم ادھار دی تھی جو انہیں واپس مل چکی ہے۔ جمائما کہتی ہیں کہ عمران خان میں بعض خامیاں ہیں مگر وہ جھوٹے اور لالچی نہیں ہیں۔ عمران خان کی سابقہ اہلیہ جمائما خان نے سماجی ویب سائٹ پر اپنے ایک پیغام میں واضح کیا کہ پاکستان تحریک انصاف کے چیئرمین لندن کا فلیٹ فروخت کر چکے ہیں اور اس بارے میں وہ جھوٹ نہیں بول رہے۔ جمائما نے کہا کہ عمران خان نے ان سے 2003ء میں کچھ رقم ادھار لی تھی جو اپنا لندن کا فلیٹ فروخت کر کے واپس کر دی تھی۔ ان کا کہنا ہے عمران خان نے لندن کا فلیٹ کرکٹ کے ذریعے حاصل کی ٹی اے پی آئی سے خریدا تھا۔ جمائما نے کہا کہ انہیں یقین نہیں آتا کہ عمران خان سے ان کی طلاق ہو چکی ہے۔ عمران میں کچھ خامیاں ضرور ہیں لیکن وہ جھوٹے اور لالچی انسان نہیں ہیں۔

عمران خان ہوتو ہم سب کو ہرا سکتے ہیں پھر یہی سوال لے کر مذکورہ صحافی عمران خان کے پاس گیا۔ خان صاحب نے چند لمحے توقف کیا پھر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے انڈین ٹیم کا کوئی کھلاڑی نہیں چاہیے بلکہ ان کے امپائرز گریمرے ساتھ ہوں تو میں پوری دنیا کو ہرا سکتا ہوں۔“ یہ جواب دراصل انڈین امپائرنگ پر لطیف طنز تھا۔ بنگلور ٹیسٹ میں بھی پاکستانی کھلاڑی انڈین ٹیم کے ساتھ ساتھ ان کے امپائرز سے بھی نبرد آزما تھے۔ اس ٹیسٹ کی آخری اننگ میں نانس امپائرنگ کی حد ہو گئی تھی۔



سینیل گواسکر جو عمران خان اپنے دونوں صاحبزادوں کے ہمراہ بیچ دیکھتے ہوئے کی قائدانہ صلاحیتوں

پر انگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔ سال 1987ء میں ہی ورلڈ کپ کا انعقاد ہوا جس کی میزبانی پاکستان اور بھارت نے مشترکہ طور پر کی تھی۔ پاکستانی ٹیم فل فام میں تھی ٹیم میں جاوید میانداد، سلیم ملک، اعجاز احمد سمیت بہترین بیٹسمین تھے تو عمران خان، وسیم اکرم اور عبدالقادر کی صورت میں زبردست ہاؤنڈنگ ایک تھا۔ قوم کو پوری امید تھی کہ اس بار عالمی کپ کی حقدار پاکستانی ٹیم ہی ہوگی پھر ٹورنامنٹ شروع ہوا تو پاکستان پول بیٹوں میں اپنے حریفوں کو پچھاڑتا سہی فائنل تک پہنچ گیا۔ راؤنڈ

طوفانی گیندوں کا سامنا کرتے ہوئے اکثر بھارتی سو راؤں کی ٹانگیں کا نپتی تھیں۔ اس سیریز کا اختتام ہوا تو خان بطور کپتان ایک سال کے دوران 13 ٹیسٹ میچوں میں 88 وٹس لے چکے تھے۔ انڈیا کے خلاف سیریز جہاں ہر لحاظ سے عمران کے لیے شاندار رہی وہیں تھوڑی تکلیف دہ بھی ثابت ہوئی۔ اس سیریز میں شدید جان ماری کے باعث خان کی پتھری میں اسٹریس فریکچر ہو گیا۔ انگری اتنی شدید تھی کہ اسے دو سال سے زائد عرصے تک کرکٹ سے دور رہنا پڑا۔ ایسے موقع پر جب خان اپنی پرفارمنس سے کرکٹ شائقین کو محظوظ کر رہا تھا اور مخالف نیوں کے چکھے چھڑا رہا تھا اس نوعیت کی انگری اس کے لیے خاصی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ جس ٹیپو اور ردیم کے ساتھ وہ کرکٹ کھیل رہا تھا اسے دیکھتے ہوئے باآسانی کہا جاسکتا تھا کہ خان کی ریکارڈ بک میں بہت سے کارناموں کا اضافہ ہوتا۔ خان کا علاج حکومتی فنڈ سے ہوا ان کی انگری 1984ء تک ٹھیک ہو گئی پھر انٹرنیشنل کرکٹ میں خان کی کامیاب واپسی ہوئی۔ 1987ء میں پاکستانی

کے میچ میں اس نے ویسٹ انڈیز جیسی ٹیم کو بھی ہرا دیا تھا۔ یہی فائنل میں پاکستان کا سامنا آسٹریلیا سے ہوا۔ قذافی اسٹیڈیم میں کھیلے جانے والے اس اہم ترین میچ میں کراؤڈ کھپا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شائقین پاکستان جیت کے لیے پر جوش تھے مگر شام کو جب اس میچ کا نتیجہ آیا تو سب ہی کی توقع کے خلاف تھا کسی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ پاکستان ٹورنامنٹ سے باہر ہو گیا ہے اور حسب سابق ورلڈ کپ کے یہی فائنل میں ہمت ہار دی ہے۔ بلاشبہ یہ اُس وقت کی مضبوط ترین ٹیم تھی جبکہ ہوم گراؤنڈ اور ہوم کراؤڈ کا ایڈوائیج بھی حاصل تھا مگر محض 18 رنز کی کمی سے پاکستان فتح دور ہو گئی اور آسٹریلیا فائنل میں پہنچ گیا۔ دوسری طرف بھارت بھی انگلینڈ کے ہاتھوں شکست کھا گیا اور فائنل میں دور واری حریف انگلینڈ اور آسٹریلیا کے مد مقابل ہوئے حالانکہ کرکٹ کے پینڈتوں اور پاک بھارت کرکٹ شائقین کو پوری توقع تھی کہ فائنل میں پاکستان اور بھارت ہی پہنچیں گے لیکن ہوا اس کے بالکل الٹ۔ 1987ء کا وہ ورلڈ کپ آسٹریلیا نے انگلینڈ کو جیت کر کے جیت لیا تھا۔

عالمی کپ کے فوری بعد عمران نے کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیا۔ خان صاحب کے اس فیصلے پر کرکٹ کے متوالوں کو شدید چینی جھنکا لگا۔ وہ جانتے تھے کہ اُن کے ہیرو میں ابھی بہت کرکٹ باقی ہے پھر کرکٹ کے حلقوں کی جانب سے خان صاحب سے ریٹائرمنٹ واپس لینے کا مطالبہ ہونے لگا مگر خان صاحب کسی طرح بھی واپسی کے لیے راضی نہ ہوئے۔ اُس وقت پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی حکومت تھی جو کہ ملک کے مطلق العنان صدر تھے۔ جنرل صاحب خود بھی عمران خان کے پرستار تھے چنانچہ ایک روز پریذیڈنٹ ہاؤس میں صدر صاحب نے بذات خود خان صاحب سے

ریٹائرمنٹ واپس لینے کی خواہش کی اور عمران اُن کی بات پر انکار نہ کر سکے۔ یوں 1988ء میں کرکٹ کے میدانوں پر عمران کی دوبارہ واپسی ہوئی۔ 18 جنوری 88ء کو خان نے اپنی ریٹائرمنٹ واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ پکتان کی واپسی بہت دھواں دھارا انداز میں ہوئی۔ دورہ ویسٹ انڈیز میں خان نے تین ٹیسٹ میچوں میں 23 وکٹیں لیں اور ٹیسٹ سیریز میں پاکستان کی فتح میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خان اپنی اس پرفارمنس کو یاد کرتے ہوئے اکثر کہتے ہیں ”یہ میری آخری بہترین پرفارمنس تھی اُس کے بعد میں اس طرح کی باؤلنگ نہیں کر سکا۔“

خان اپنے کھیل کی وجہ سے تو مقبول تھا ہی مگر اس کی پرستاری میں بھی جادو تھا، مردانہ وجاہت چہرے پر شرمیلی مسکراہٹ سرخ و سفید رنگت یہ اور خوبیاں تھیں جو خان کو خواتین میں مقبول کرتی تھیں۔ اکثر خواتین محض عمران کی وجہ سے ہی اسٹیڈیم آتی تھیں۔ انہیں کرکٹ سے زیادہ عمران بھاتا تھا۔ وہ عمران کو قریب سے دیکھنے اس سے آڈو گراف لینے اور اس سے باتیں کرنے کے لیے کربزی ہوتی تھیں۔ دنیا کے جس حصے میں بھی عمران نے کرکٹ کھیلی وہاں کی خواتین کو اپنا دیوانہ بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیا نے عمران کے اسکیڈل بھی بنائے۔ ان کے لیے اسے کسی ہندوستانی اداکارہ کے ساتھ جوڑ دیا گیا تو کبھی کسی انگریز عورت سے نتھی کر دیا گیا۔ اس ضمن میں اس وقت کی معروف بھارتی فلمی ہیروئن زینت امان کے ساتھ بننے والے اسکیڈل نے بہت شہرت حاصل کی تھی۔ زینت بھی خان کے لیے پاگل تھی مگر خان نے اس فلمی ستی سے خود کو بچالیا۔ انگریز خاتون پیتاواٹھ کے اسکیڈل کی کہانی تو سچے سچے کی زبان پر تھی۔ اخبارات نے اس اسکیڈل کو خوب اچھا تھا۔ پیتا کے بیانات شائع کیے جا رہے تھے جس میں

جوش و جذبہ جگایا۔ انہیں کہا کہ اب بھی ہم ورلڈ کپ
 جیت سکتے ہیں، ابھی امید کی کرن باقی ہے۔ حوصلہ
 مند کپتان کی باتوں سے ٹیم کوئی تحریک ملی۔ اگلے دن
 ٹیم نے آسٹریلیا کے خلاف جان لڑادی اور ایک سنسنی
 خیز مقابلے کے بعد آسٹریلیا کو اس کے ہوم گراؤنڈ پر
 شکست دے دی۔ اس جیت نے پاکستانی ٹیم میں
 جیسے نئی روح پھونک دی اور پاکستان اپنے بقایا میچز
 بھی جیتتا ہوا سیسی فائنل میں پہنچ گیا جہاں اس کا
 مقابلہ نیوزی لینڈ جیسی مضبوط ترین ٹیم سے تھا۔ واضح
 رہے نیوزی لینڈ گراؤنڈ میچز میں سوائے پاکستان کے
 تمام ٹیموں سے جیتا تھا۔ سیسی فائنل انتہائی سنسنی خیز
 ہوا اور آخری لمحات میں پاکستان نے یہ میچ جیت لیا۔
 یہ پہلا موقع تھا کہ پاکستان نے ورلڈ کپ کا سیسی
 فائنل جیتا تھا ورنہ ہر بار اس کی سانسیں سیسی فائنل ہی
 میں اکھڑ جاتی تھیں۔ اس جیت پر پوری قوم خوشی
 سے نہال تھی۔ اب عالمی کپ محض ایک میچ کی دوری
 پر تھا۔ فائنل میں انگلینڈ کی ٹیم بد مقابل تھی۔ میلیبورن
 کرکٹ گراؤنڈ پر کھیلے جانے والے اس فائنل میں
 اسٹیڈیم کھپا کھپا بھرا ہوا تھا۔ پاکستان نے پہلے بیٹنگ
 کرتے ہوئے اچھا ٹارگٹ دیا جس میں عمران خان
 اور جاوید میاندادی کی ذمہ دارانہ اننگز بھی شامل تھیں۔
 ورلڈ کپ کے اہم ترین میچز میں کپتان اپنی ٹیم کو
 سہارا دینے کے لیے خود دن ڈاؤن پوزیشن پر آنے
 لگا تھا حالانکہ وہ بنیادی طور پر ایک باؤلر تھا اور چھٹے
 نمبر پر کھیلتا تھا مگر اس نے ٹیم کا مورال بلند کرنے کے
 لیے ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی جس سے باقی ٹیم
 ممبران کو بھی حوصلہ ملا۔ خان نے میچ معنوں میں
 کپتان ہونے کا حق ادا کیا تھا۔ انگلینڈ کی بیٹنگ
 شروع ہوئی تو پاکستانی باؤلرز نے شروع میں ان کی
 اہم ترین وکٹیں گرا دیں مگر پھر ایلن لیبل دیوار بن
 گئے۔ ایک موقع پر ایسا نظر آ رہا تھا کہ میچ پاکستان

سے تانے دعویٰ کیا تھا کہ عمران اس کے بیچے کا باپ
 ہے۔ یہ اسکیٹنڈل عمران کے لیے بہت زیادہ شرمندگی
 کا باعث بنا تھا۔ عمران نے سیتا سے تعلق کے حوالے
 سے اقرار تو کیا تھا مگر اس کے بیچے کو اپنی اولاد ماننے
 سے انکاری تھا۔ یہ اسکیٹنڈل کافی عرصے بعد عمران
 کے لیے سیاسی میدان میں بھی مشکلات کا باعث بنا
 تھا۔ خیر عمران کی کرکٹ زور و شور سے جاری تھی کہ
 1992ء کا ورلڈ کپ آ گیا۔ یہ ورلڈ کپ آسٹریلیا اور
 نیوزی لینڈ میں ہونا تھا۔ خان کے کیریئر کا یہ آخری
 ورلڈ کپ تھا اور خان اسے ہر صورت میں جیتنے کا
 خواہش مند تھا۔ جب خان ورلڈ کپ کھیلنے جا رہا تھا تو
 اس نے بہت یقین کے ساتھ کہا تھا۔ ”ہم ورلڈ کپ
 جیت کر واپس آئیں گے۔“

اس بار ورلڈ کپ بھی مختلف انداز میں ہو رہا تھا۔
 ٹیموں کے لیے مختلف رنگوں کی یونیفارم مخصوص کی گئی
 تھی۔ سرخ گیند کی بجائے سفید گیند سے تمام میچز
 تھے اور ڈے نائٹ میچز بھی تھے۔ ٹورنامنٹ شروع
 ہوا پاکستان اپنا پہلا ہی میچ ویسٹ انڈیز کے خلاف
 ہار گیا پھر انڈیا سے بھی شکست ہوگئی۔ جنوبی افریقہ
 نے بھی پاکستانی ٹیم کو شکست کا داغ لگا دیا۔ انگلینڈ
 کے خلاف میچ میں بارش نے یادری کی اور پاکستان
 مکمل شکست سے بچ گیا۔ دو ٹوں ٹیموں کو ایک ایک
 پوائنٹ مل گیا۔ ٹیم کی اس کارکردگی پر پاکستانی میڈیا
 میچ پر ایک کرکٹ مبصرین اور ناقدین نے ٹیم پر بھرپور
 تنقید کی۔ اب صورت حال یہی تھی کہ ٹیم کا سیسی فائنل
 کھیلتا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ پوری قوم مایوس تھی
 پاکستانی ٹیم اگر ٹرک کی صورت حال سے دوچار تھی مگر
 اس وقت ایک شخص تھا جس سے مایوسی اور ناامیدی
 کوسوں دور تھی اور وہ تھا کپتان خان! اگلا میچ
 آسٹریلیا جیسی ٹیم سے ہونے والا تھا۔ میچ سے ایک
 رات قبل خان نے اپنی ٹیم کو جمع کیا اور ان میں نیا

کے ہاتھ سے نکل رہا ہے مگر پھر پاکستان نے وسیم اکرم کو باؤلنگ تھمائی اور یہ دانش مندانہ فیصلہ پاکستان کو بیچ میں واپس لے آیا۔ وسیم اکرم نے اوور کی ابتدائی دو گیندوں پر دو وکٹیں گرا دیں۔ پہلے ایلن لیسب پھر کرس لوکس۔ دونوں بولڈ آؤٹ ہوئے تھے۔ اس تناہ کن اوور کے بعد انگلینڈ سنبھل نہیں پایا اور ٹارگٹ کے تعاقب میں مسلسل اس کی وکٹیں گرتی رہیں۔ انگ کی آخری وکٹ خان نے لی تھی۔ جون ہی ان کی گیند پر رمیز راجہ نے ڈ آف پر بیچ پکڑا۔ پاکستان ورلڈ کپ جیت گیا۔ پوری قوم خوشی سے جھوم اٹھی۔ قمری حساب سے وہ رمضان کا مہینہ تھا یعنی رمضان

ایسی ماں تھیں جن کے زیر سایہ تربیت پانے اور اولاد ملک و قوم کے لیے سراسر فائدہ مند ہوتی ہے اس معاملے میں وہ علی برادران کی والدہ اور بی بی سے کسی طور کم نظر نہیں آتیں۔ مادر عمران دین و دنیا اس طرح ساتھ ساتھ لے کر چلیں جیسا کہ اسلام دیتا ہے۔ وہ ایک سچی ہوئی خاتون تھیں اور معاشرہ تہذیبی معاشرتی گھریلو ہرقسم کے معاملات کو بہر سکھڑپن سے حل کرتی تھیں۔ عمران کو اپنی والدہ سے بہت محبت تھی۔ جب شوکت خانم کینسر کے ہاتھوں جہان چھوڑ گئیں تو عمران کی زندگی جیسے اندھیر ہو گئی خود عمران کا کہنا ہے کہ انہیں زندگی کا سب سے



کی بابرکت ساعتوں میں خان ایک سیاسی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے دکھ ماں کی وفات کی قدرت نے پاکستانیوں کو ورلڈ کپ کی خوشیوں سے نوازا تھا۔ یقیناً پاکستان کو ایک ایسی جیت سے ہمکنار کیا تھا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ورلڈ کپ اٹھانے کے بعد عمران نے اپنی تقریر میں کینسر ہسپتال بنانے کے عزم کا اظہار کیا تھا جسے وہ اپنی ماں شوکت خانم کے نام پر بنانا چاہتا تھا۔ عمران کی والدہ شوکت خانم اصولوں پر زندگی گزارنے والی ایک با اصول خاتون تھیں۔ وہ ایک

دور سے پر جانا چاہتا تھا مگر چند کھلاڑی نہیں چاہتے تھے کہ میں یہ سیریز کھیلوں کیونکہ انہیں خوف تھا کہ کہیں میں انہیں مجبور کروں گا کہ ورلڈ کپ کی جیت پر ملنے والی انعامی رقم وہ میرے کینسر ہسپتال کے لیے عطیہ کریں حالانکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد خان نے مختلف برطانوی اور ایشیائی اخبارات میں کرکٹ پر کالمز اور آرٹیکلز لکھنا شروع کر دیئے۔ ان کے کالمز انڈیا کے آؤٹ لک ڈی گارڈین ڈی انڈیپنڈنٹ اور ڈی ٹیلی گراف جیسے اخبار و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔ اپنے ایک آرٹیکل میں عمران نے انکشاف کیا کہ کاؤٹنی کرکٹ کے بیچ میں وہ بال ٹیپرنگ بھی کیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے لکھا تھا۔ ”میں نے ہمیشہ سے ناخن سے بال کو کھرچا ہے البتہ ایک بار بوتل کا ڈھکن استعمال کیا ہے۔ یہ 1981ء کے ایک کاؤٹنی بیچ کی بات ہے۔ سسٹیکس اور ہسپتال کا بیچ ہو رہا تھا میں بولنگ کر رہا تھا بال میں کوئی موومنٹ نہیں تھی چنانچہ میں نے 12 ویں کھلاڑی سے بوتل کا ڈھکن منگوا لیا اور پھر اس سے بال کھرچنے لگا۔“ ایک بار عمران نے اپنے آرٹیکل میں ایلن لیسب اور آئن بوسٹم کے خلاف کچھ ریلز لکھ دیئے جس پر دونوں انگلش کھلاڑیوں نے اسے عدالت میں گھسیٹ لیا۔ ان کا دعویٰ تھا کہ عمران نے ان کی تنگ کی ہے۔ جب کیس چلا تو 12 جج کی جوری میں دس نے عمران کے حق میں فیصلہ دیا اور بیچ نے ان ریمارکس کے ساتھ کس خارج کر دیا کہ یہ ایک فضول مقدمہ ہے۔ خان نے برطانیہ اور ایشیا کے بڑے میٹ ورکس جھٹلے کے لیے کٹھنی تھی کی جس میں بی بی سی اردو اور اسٹار ٹی وی میٹ ورکس اور ٹین اسپورٹس شامل ہیں۔ خان کرکٹ ٹیڑی نگار کی حیثیت سے بھی چینلز پر نظر آتے۔

یوں تو عمران نے 1991ء سے کینسر ہسپتال کے لیے فنڈ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا تھا تاہم کرکٹ سے ریٹائرمنٹ کے چار سال بعد اس نے پوری توجہ اس کام پر لگا دی۔ پاکستان میں پہلے کینسر ہسپتال کی تعمیر اس کا خواب تھا اور اپنے اس خواب کی تعبیر کے لیے وہ شب و روز عطیات جمع کرنے نکلا۔ اس نے دنیا بھر سے 25 ملین ڈالرز جمع کیے اور شوکت خانم کینسر ہسپتال کی بنیاد رکھ دی۔ اس ہسپتال کا افتتاح 29 دسمبر 1994ء کو لاہور میں ہوا۔ اس ہسپتال کا مقصد ان غریب افراد کو کینسر کے علاج کی سہولت فراہم کرنا تھا جو باہر جا کر یا مہنگے ہسپتال میں علاج کروانے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ شوکت خانم میں ایک مریض کے علاج پر جتنا خرچ آتا ہے اس کا 75 فیصد ہسپتال برداشت کرتا ہے اور صرف 25 فیصد مریض کے ذمے ہوتا ہے۔ عمران اس ہسپتال کے چیئرمین ہیں۔ عمران کی نیک نیتی کو دیکھتے ہوئے پاکستانی قوم نے بھی ہسپتال کے معاملے میں اس کی دل کھول کر مدد کی۔ عمران نے بھی قوم کے ایک ایک پیسے کو پوری دیانت داری کے ساتھ اس کار خیر میں لگایا۔ خان کی دیانت کے حوالے سے پارٹی کے ایک رہنما اپنی ایک کتاب میں لکھتے ہیں کہ ایک بار عمران خان صاحب کراچی تشریف لائے۔ میں انہیں لینے کراچی ایئر پورٹ گیا۔ عمران کا بیگ لوڈر کے ہاتھ میں تھا اور عمران اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے کہ عمران نے مجھے دیکھتے ہی آواز دی اور قریب آنے پر گلے لگاتے ہوئے مجھ سے بولے۔ ”یار.....! تیرے پاس سو روپے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”ہاں خان صاحب.....!“ تو کہنے لگے۔ ”اس لوڈر کو دے دو۔“ میں نے لوڈر کو سو روپے دیئے اور اس کے

ہاتھوں سے خان صاحب کا بیگ لیا پھر ہم دونوں چلتے ہوئے ایئر پورٹ سے نکلے۔ باہر گاڑی کے پاس کھڑے ہو کر عمران نے اپنی جیب سے سوسو روپے کے دس نوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یار.....! تو یہ مت سمجھ کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں دیکھ پورے ہزار ہیں لیکن یہ میرے نہیں ہیں بلکہ دوستی ایئر پورٹ پر مجھے ایک بچی نے شوکت خانم اسپتال کے لیے دیئے ہیں۔ میں اگر اس میں سے سو روپے نکال کر لوڈر کو دے دیتا تو یہ میری بددیانتی ہوتی جو میرے لیے کسی طور بھی قابل قبول نہیں ہے۔“

خان صاحب جہاں جہاں ہسپتال کے چندے کے لیے گئے، لوگوں نے انہیں لاکھوں روپے بغیر مانگے دیئے۔ یہ عمران کی نیک نیتی کا ثمر تھا۔ عمران میں خدمت خلق کا جذبہ نیا نہیں تھا۔ ہسپتال کے قیام سے پہلے بھی اس نے سماجی کاموں میں حصہ لیا تھا۔ 1990ء کے دوران خان نے یونیسیف کے خصوصی نمائندہ برائے کھیل کے لیے بھی کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیش، پاکستان، سری لنکا اور تھائی لینڈ میں صحت کے مختلف پروگراموں میں بھی کام کیا ہے جبکہ وہ لندن میں کرکٹ کے ایک خیراتی ادارے میں بھی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

شادی خان کی زندگی کا وہ فیکٹر رہا ہے جس پر وہ ہمیشہ خاموش رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میڈیا میں اس کی شادی کے معاملے پر بہت کچھ لکھا گیا۔ عورتیں اس کی دیوانی تھیں خواہ وہ پاکستانی ہوں یا ہندوستانی یا پھر انگریز عورت لیکن عمران نے بھی اپنی شادی کے حوالے سے کھل کر بات نہیں کی۔ جب اس سے سوال کیا جاتا کہ وہ کسی پاکستانی لڑکی کو اپنی دلہن بنائے گا یا پھر یہ اعزاز کسی غیر ملکی خاتون کو

حاصل ہوگا؟ اس سوال پر وہ مسکرا کر رہ جاتا اور مول انداز میں ایسی بات کرتا کہ لوگ اس جواب میں اصل معنی تلاش کرنے لگتے۔ اکثر خیال تھا کہ عمران پاکستانی لڑکی سے ہی شادی کرے گا اور لڑکی اس کے خاندان کی ہی ہوگی مگر طرف عمران کے تعلقات انگلینڈ میں گولڈ اسمتھ سے استوار ہو گئے تھے ویسے بھی برطانیہ کے اوپر گھرانوں کی تقریبات میں خان کو مدعو کیا جاتا کیونکہ اس کی عمر کا بیشتر حصہ انگلستان میں گزارا تھا کرکٹ سے بہت کچھ بھی مقامی فیملیز سے اس ذاتی مراسم تھے۔ ان ہی میں سے ایک گولڈ اسمتھ خاندان بھی تھا مگر کسی کے وہم و گمان میں بھی تھا کہ اس فیملی کی جہانم نامی ایک لڑکی کے ساتھ خان روٹاں پروان چڑھ رہا ہے جب تک محبت کی کہانی کی خبر میڈیا تک پہنچی تب تک دونوں ایک دوسرے کو شریک زندگی بننے کا فیصلہ کر چکے تھے۔

16 مئی 1995ء کو پیرس میں جہانم گولڈ اسمتھ و عمران خان ایک پروقار تقریب میں ایک دوسرے کے شریک زندگی بن گئے۔ یہ تقریب راولپنڈی پاکستانی تقریب تھی جس میں دونوں جانب کے خاندان کے افراد اور خصوصی دوست و احباب شرکت کی تھی۔ یہ شادی 21 جون کو انگلینڈ میں ایک سول تقریب میں رجسٹرڈ ہوئی۔ بعد میں سرے میں واقع گولڈ اسمتھ ہاؤس میں ریسیپشن رکھا گیا جو میں لندن کی طبقہ اشرافیہ نے شرکت کی تھی گو خان کی شادی دوسرے ہی ایک بار پاکستانی انداز میں اور دوسری بار برطانوی رسم و رواج کے مطابق شادی کے فوری بعد یہ نیاویلا جوڑو ہنرمون کے رومانہ ہو گیا یعنی ہنرمون کے یہ حسین دن عمران نے اپنے سرسبز جیمز اسمتھ کے اسپین میں واقع ایک فارم ہاؤس میں گزارے تھے یہی ہنرمون منا کر جب یہ چلا

پاکستان پہنچا تو زمان پارک لاہور میں ایک تقریب میں مبارک باد کے لیے آنے والے افراد کے سامنے عمران نے اعلان کیا کہ جہانم اسلام قبول کر چکی ہے اور اب اپنے نام کے ساتھ خان لگایا کریں گی۔ شادی کے وقت ایک معاہدہ ہوا تھا جس کے تحت عمران کو سماج کے چار ماہ انگلینڈ میں گزارنا تھے جبکہ بقیہ سینیٹ میں اسے پاکستان میں رہنا تھا۔ عمران کے دو بیٹے سلیمان عیسیٰ اور قاسم پیدا ہوئے تاہم یہ شادی بقول عمران خان کے بہت مشکل ثابت ہوئی۔ جب عمران نے سیاسی پارٹی کے قیام کا اعلان کیا تو یہاں کی اعلیٰ جنس ایجنسیز اور مذہبی سیاسی پارٹیوں کے کان کھڑے ہو گئے کیونکہ جہانم خان یہودی نسل کی تھی اسی نکتے پر مذہبی پارٹیوں نے عمران پر تنقید شروع کر دی۔ ان کا کہنا تھا کہ عمران کو یہودیوں کی آشر واد حاصل ہے اسی لیے وہ پاکستانی سیاست میں قدم رکھ رہا ہے تاکہ اس کے پس پردہ یہودی پاکستان میں اپنے عزائم کی تکمیل کر سکیں۔

شوکت خانم کینسر ہسپتال کی سپین میں جہانم خان نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس نے اپنے شوہر کی سپورٹ کرتے ہوئے راولپنڈی میں خواتین کی ایک سیاسی ریلی کی قیادت بھی کی تھی۔ دونوں کی شادی شدہ زندگی بہت خوشگوار انداز میں گزر رہی تھی کہ آہستہ آہستہ اس تعلق میں جانے کس طرح دراڑیں پڑتی چلی گئیں۔ ایک روز جہانم اچانک انگلینڈ چلی گئی جس پر یہ انہیں گردش کرنے لگیں کہ یہ شادی عمران کا شکار ہے۔ اس موقع پر جہانم کی طرف سے پاکستانی اخبارات میں اشتهار شائع کروایا گیا جس میں ان انواہوں کی تردید کرتے ہوئے کہا گیا۔ یہ سچ ہے کہ میں لندن آئی ہوں لیکن میں یہاں ماسٹرز ڈگری کے لیے تعلیم حاصل کرنے آئی ہوں۔ ایسا نہیں ہے کہ عمران اور میرے درمیان کوئی

رنجش ہے میں عارضی طور پر آئی ہوں اور تعلیم حاصل کر کے واپس پاکستان میں ہوں گی۔“ تاہم جہانم کی اس وضاحت کے باوجود حالات اس بات کے اشارے دے رہے تھے کہ دونوں کے درمیان سب کچھ اچھا نہیں ہے دھواں اٹھ رہا تھا جس کا مطلب تھا آگ کہیں نہ کہیں لگی ہوئی ہے پھر 22 جون 2004ء کو تمام انواہوں کی تصدیق ہو گئی۔ اُس روز اعلانیہ طور پر عمران نے جہانم کو طلاق دے دی اور یوں یہ نو سالہ شادی شدہ تعلق اختتام پذیر ہوا۔ بعد میں عمران خان نے بتایا کہ جہانم کے لیے پاکستانی ماحول میں ایڈجسٹ کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ عمران کے مطابق طلاق کا فیصلہ کرنے میں انہیں چھ ماہ لگے تھے۔ طلاق کے بعد زندگی میں اسے مشکل ترین دنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جہانم دونوں بیٹوں کو لے کر برطانیہ چلی گئی۔ طلاق کے معاہدے کے تحت دونوں بیٹے اسکول کی چھٹیوں میں پاکستان آسکتے ہیں جبکہ بقیہ سال بھر برطانیہ میں اپنی نانی کے پاس رہیں گے۔ اگر اس دوران عمران کو اپنے بیٹوں سے ملنا ہو تو وہ برطانیہ جا کر اپنے بیٹوں سے مل سکتا ہے۔ طلاق کا معاملہ خوشگوار انداز میں طے ہوا تھا۔ میڈیا کو مریح مسالا لگانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ عمران اور جہانم نے باہمی رضامندی سے ایک فیصلہ کیا اور اس پر عمل کر دیا۔ طلاق کے بعد بھی دونوں کے تعلقات خوشگوار رہے تھے۔ عمران خان کے سیاسی مخالفین اس پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شخص گھر نہیں سنہیال رکھا وہ ملک کی سنبھالے گا حالانکہ ان عقل کے اندھوں کو سوچنا چاہیے کہ عمران کے گھر ٹوٹنے کی وجہ یہ سیاست تھی وہ اپنی پارٹی پاکستان تحریک انصاف کی وجہ سے اپنی نئی زندگی کو وقت نہیں دے پا رہا تھا جس کے باعث اس کا گھر متاثر ہو رہا تھا مگر اسے قوم کی فکر تھی گویا اس نے اپنے بڑے

گھر (پاکستان) کی فکر میں اپنے چھوٹے گھر کی خوشیاں قربان کر دی تھیں۔ اس کی تمام تر دلچسپیوں کا محور صرف بی بی آئی تھی جس سے اس کی خانگی زندگی متاثر ہو گئی تھی۔

بیوی کے جانے کے بعد عمران خان اب اسلام آباد میں واقع 300 کنال پر پھیلے بانی گالا فارم ہاؤس میں تنہا رہ گئے تھے۔ یہ فارم ہاؤس مرگہ کی پہاڑی پر واقع تھا جہاں سے پورے اسلام آباد اور راول پھیل کا نظارہ ہوتا تھا۔ اس خوبصورت مقام پر خان نے یہ فارم ہاؤس اپنی بیوی کے لیے بہت محبت سے بنوایا تھا اور اس کی تعمیر کے لیے کچھ رقم بھرا تھا۔ اس شاندار تھی بعد میں خان نے اپنا لندن والا فلیٹ فروخت کر کے بھرا کویہ رقم واپس کر دی تھی۔ اس شاندار فارم ہاؤس میں خوبصورت بنگلہ ایک آفس بہت سے لازو اور سونگ پول تھا۔ اس میں مختلف النوع کے پھلوں کے درخت، گندم کے کھیت اور گائیں، بھینسیں اور کتے وغیرہ بھی تھے۔ عمران نے اپنے بیٹوں کے کھیلنے کے لیے ایک کرکٹ گراؤنڈ بھی بنوایا تھا۔ دونوں بیٹے جب بھی چھٹیوں پر پاکستان آتے، یہاں کرکٹ کھیل کر انجوائے کرتے تھے۔ خان کا آبائی گھر زمان پارک لاہور میں بھی ہے جہاں وہ اپنا بیشتر وقت گزارتے ہیں۔ اس گھر میں خان کا بچپن اور لڑکپن کے ابتدائی ایام گزرے تھے۔

گوکہ خان نے پاکستانی قوم کی فلاح کے لیے ایک ہسپتال قائم کر دیا تھا مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ قوم ہر لحاظ سے پس رہی ہے۔ اس ملک پر قدرت کی بے شمار فیاضیاں تھیں۔ یہاں چاروں موسم تھے۔ یہاں دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام تھا۔ یہاں پہاڑ تھے۔ جنگلات تھے سمندر تھا دریا تھے نباتات جمادات تھے زمینی خزانے تھے۔ غرض کیا ہے جو اس ملک میں نہیں تھا۔ کی تھی تو صرف ایک ایسی قیادت

کی جو انصاف پر مبنی معاشرہ قائم کر سکے اور اس ملک کے وسائل اس کے لوگوں پر خرچ کرے۔ اس اقتصادی نظام کو ختم کیا جائے جہاں مزدور تو بیکار سوتے اور سرمایہ دار کا دسترخوان انواع و اقسام کے کھانوں سے سجا ہو۔ جہاں چور ڈاکو لٹیروں کے حکمران بن جائیں اور حق دار رٹا پھرے۔ ان تمام حالات پر غور کرنے کے بعد پکتان خان نے ایک فیصلہ کیا، ایک جدوجہد کا فیصلہ جو یقیناً آسان نہ تھی بلکہ یہ طویل اور تھکا دینے والی تھی مگر اپنی حصول سے بنا خان ہر مشکل سے ٹکرانے کو تیار تھا۔ چنانچہ اس نے ایک فیصلہ کیا اور سیاست کے خارزار میں قدم رکھ دیا۔ 1996ء میں نے اس نے ایک سیاسی پارٹی پاکستان تحریک انصاف کے نام سے قائم کی۔ اس کے قیام کا مقصد سیاست کو تمام آلودگیوں سے پاک کرنا تھا تاہم 1997ء کے انتخابات میں عمران کی پارٹی کوئی نشست حاصل نہ کر سکی کیونکہ اس وقت اس کے قیام کو محض ایک سال ہوا تھا۔ 1999ء میں جنرل پرویز مشرف نے نواز حکومت پر شہ خون مارا تو عمران خان نے اس عمل کی حمایت کی تھی کیونکہ اس وقت عمران کا خیال تھا کہ مشرف ہر قسم کی کرپشن کو ختم کر دے گا اور سیاسی مافیاز کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا۔ بعد میں عمران جنرل مشرف کی حمایت پر قوم سے شرمندہ تھا۔ مشرف نے 2002ء کے انتخابات کے بعد عمران خان کو وزیر اعظم بننے کی پیشکش بھی کی تھی جسے خان نے ٹھکرادیا تھا کیونکہ خان کا مقصد وزیر اعظم بننا نہیں بلکہ اس اقتصادی نظام کا خاتمہ تھا۔ 2002ء کے انتخابات میں عمران میاںوالی کے حلقے سے کامیاب ہوا تھا اور یوں اپنی پارٹی کا واحد ممبر تھا جو الیکشن جیت کر پارلیمنٹ تک آیا تھا۔ اس الیکشن میں تحریک انصاف نے محض 0.8 فیصد ووٹ حاصل کیے تھے۔ پارلیمنٹ میں خان

سٹیج کی اسٹیجنگ سٹیج اور پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا حصہ بھی رہا اور اس نے بین الاقوامی تعلقات عامہ تعلیم اور انصاف کے لیے قانون سازی پر بھی آواز اٹھائی۔ خان نے مشرف حکومت کی پالیسیوں پر کھل کر تنقید بھی کی اور اس کے غیر آئینی اقدامات کے خلاف احتجاج بھی کیا لہذا 3 نومبر 2007ء کو جب جنرل پرویز مشرف نے ایمر جنسی نافذ کی تو عمران کو گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ عمران نے ایمر جنسی لگانے پر مطالبہ کیا تھا کہ مشرف کو پھانسی کی سزا دی جائے۔ اس نے ایمر جنسی کو غداری کے مترادف قرار دیا تھا۔ تحریک انصاف کا اصل عروج 130 اکتوبر 2011ء کو ملا جب خان نے لاہور میں تقریباً ایک لاکھ افراد کے جلسے سے خطاب کر کے ملک کی سیاسی تصویر کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس جلسہ میں عوام کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ لوگوں کو عمران کی صورت اپنا حقیقی لیڈر مل گیا تھا اور عوام تبدیلی کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ اس جلسہ میں لوگوں کے جم غفیر کو دیکھ کر خان نے اس جوش و جذبے کو 'سونامی' کا نام دیا۔ تقریباً 2 ماہ بعد 25 دسمبر کو عمران نے کراچی میں اس سے بھی بڑا جلسہ کیا۔ ایک اندازے کے مطابق اس جلسے میں ڈھائی لاکھ سے زیادہ افراد شریک تھے۔ یہ تحریک انصاف کا دوسرا بڑا جلسہ تھا جس نے ملکی سیاست میں پھل مچا دی اور لوگ دوسری سیاسی جماعتوں کو چھوڑ کر تحریک انصاف جو ان کرنے لگے۔ مسلم لیگ (ن) کے جلا بد بائیں اور پیپلز پارٹی کے شاہ محمود قریشی وہ نمایاں نام تھے جو اپنی اپنی جماعتوں کو خدا حافظ کہہ کر تحریک انصاف میں شامل ہوئے تھے۔ عمران نے اصولی سیاست کو اپنا ہتھیار بنایا۔ سیاست میں اس سے جب جب اور جہاں جہاں غلطیاں ہوئیں ان پر وضاحتیں دینے کے بجائے انہیں کھلے دل سے تسلیم کیا۔ اس نے ڈرون حملوں کے خلاف جنوبی وزیرستان میں

احتجاجی ریلی بھی نکالی اور ثابت کیا کہ وہ ایک جینوئن لیڈر ہے۔ پاکستان کا کوئی سیاست دان ایسی ہمت و حوصلہ کا مظاہرہ نہیں کر سکا کہ جس علاقے میں ڈرون حملے ہو رہے ہوں وہیں احتجاج کیا جائے۔ ان دنوں پکتان خان الیکشن 2013ء کی مہم میں مصروف ہے۔ روزانہ کئی جلسے کر رہے ہیں اس کے جلسوں میں عوام کا جوش و جذبہ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے نوجوان اس کا بازو ہیں اور وہ ایک نیا پاکستان بنانے کے جذبے سے سرشار ہے۔ مارٹن لوثر کنگ نے ایک خواب دیکھا تھا مگر عمران نے اب تک زندگی میں جتنے خواب دیکھے وہ سب پورے ہوئے۔ اس نے نو برس کی عمر میں پاکستان کرکٹ ٹیم میں کھیلنے کا خواب دیکھا اور ایک دن وہ پاکستان ٹیم کا حصہ بنا۔ اس نے دنیا کا بہترین آل راونڈر بننے کا خواب دیکھا اور محض نو برسوں میں اس نے یہ کر دکھایا۔ اس نے ورلڈ کپ جیتنے کا خواب دیکھا اور یہ خواب بھی سچ ثابت ہوا۔ اس نے کینسر ہسپتال قائم کرنے کا خواب دیکھا اور پانچ برسوں میں ہسپتال قائم ہو گیا۔ اس نے یونیورسٹی کے قیام کا خواب دیکھا اور نمل یونیورسٹی بنا ڈالی۔ اب سے چند ماہ قبل اس نے خواب دیکھا تھا کہ پاکستان تحریک انصاف نے پورے ملک میں کلین سوپ کیا ہے اور پاکستانی عوام سڑکوں پر خوشی سے تاج رہے ہیں۔ آج جب چارٹری کو یہ مضمون لکھا جا رہا ہے عمران کے خواب کی تعبیر کے لیے محض چند دن باقی ہیں اگر اس کا یہ خواب بھی پورا ہوا تو یقیناً اس ملک کے لوگوں کو بقول عمران ایک نیا پاکستان ملے گا۔

☆ ☆ ☆

◆ اس ماہ کی خاص کہانی یہ کہانی اس شمارے کا خصوصی حصہ ہے ◆

محمد سلیم اختر

میسیحا اور موت

یاسمین صہبا کا خیال

کتنی چاہت سے تو نے لوٹا ہے
تیری چاہت کی بات کون کرے

ایک میسیحا کا قصہ خاص جو درد کی عجب دوادیتا تھا



1985ء میں جب میں نیپلی کے ہمراہ راولپنڈی شفٹ ہوا تو رہائش چھیاں بیٹیاں میں ایک کرائے کے مکان میں رہی۔ ہمارے اڑوس پڑوس میں سب ہی اچھے اور مخلص لوگ تھے۔ جلد ہی ہم محلے کے لوگوں میں گھل مل گئے۔ اُن میں سب سے نمایاں گھر ماسی فضلاں کا تھا۔ ماسی فضلاں کا حقیقی نام تو فضل بیگم تھا مگر محلے والے انہیں ماسی فضلاں کے نام سے جانتے اور پکارتے تھے۔ وہ اپنے گھر میں تنہا رہتی تھیں۔ سنا تھا کہ تقسیم ہند کے وقت اُن کا سارا خاندان پاکستان کے نام پر شہید ہو گیا تھا۔ وہ اندر سے تو نہایت دلگھی تھیں مگر اُن کے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رقصاں رہتی تھی۔ وہ لوگوں کے کام آ کر خوشی محسوس کرتیں۔ ہر ایک کے دکھ اور سکھ میں برابر کی شریک ہوتیں جیسے وہ اُن کا اپنا دکھ ہوا اپنی خوشی ہوئے محلے کی بچیاں اُن سے قرآن مجید پڑھنے جاتی تھیں۔ اُن کا کوئی ذریعہ آمدن نہ تھا۔ محلے کے تخریر لوگ اُن کی مدد کرتے تھے۔ وہ ہر ایک کی ماسی تھیں چھوٹا کیا بڑا کیا ہر کوئی اُن کو ماسی فضلاں کے نام سے ہی پکارتا تھا۔ ہم سب گھر والے بھی جلد ہی اُن کے گردیدہ ہو گئے۔ میں اکثر اُن کو سلام کرنے جاتا اور ان سے ڈھیروں دُعا میں لیتا۔ اس دوران میں میں نے کئی بار باتوں باتوں میں اُن کے ماضی کے بارے میں جانا چاہا لیکن وہ نال جاتیں مگر میں نے بھی عہد کر لیا تھا کہ میں اُن کا ماضی جان کر کے ہی رہوں گا کیونکہ پتا چلا تھا کہ ماسی فضلاں جنہوں نے شادی نہیں کی تھی اُن کے ماضی کی کہانی بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز ہے۔

1990ء کے سردیوں کے دن تھے کہ ماسی فضلاں کی طبیعت خراب ہو گئی۔ میں اُن کو اسپتال لے گیا۔ وہاں وہ تین دن داخل رہیں تین دن بعد

اُن کی طبیعت سنبھلی تو میں اُن کو واپس گھر لے آیا مگر اب وہ نہایت ہی بڑھال ہو گئی تھیں اور چارپائی کی ہی ہو کر رہ گئیں۔ ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ اُن کے جگر اور گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے لہذا اب وہ زیادہ عرصہ نہ جی سکیں گی۔ یہ جان کر مجھے بہت ہی پریشانی ہوئی۔ اُس وقت ان بیماریوں کا اتنا جدید علاج نہ تھا مگر میں نے پھر بھی بیٹا بن کر اُن کی تیمارداری جاری رکھی اور انہیں یہی کہتا رہا کہ وہ جلد ٹھیک ہو جائیں گی ساتھ ہی محلے کا ہر فرد اُن کی صحت اور سلامتی کے لیے دُعا گو تھا۔

ایک رات عشاء کے نماز کے بعد ماسی فضلاں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور کہنے لگیں۔ ”میری زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں میرا بلا واپس آنے ہی والا ہے۔ میں اس دنیا سے جانے سے پہلے تمہیں اپنا ماضی سنانا چاہتی ہوں تاکہ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے اور میں چین سے مر سکوں۔“ اُن کی بات سن کر میں ہمدن گوش ہو گیا اور وہ ماضی کو یاد کرنے لگیں۔

”میں جب چھوٹی تھی تو مجھے ساون کی گھٹائیں بڑی پیاری لگا کرتی تھیں۔ جائنڈھ امرتسر اور خاص کر انالہ کے حسن کو انالہ والے ہی بیان کر سکتے ہیں۔ گھٹائیں بھر بھر کر آتی تھیں تو موروں کے رقص اور نغموں سے آموں کے پیڑ بھی جھومنے لگتے تھے۔ ہم کتنی ہی ساری لڑکیاں پاگلوں کی طرح کھیوتوں میں کد کڑے لگاتیں یا پیڑوں پر بندروں کی طرح پڑھتی اترتی پھرتی تھیں مگر یہ سلسلہ ایک حد تک ہوتا تھا۔ انالہ کے دیہاتوں میں مسلمان گھرانے پر دے کے سخت پابند تھے مجھے بھی چودہ برس کی عمر میں پردے میں بٹھا دیا گیا تھا۔

اُس سال بھی ساون کی گھٹائیں گرجتی کڑکتی

آئیں اور موروں نے لوگ لوگ کے سر لیے نغموں اور رقص کی دلربا آواؤں سے ساون کا استقبال کیا۔ آرم کے بیڑوں کی ہریالی ہر سال کی طرح نکھر کر آئی تھی مگر میں گھر میں قید تھی۔ جی میں آتا تھا کہ بغاوت کر کے اٹھ بھاگوں۔ ساون کے ہنگاموں میں گھر کی قید کا ایک ایک لمحہ پہاڑ بھورا تھا اور پھر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ مجھے ہائی لٹی مگر ایسے حالات میں جن کا میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ گاؤں کی تمام لڑکیاں جو تین تین چار چار برسوں سے گھروں میں قید تھیں میری ہی طرح گھروں سے نکل آئی تھیں۔ ساون کی وہی سیاہ گھٹائیں گھر گھر کر چھا رہی تھیں، موروں کی وہی لوگ کوک سنائی دے رہی تھی جس پر میں دل و جان سے فدا تھی۔ میری تمام سکھی سہیلیاں جو پردوں میں قید کر لی گئی تھیں، گاؤں کے کھیتوں میں ہجوم کی صورت میں نظر آ رہی تھیں مگر کوئی بھی لڑکی ہنس نہیں رہی تھی، کدکڑے نہیں لگا رہی تھی، ہم میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ آرم کے بیڑ پر جا بیڑ ہتی۔ اس روز بیڑ بیڑ اور پتا پتا ہمارا دشمن ہو گیا تھا۔ گھاؤں سے بانی نہیں، خون برس رہا تھا، موروں کی ننگی میں لوگ نہیں، جگر خراش ہو کر تھی..... کیوں کہ فساد ہی ہندوؤں اور سکھوں کے بے کارے اور واگور کی فتح کا شور موروں کے غل سے بہت بلند تھا۔

وہ 1947ء کا ساون تھا، گھٹائیں غیض و غضب سے گرج رہی تھیں۔ ہندو کی مسلم کش درندگی سے بیڑ اور پودے بھی لرز رہے تھے۔ مسلمانوں کو جگ آزادی جیت جانے کی سزا دی جا رہی تھی۔ ہماری بد نصیبی یہ کہ ہم اپنے دیس سے بہت دور تھے۔ اب انبالہ اور انبالے کا یہ چھوٹا سا گاؤں جسے ہم کیسری کہا کرتے تھے ہمارا وطن نہیں رہا تھا۔ اب کیسری کا

ساون ہمارا ساون نہیں تھا۔ مجھے اسی ساون سے تھا۔ میں نے اسی ساون کے حسن میں جنم لیا تھا۔ مجھے اسی ساون سے نفرت ہو گئی۔ میں اسے دیکھ کر گھٹائیں دیکھنے کو بے تاب ہو گئی۔ مجھے یقین تھا کہ پاکستان کا ساون اور اس کی گھٹائیں اس سے خوبصورت ہوں گی۔

گاؤں کے بچے بوڑھے، عورتیں اور مردوں نقدی زیورات اور جو کچھ وہ اٹھا سکتے تھے ان گھروں سے نکل آئے تھے۔ خون کا طوفان ہمارے گاؤں تک نہیں پہنچا تھا۔ اطلاع ملی تھی فساد یوں کا طوفان تیزی سے چلا آ رہا ہے۔ ہمارے گاؤں اور ارد گرد کے چار پانچ دیہات سے ہجوم کارے اور واگور کی فتح کے نعرے اٹھتے تھے ہمارے مردوں نے دوڑاٹھائی گھنٹوں کی محراب سے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا تھا جو فساد ہمارے مردوں کی کلباڑیوں اور لاشیوں سے بچ نکلے تھے بھاگ گئے تھے۔ وہاں تین ہندو گھرانے ایسے جو پانچ نو جوان لڑکیوں اور دو عورتوں کو مسلمانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ مسلمانوں نے انہیں پناہ میں لے لیا تھا لیکن مسلمان جانتے تھے کہ جو فساد بلوائی بھاگ گئے ہیں، وہ انتقام لینے کے لیے بلوائیوں کی ایک مسلح فوج کو ساتھ لائے گئے۔ ہمارے جوان مرد بھاگنے پر آمادہ نہیں تھے کہتے تھے کہ مقابلہ کر کے نکلیں گے تاکہ بلوائی نہ کہیں کہ مسلمان بھاگ گئے ہیں یا جردل ہیں بزرگوں نے بڑی مشکل سے انہیں قائل کیا کہ ہمیں زندہ و سلامت پاکستان پہنچنا ہے۔ اگر ہم مقابلے میں ڈٹ گئے تو عورتوں کی آبرو خطرے میں جائے گی۔ سو تین چار گاؤں کے مسلمان عورتوں اور بچوں کو ساتھ لیے قافلے کی صورت میں پڑے تھے۔ اتنی تیل گاڑیاں ساتھ تھیں جن میں

وہ ایک تاریخی سفر تھا جو موت کے سائے میں ہوا۔ اپنوں کے خون میں سب نہائے بچوں کو سینے سے لگائے زمینوں کو اٹھا اٹھا کر تیل گاڑیوں میں ڈالنے، ہندو اور بلوائیوں سے جگہ جگہ لڑتے، مقابلہ کرتے شاہ راہوں اور پگڈنڈیوں سے ہٹ کر کانٹوں اور تپتی زمین پر چلتے چلے گئے تھے۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ چلتے وقت ہمارے قافلے میں شامل لوگوں کی تعداد کتنی تھی، بس اتنا ہی یاد ہے کہ جب ہم واہگ پورے تو ہماری گیارہ تیل گاڑیوں میں ستاون (57) لاشیں تھیں جن میں ایکس لاشیں دو برس سے سات برس کے عمر کے بچوں کی تھیں اور قافلے کی تعداد نصف سے بھی کم رہ گئی تھی۔ اس قافلے کے ساتھ میرے دو بڑے بھائی بھی چلے تھے جو انبالے سے کوئی تیس میل دور بلوائیوں کے ایک حملے کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اس معرکے میں ہمارے قافلے کے چھ مرد اور بارہ بچے شہید ہوئے تھے اور جو ہندو اور سکھ بلوائی ہلاک ہوئے ان کی تعداد بیسیا بیچاس سے زیادہ تھی۔ ہمارے مرد لاشیوں، کلباڑیوں اور تلواروں سے مسلح تھے، تین شکاری ہندو تیس اور دو بے تلوں بھی تھے۔ عورتوں کے پاس چھریاں اور چارہ کاٹنے والے ٹوکے تھے۔ پہلے دو حملوں میں ہم کم سن لڑکیاں اور بچے چھینچ کر روئے تھے لیکن اس کے بعد ہم میں ایسا انقلاب آیا تھا کہ واہگ تک ہم پر پندرہ سولہ حملے ہوئے مگر کوئی ایک بھی ایسا بچہ نہ تھا جو ہشت سے رو

پڑا ہو۔ تین چار برس کے بچوں کو تو میں نے کافروں سے پتھروں سے لڑتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

پاکستانی سرحد سے سولہ سترہ میل دور ہم پر آخری حملہ ہوا تھا۔ ہمارا قافلہ نہ صرف تھکا ماندہ اور بھوکا پیاسا تھا بلکہ آدھا بھی نہیں رہ گیا تھا۔ بلوائیوں کی تعداد کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ان کے ہجوم میں ہمارا کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ ”یاعلیٰ مددا!“ اور ”اللہ اکبر!“ کے نعروں کی گرج تو سنائی دے رہی تھی لیکن توقع بھی تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی زندہ نہ رہے گا۔ ہم جو لڑکیاں تھیں، سردوں پر دوپٹے پیٹ کر چاہر پھیل کر لڑیں۔ بلوائیوں کی اس کمزوری سے ہم لڑکیوں نے خوب فائدہ اٹھایا کہ وہ ہمیں پکڑنے کے لیے لپکتے تھے اور اس طرح ہمارے ہاتھوں کٹ جاتے تھے ایسے میں اچانک مشین گنوں اور رائفلوں کے چلنے کی آواز آئی تھی۔ ہم سمجھے کہ ہندو فوج آ گئی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ کسی کافر کے ہاتھ چڑھ جانے سے پہلے اپنے آپ کو ختم کر لوں گی..... لیکن وہاں صورت کچھ اور ہی تھی۔ آنے والے فوجی ”یاعلیٰ!“ کے نعرے لگا رہے تھے۔ اچانک ہی دونوں جیوں نے مجھے اپنے درمیان کر لیا تھا اور ایک نے پنجابی زبان میں کہا تھا۔ ”گویئے.....! ساڈے نال رہیں۔“ (لڑکی.....! ہمارے ساتھ رہنا۔) میں نے ایک ہندو سے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“ معرکے کے شور و غل میں مجھے بھی کچھ سنائی دیا تھا۔ ”پاکستانی.....! پاکستانی.....!“

وہ پاک فوج کے جوان تھے جنہوں نے ہمیں حصار میں لے لیا تھا۔ میرے دل میں یہ احساس پختہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں میرے وہی گئے بھائی تھے جو انبالے سے تیس میل دور شہید ہو گئے تھے اور اب بھی یہ عالم ہے کہ مجھے تنہائی میں اپنے بھائی یاد آتے ہیں

تو وہ دیہاتی لباس میں نہیں ہوتے بلکہ خاکی وردی پہنے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں سنگینیں لگی اور انگلیں ہوتی ہیں اور مجھے ان کی آواز سنانی دیتی ہے۔ ہمارے ساتھ رہنا گویے.....! پھر مجھے ایسی روحانی طاقت مل جاتی ہے کہ دل میں کوئی پریشانی نہیں رہتی نہ حالات کی سختی کا احساس رہتا ہے۔

یہ تو ہمارے سفر کی مختصر سی روداد ہے جو صرف میری نہیں بلکہ ہر اس مسلمان کی داستان ہے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ ہر قافلے کے ساتھ یہی کچھ ہوا تھا جو ہمارے ساتھ ہوا۔ یہ کہانی ہزاروں لاکھوں پاکستانی چاچکی ہے۔ مجھے اب سنبھالنے کیوں یہ خوف رہنے لگا ہے کہ پاکستانی قوم کی کوئی ایسی نسل نہ آجائے جو اس کہانی کو بھول جائے یا جس تک یہ کہانی پہنچ ہی نہ سکے۔ میں اس کہانی میں اتنا اضافہ ضرور کروں گی کہ اگر کسی پاکستانی کے دل میں بھولے سے بھی یہ خیال آجائے کہ ہندوستان اور پاکستان کی دوستی ہو سکتی ہے تو میں اُسے پاکستانی کہی نہیں کہوں گی

پاکستان میں داخل ہو کر میرا ایک اور ایسا سفر شروع ہو گیا جو ہجرت کے سفر سے بھی زیادہ ٹھن تھا۔ میری عمر چودہ سال تھی۔ والد صاحب کو فوت ہوئے چھ سال گزر گئے تھے۔ میرے دو بڑے بھائی تو ہجرت کے دوران شہید ہو گئے تھے اب ہمارے کنبے میں امی جان میں اور میرے دو چھوٹے بھائی تھے۔ سرحد پار ہمارا اپنا مکان اور خالی زمین تھی۔

پاکستان میں آئے تو ہمارے پاس چند تولے سوناز پورات کی صورت تھا جس کی لاگت سات ساڑھے سات ہزار کے لگ بھگ تھی لیکن وہ ساڑھے چار ہزار میں فروخت ہوئے۔ اس رقم کے بل بوتے پر ہم نے نئی زندگی کا آغاز کیا۔ امی نے

سلائی کی مشین لے لی اور گھر گھر سے کام لاکر گھر کا نظام چلانے لگیں۔ خدا ان مقامی گھروں والوں اس نیکی کا اجر دے کہ وہ بعض اوقات ہمیں محض دینے کے لیے کام دیتے تھے مثلاً ایک روز ایک عورت اپنی قمیص لائی جو ایک جگہ سے فراہمی ہوئی تھی۔ امی نے چند ہی منٹ میں مشین پھیر دی۔ اور عورت نے امی کو پیسے دیئے تو امی نے لینے سے انکار کر دیا اور بولیں۔ ”یہ بھی کوئی کام ہے جس کے پیسے لوں!“

عورت نے بڑے پیار سے کہا۔ ”بہن! میں دراصل تمہاری مدد کرنا چاہتی تھی قمیص تو ایک بہانہ ہے۔“

ہماری رہائش کا مسئلہ ایک چھوٹے سے مزدور مکان نے حل کر دیا تھا۔ دونوں بھائیوں کو اسکول داخل کرادیا۔ محلے کی عورتوں نے میری امی کو مشورہ دیا کہ میری شادی کر دیں۔ انہوں نے ایک مقامی گھرانے میں آیار شے کا پیغام بھی دیا لیکن میں نے اس سوچ اور ارادے سے انکار کر دیا کہ امی سلائی والے کام سے فارغ کرنے کے لیے خود کماؤں گی اور چھوٹے بھائیوں کو بھی اچھی تعلیم دلاؤں گی۔ میں اپنے ارادوں کو شادی کی زنجیر میں نہیں جکڑنا چاہتی تھی مگر مشکل یہ تھی کہ میری تعلیم ہونے کے برابر تھی۔ گاؤں کے اسکول میں پانچ جماعتیں پڑھی تھی۔ انگریزی کی تو ابے بی جا تھی نہیں آتی تھی۔

اس دوران میں محلے کی ہم عمر لڑکیاں میرے پاس آنے لگی تھیں تو ان سے میری بہت دوستی ہوئی تھی جس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اپنی طبیعت کی نشانی کو مرنے نہیں دیا تھا۔ میرے سینے میں جو زخم تھے وہ پاکستان کی خاطر کھائے تھے۔ میں نے یہ رویہ اختیار کر لیا کہ رونے کی بجائے ہنسنا شروع کر دیا کوئی

فراہمی بھی ثقافت بات کہہ دے تو میں قہقہہ لگا کر ہنسا کرتی تھی۔ اس رویے سے یہ فائدہ ہوا کہ مجھے بھی اپنی مذاق کا ڈھنگ آ گیا اور اس عادت نے مجھے بے شمار سہیلیاں عطا کیں۔ ان سہیلیوں نے مجھے یہ انعام دیا کہ وہ میری خواہش کے مطابق مجھے انگریزی اور اردو پڑھانے لگیں۔ یوں ایک سال کے عرصے میں میں نے سہیلیوں سے اتنی انگریزی اور اردو پڑھ لی کہ بغیر مدد کے اگلا سبق خود پڑھ لیتی تھی۔

ذریعہ سال اور گزارا تو میں نوپس جماعت کی انگریزی کی کتابیں پڑھنے کے قابل ہو گئی۔ مجھے کسی امتحان میں نہیں لکھنا تھا اس لیے اردو اور انگریزی کسی اور مضمون کی طرف توجہ نہ دی البتہ اپنے طور پر تاریخ وغیرہ کا مطالعہ کر لیتی تھی۔

میرا راجن ڈاکٹری کی طرف تھا جو محض ایک خواب تھا۔ میں نے اپنی اس خواہش کا ذکر اپنی سہیلیوں سے کیا تو انہوں نے میرا تعارف ایک نرس سے کر دیا۔ وہ ایک جمالی عورت تھی جو ایک اسپتال میں ملازم تھی۔ فارغ اوقات میں وہ دائی کا کام بھی کرتی تھی۔ وہ عینے بھی لگا لیتی تھی۔ اس نے میری خواہش کو دیکھ کر مجھے ٹریننگ دینی شروع کر دی۔ وہ بھی مجھے اسپتال بھی لے جاتی اور ڈاکٹر سے چوری چھپے مجھے عملی تربیت دیتی۔ میں نے چند مہینوں میں نرسوں کی مرہم بنی اور انجکشن لگانے کا عملی تجربہ حاصل کر لیا۔ ساتھ ہی دو ایسیوں کے نام اور ان کے فون نمبرز یاد کر لیے اور پھر میں ڈاکٹروں کے نسخے بھی پڑھنے کے قابل ہو گئی۔

کر لی تھی اور دوسری وجہ جو میرے نزدیک زیادہ اہم تھی وہ یہ تھی کہ مجھے مریضوں کی تیمارداری کر کے روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی لیکن میں بغیر کسی شکیلیت کے کسی اسپتال میں تو ملازمت کر ہی نہیں سکتی تھی..... لیکن یہ مشکل اس طرح حل ہو گئی کہ جس نرس نے مجھے ٹریننگ دی تھی اُس نے مجھے ایک پرائیویٹ ڈاکٹر کے ہاں ملازمت دلوا دی۔ اُس نے کہا تھا کہ ”ڈاکٹر مجھے دو سو روپے ماہوار تنخواہ دے گا۔“ میرے لیے یہ رقم خاصی رقم تھی کیونکہ میں نہ تو تعلیم یافتہ تھی اور نہ ہی باقاعدہ تربیت یافتہ!

وہ بوڑھی نرس مجھے ڈاکٹر کے کلینک پر لے گئی تھی۔ اُس ڈاکٹر کا نام سہراب خان تھا اور کلینک کا نام بھی سہراب کلینک تھا۔ ڈاکٹر سہراب ادھیڑ عمر تو تھا لیکن نہایت ہی وجہ اور خوب رو آدی تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر چونک اٹھا اور آٹھ مہینوں ضرورت سے زیادہ کھول کر کئی دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے میری محسن نرس کی طرف دیکھا اور بڑی ہی بے تکلفی سے بولا۔ ”بہت قیمتی نرس لائی ہو!“

نرس نے ہنس کر کہا۔ ”بولیے کیا دیکھ گئے؟“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”دوسروپے ماہوار۔ اگر میری مرضی کے مطابق نکلی تو تنخواہ مزید بڑھا دوں گا۔“ پھر اُس نے ایک نسخہ لکھا اور میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے تمام دواؤں کے نام سنج پڑھے تھے۔

وہ میری ملازمت کا پہلا دن تھا کوئی بھی اندازہ نہیں کر سکتا کہ میں کس قدر خوش تھی۔ بوڑھی نرس نے مجھے ڈسپنسری کے دروازے پر روک کر رازداری اور پیار سے کہا تھا۔ ”بیٹی.....! تم میں دو خطرناک نقائص ہیں ایک یہ کہ تم جوان ہو دوسرا یہ کہ تم بہت ہی خوبصورت ہو کام محنت سے کرنا لیکن ڈاکٹر سے ذرا

میں اپنی کامیابی پر اتنی مسرور تھی کہ بس کی اس بات پر ذرہ بھر توجہ نہ دی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ میں تو جوان اور خوبصورت ہوں۔ میری عمر کا ایک سو اسی برس شروع ہو چکا تھا۔ میں آئینہ ہر روز دیکھا کرتی تھی لیکن ابھی وہی ان نہیں دیا تھا کہ میری شکل و صورت اچھی ہے یا بڑی! یقیناً جانو کہ مجھے اپنی صورت میں اکثر اپنے شہید بھائیوں کے خدوخال نظر آیا کرتے تھے۔ میں نے شہیدوں کے چہرے پر سرنی پاؤں کبھی نہیں چھو پیا تھا۔ اب تو میں اپنی ماں اور بھائیوں کے لیے مرد بن گئی تھی اور مرد تو میک اپ نہیں کرتے ناں! لیکن چند روز بعد ہی ڈاکٹر نے مجھے یہ احساس دلانا شروع کر دیا تھا کہ میں نہایت ہی حسین لڑکی ہوں۔ اس نے جب مجھ سے ہجرت کی داستان سنی تو میرے دل میں بے جا رگی اور بے بسی کا احساس ابھرنے لگا لیکن میں نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا تھا۔ یہی تو میرا کمال تھا کہ میں اپنے آپ کو کمزور اور بے بس لڑکی سمجھتی ہی نہ تھی میں نے دکھوں اور غموں پر فتح پالی تھی مگر ڈاکٹر ادا سی اور یاسیت سے بھر پور جملے کہہ کہہ کر مجھے غموں میں ڈبو دینا چاہتا تھا۔ ابتدا میں تو میں اسے پدرانہ شفقت سمجھتی رہی اور ڈاکٹر کی شکل و صورت میں مجھے اپنے والد صاحب نظر آتے رہے تھے۔

ڈاکٹر سہراب کے اس چھوٹے سے اسپتال یا ڈسپنسری میں مریضوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جن میں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی۔ وہاں ایک بوڑھا ڈسپنسر پہلے سے ملازم تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے صرف عورتوں کے لیے ملازم رکھا تھا۔ اس علاقے میں چار اور ڈاکٹر ز بھی تھے لیکن علاقے کے تمام مریض ڈاکٹر سہراب کے پاس ہی آتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر سہراب شگفتہ مزاج تھا، مریضوں کی اوٹ

پناگ باتوں سے کتنا ہی کیوں نہ اکتا جائے اس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ غائب نہ ہوتی تھی۔ مریض جتنا وقت مانگے اتنا ہی وقت دیتا تھا اور اس سے بڑی خوبی تو اس میں یہ تھی کہ مریضوں کے جذباتی سہارا تھا۔ وہ لاعلاج مرض والے مریضوں کو مرنے تک زندگی سے مایوس نہیں ہونے دیتا تھا۔ کسی مریض کو اس کے گھر دیکھنے جاتا تو فیس نہیں لیتا تھا۔ ہی اس نے مشورے کی کوئی فیس رکھی ہوتی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ میری اور بوڑھے ڈسپنسر کی یہ حالت ہوتی تھی کہ صبح آٹھ بجے سے ایک بجے تک اور شام چھ بجے سے رات دس بجے تک مریضوں کو دوائیاں دینے سے ایک لمحے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ وہ میری ملازمت کی آٹھویں شام تھی۔ رات کلینک کا وقت ختم ہوا تو ڈاکٹر نے بوڑھے ڈسپنسر کو کلینک بند کرنے کا کہتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ”ذرا میرے ساتھ آؤ۔“ میں اس کے ساتھ چل پڑی۔

وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ میں نے اس سے اس کے بیوی بچوں کے متعلق پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ اکیلا رہتا ہے اور گھر کا کام کاج اور کھانا پکانا ایک ملازمہ کرتی ہے۔ میں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے بال بکھر کر ماتھے پر آگئے تھے۔ ڈاکٹر نے بڑے پیار سے میرے بال پیچھے کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تمہیں اتنی مشقت کرتے دیکھ کر مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔“ مجھے اس کی یہ حرکت بہت سی پیاری لگی تھی پھر وہ میرے بالوں میں انگلیاں الجھا کر بولا تھا۔ ”تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟“ میں نے اسے بتایا کہ میں امی اور چھوٹے بھائیوں کے لیے آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ وہ میرے ہاتھ کو اپنے ہونٹوں تک لے گیا اور دلگھی سی آواز میں

بولاً۔ ”تمہارا باپ ہوتا بڑے بھائی زندہ ہوتے تو تمہاری یہ بیوی بھالی سی جوانی اور خوبصورتی مریضوں اور دوائیوں کی بددلی میں تباہ نہ ہوتی۔“ یہ کہہ کر اس نے ایسی آہ بھری جو مجھ سے بھری ہوئی تھی۔

میرے دل پر تو جیسے غموں کی بادل گر پڑی اور میرے آئینہ بہرے نکلے۔ ڈاکٹر بھی میرے ہاتھوں کو سہلاتا اور کبھی میرے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا اس طریقے کی باتیں کرتا رہا جن میں میرا درد اور نوحہ و الم تھا۔

میں کبھی کبھی امی کے ساتھ دکھ سکھ کی باتیں کر لیا کرتی تھی لیکن تھوڑی سی دیر کے لیے مگر جب ڈاکٹر نے میرے دکھوں کی بات چھیڑ دی تو مجھ میں یہ تلخ احساس بیدار ہو گیا کہ میں بہت دلی اور مظلوم ہوں اور میرے سر پر ہاتھ رکھنے والا کوئی نہیں۔ میرے من میں ایک عجیب سا جذبہ طاری ہونے لگا اور میں کسی مرد کی پناہ کی ضرورت محسوس کرنے لگی۔ ڈاکٹر کی باتیں مجھے فائل کر رہی تھیں کہ میرا نمونوں وغیرہ خوار یہی مرد ہے۔ چنانچہ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے جھڑانے کے بجائے اس کے دونوں ہاتھوں کو بہت مضبوطی سے تھام لیا تھا اور وہ میں ہچکیاں لے لے کر رونے لگی تھی اور یہ سلسلہ خاصی دیر تک جاری رہا تھا۔

ملازمہ نے کھانے کی اطلاع دی تو ڈاکٹر نے مجھے کھانے کے لیے روک لیا۔ میں نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ کھانے کے دوران بھی وہ میرے ہی متعلق باتیں کرتا رہا اور اس نے دو تین بار کہا کہ تم شادی کر لینی چاہیے اور پھر جب میں گھر کو روانہ ہوئی تو وہ تھوڑی دیر تک میرے ساتھ آیا۔ میرا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ ایک اندھیری جگہ رک کر اس نے میرے ہاتھ تھام لیے اور مجھے اپنے قریب کر کے

ایک ہاتھ میرے بالوں میں پھیرنے لگا۔ میں نے سوچا کہ اگر میرے ابا جان زندہ ہوتے تو مجھے پریشان دیکھ کر اسی طرح میرے سر پر ہاتھ رکھ لیتے۔ میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر سر اس کے سینے سے لگا دیا تھا۔

میں نے اپنے گھر آ کر امی کو ساری بات کہہ سنائی تھی اور ایک لمحے کے لیے بھی ڈاکٹر کی نیت پر شک نہ کیا لیکن امی کچھ چپ سی ہو گئیں پھر کہنے لگیں۔

”بیٹی.....! دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں لیکن بڑے لوگوں کی بھی کمی نہیں۔ تم نادان ہو۔“

”بس امی.....! بس۔“ میں نے امی کو کچھ اور نہ کہنے دیا تھا۔

دن اسی طرح گزرتے رہے تھے ڈاکٹر سہراب ہر دوسرے تیسرے دن مجھے اپنے گھر لے جاتا اور میرے ساتھ ہر طرح کی باتیں کرتا اور پھر ایک روز میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دو سال قبل اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ اس کی ایک بیٹی تھی جسے اس کی بیوی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ میں نے ان دونوں کے متعلق مزید بہت پوچھا لیکن اس نے کھل کر کوئی بات نہیں کی وہ شاید انہیں زندگی اور دل سے اتار دینا چاہتا تھا۔ ان کے ذکر سے وہ اداس اور بے چین سا ہو گیا تھا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بیوی نے اس سے وفائی نہیں کی تھی۔ اگر ڈاکٹر مجرم ہوتا تو وہ دوسری شادی کر چکا ہوتا۔

وقت گزرنے کے ساتھ میں ڈاکٹر سے کچھ زیادہ ہی کھل گئی اس کی عمر مجھ سے دو تین گروہ اس قدر زندہ دل تھا کہ میں اسے اپنا ہم عمر دوست سمجھ گئی تھی یوں ہماری بے تکلفی بڑھتی گئی لیکن میں نے اس کے احترام میں کوئی فرق نہ آنے دیا وہ

گفتگو کے دوران میں میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر آہستہ آہستہ سہلانا رہتا اور کبھی کبھی میرے بالوں میں انگلیاں پھرنے لگتا تھا۔ میں نے اس کی ان حرکات پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا کیونکہ میں اسے اپنا ہمدرد اور باپ کی سوچ و مرتبے والا آدمی سمجھتی تھی اور میرا ذہن اور ضمیر پاک اور صاف تھا۔ اس نے دراصل میرے دل میں غم بیدار کر دیا تھا اور یہ احساس بھی کہ میں ایک نوجوان حسین اور لاوارث لڑکی ہوں۔ وہ جب میرے درد کی باتیں کرتا تھا تو مجھے ایک انوکھا سا سکون محسوس ہونے لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اسے اپنا غم خوار سمجھنے لگی تھی۔

ایک روز بوڑھے ڈپینسر نے مجھے بہت ہمدردی اور پیار سے کہا تھا۔ ”بیٹی! مجھے تمہاری ذاتی زندگی میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن تم کم سن، بھولی اور نا تجربہ کار لڑکی ہو اس لیے تمہیں خطروں سے آگاہ کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر سہراب ایک اچھا انسان نہیں ہے وہ تم جیسی دو تین لڑکیوں کی زندگی برباد کر چکا ہے اسی لیے اس کی بیوی نے اس سے طلاق لے لی تھی اس لیے تم ڈاکٹر سہراب سے دور ہی رہو بلکہ کسی اور جگہ نوکری ڈھونڈ لو۔ بیٹی! تم اس کے جال میں پھنستی جا رہی ہو اب بھی وقت ہے ڈاکٹر سے نجات حاصل کر لو اپنی زندگی اور عزت برباد ہونے سے بچا لو۔“

میں ڈاکٹر سہراب سے اس قدر متاثر تھی کہ میں اس کے خلاف کوئی بھی بات برداشت نہ کر سکتی تھی۔ میں نے ڈپینسر سے کہا کہ ”ڈاکٹر ایسا آدمی نہیں ہے اور.....!“

اس نے مجھے یہ کہہ کر چپ کر دیا کہ تم بچی ہو میں اس دنیا میں تم سے پچاس سال پہلے کا آیا ہوا ہوں پھر اس نے ڈاکٹر کا لکھا ہوا ایک نسخہ میرے سامنے رکھ دیا اور بولا۔ ”اسے پڑھو! یہ کھاسی کے

ایک پرانے مریض کی دوائی ہے جو ایک سال ڈاکٹر کے زیر علاج ہے اس کی بیماری کی طرح اس کے پھیپھڑوں میں موجود ہے۔ پورے اطمینان سے دوائی پیتا چلا جا رہا ہے پڑھ کر بتاؤ کہ اس میں کھاسی کی دوائی کون سی باقی جو کچھ لکھا ہے وہ کیا ہے؟“

میں نے نسخہ پڑھا، نسخے میں صرف دو کھاسی کے نسخے باقی چار اجزا مختلف قسم کی نشہ خواب آور دوائی تھیں حالانکہ میں یہ نسخے ہاتھوں سے تیار کر کے مریضوں کو دیا کرتی تھی کبھی کبھی غور نہیں کیا تھا کہ اصل مرض کی دوائی

میں اور دیگر اجزا کتنے دیئے جا رہے ہیں؟ ڈپینسر نے کہا۔ ”یہ مریض ان نشہ آور دوا کا عادی ہو گیا ہے۔ اسے رات کو کھاسی سونے دیتی تھی لیکن اب یہ دوا میں اسے مدد بخش کر کے نیند سلائے رکھتی ہیں وہ ہر روز پانچ روپے ڈاکٹر حوالے کر جاتا ہے اور بدست رہتا ہے صرف ایک مریض نہیں، ڈاکٹر کا ہر مریض ان دوا کا عادی ہو چکا ہے اسی وجہ سے یہاں مریضوں کا رہتا ہے کہ یہاں سے ہر ایک کو سکون ملتا ہے۔ میں صرف عورتوں کے نسخے تیار کیا کرتا ڈپینسر کی بات سن کر مجھے خیال آیا کہ عورتوں کو سکون میں بھی نشہ آور دوائی خاصہ مقدار میں جانی تھیں۔ ڈپینسر نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر نے مریض کو ٹیکہ ضرور لگاتا ہے جس میں کالسی (Calcitane) ہوتا ہے۔ یہ ٹیکہ ہر مریض کے ضروری نہیں ہوتا بلکہ یہ تو مریضوں کے لیے وہ ہوتا ہے۔ یہ ٹیکہ وقتی طور پر اتنا فائدہ دیتا ہے مریض کی تکلیف لکھوں میں دور ہو جاتی ہے۔ ٹیکہ بیماری کو ختم نہیں کرتا بلکہ بیماری کو دبا دیتا بیماری کو سلا دیتا ہے، بخار اور درد خواہ کتنا ہی

تو ہو یہ ٹیکہ فوری اثر کرتا ہے۔ درد کو ختم کرتا ہے اور درجہ حرارت نارمل ہو جاتا ہے۔ یہ ان جراثیموں کو یا تو مارتا ہے یا کمزور کر دیتا ہے جو صحت اور تندرستی کے لیے ضروری ہوتے ہیں پھر اس ٹیکہ کے مضر اثرات (side effects) ظاہر ہونا شروع ہوتے ہیں جو کسی نئی بیماری کی صورت میں ہوتے ہیں۔ مریض ان باتوں سے خبر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ مریض ڈاکٹر کا مرید بن جاتا ہے اور دوسرے لوگوں کے سامنے ڈاکٹر کی قابلیت کے قصیدے کہتا ہے اور یوں مریضوں کا رش بڑھتا جاتا ہے۔

ڈاکٹر کے ساتھ میری بے تکلفی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ میں اخلاق اور احترام کے دائرے میں رہ کر اس سے ہر طرح کی بات پوچھ سکتی تھی میں اسی رات اس کے گھر گئی اور کھانا وہاں ہی کھایا اور پھر باتوں کے درمیان صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ ”آپ مریضوں کو نشہ پلا پا کر ان سے پیسے بٹور رہے ہیں۔“

ڈاکٹر نے فوراً ہی مجھ سے پوچھا کہ مجھے یہ بات کس نے بتائی ہے؟ میں بوڑھے ڈپینسر کا نام نہیں لینا چاہتی تھی میں نے کہا کہ میں دوائیوں کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ مجھے تو یقین تھا کہ ڈاکٹر مجھے لکچر دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کرے گا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے درست ہے لیکن وہ تو کچھ اور ہی بولا تھا۔

”میں نے تمہیں کبھی کہا ہے کہ تم مسلمان لڑکی ہوتے ہوئے برقع لیے بغیر باہر گھومتی پھرتی ہو اور مجھ جیسے غیر مرد کے ساتھ اتنی بے تکلفی سے رہتی باتیں کرنی اور تہمتیں لگاتی ہو؟“

”میری تو ضرورت ہی ایسی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کچھ ایسی ہی ضرورت میری بھی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن یہ تمہیں بیٹھے بیٹھے ایسا خیال کیوں

آ گیا ہے؟“

”ڈاکٹر صاحب!“ میں نے جھنجھلا کر کہا۔ ”یہ بدویا تھی ہے یہ گناہ ہے۔“ وہ بخند ہو گیا اور خاصی دیر چپ رہ کر اس نے اپنی صفائی میں جو بیان دیا، وہ طبعی قابل قبول نہیں تھا اس لیے میں ان باتوں کا ذکر نہیں کروں گی مگر ساتھ ہی اس نے یہ انکشاف بھی کر دیا کہ آج کل شاید ہی کوئی ڈاکٹر ایسا ہوگا جو مریض کا مکمل معائنہ کر کے اس کے مرض کی جڑ تک پہنچے۔ پیینٹ دوائیوں کی ایسی بھرمار ہو گئی ہے کہ ڈاکٹر نسخے میں ایسی ایک دو دوائیوں کو ضرور شامل کرتا ہے اس کا باقی کام کارٹی سون اور نشہ آور دوائیوں نے سہل کر دیا ہے۔

ڈاکٹروں نے مریضوں کو فوری افاتے کا عادی بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر کی نظریے کے مطابق بخار کو آہستہ آہستہ نارمل پر لانا چاہیے لیکن اب ٹیکہ لگانے سے درجہ حرارت فوراً اٹھانے پر آ جاتا ہے۔ مریض خوش ہو جاتا ہے لیکن اسے بتانے والا کوئی نہیں ہوتا کہ اس دوائی اور اس کے عمل نے اس کی جسمانی مشینری میں ایسی خرابی پیدا کر دی ہے جو اسے آئے دن کی نہ کسی مرض میں مبتلا رکھے گی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جو بھی ڈاکٹر ان دوائیوں کو نقصان دہ سمجھ کر مریض کا صحیح علاج اپنے لکچروں سے کرتے ہیں وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے فاتے کر رہے ہیں۔“

یہ ایک طویل اور تکلیف دہ بحث تھی مجھے ڈاکٹر کی کوئی بھی دلیل اچھی نہ لگی مگر میرے لیے ایک بہت مشکل لیکن نہایت جکی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر مجھے اچھا لگتا تھا۔

چار سال اسی طرح ڈاکٹر کے پاس کام کرتے اس سے ملنے اور ہنسی مذاق کرتے گزر گئے۔ ڈاکٹر مریضوں کو کارٹی سون اور نشہ آور دوائیاں دیتا رہا۔

بوڑھا ڈسپینسر مجھے کہتا رہا کہ میں ڈاکٹر سے دور رہوں لیکن میں نے اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس دوران ڈاکٹر نے میری تنخواہ ساڑھے تین سو روپے ماہوار کر دی۔ امی سلائی مشین سے روزمرہ کی دال روٹی نکالنے میں مصروف رہیں اور بھائی اطمینان سے تعلیم حاصل کرتے رہے اور میں ڈاکٹر کے ساتھ مزید بے تکلف ہو گئی۔ تنہائی میں وہ میری انگلیوں اور بالوں میں اپنی انگلیاں ہر دم الجھائے رکھتا تھا۔ کئی بار ایسا بھی ہوتا کہ اس کے کسی لطفیہ بابا بت پر میں اس قدر ہمتی کہ سر اس کی گود میں جا پڑتا۔ کسی انسان کے کردار کو پرکھنے کے لیے چار پانچ سال کا عرصہ تھوڑا تو نہیں ہوتا نا!

ڈاکٹر کے کلینک پر ایک خوبصورت جوان سال عورت اکثر آیا کرتی تھی۔ ڈاکٹر اسے مفت دوائی دیا کرتا تھا اور اسے ڈاکٹر نے کبھی کوئی نشہ آور دوائی نہیں دی تھی اور نہ ہی کبھی اس کو اسٹرائیڈ کا ٹیکہ لگایا تھا۔ اگر ڈاکٹر نے بھی اسے انجکشن دیا بھی تو وہ طاقت کا ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ سی عورت تھی اس کے ساتھ ایک کم عمر کا بچہ بھی ہوتا تھا۔ ایک روز میں نے اس عورت کو دوائی دی تھی تو اس نے تھوڑا آگے جھک کر کہا تھا۔

”میں تم سے علیحدگی میں ملنا چاہتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”کلینک بند ہونے کے بعد مل سکوں گی۔“

شام کو چھٹی ہونے کے بعد میں گھر روانہ ہوئی تو وہ عورت راستے میں کھڑی تھی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئی اس نے کسی لمبی چوڑی تہید کے بغیر اداس اداس لہجے میں کہا تھا۔ ”بہن.....! ڈاکٹر سہراب نے میرے ساتھ شادی کا وعدہ کیا تھا لیکن تم درمیان میں آ گئی ہو۔“

یہ بات سن کر مجھے حیرت کا ایک نہایت شدید جھکا لگا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس بخت عورت کو کیا کہوں! اچھا ہوا کہ وہ بوٹی جلی تھی اور اس نے مجھے بولنے کا موقع نہ دیا تھا۔

”اس میں تمہارا انصو رہے اور نہ ڈاکٹر کا کیونکہ تم مجھ سے زیادہ خوبصورت اور نوجوان ہو۔ میں بچوں کی ماں ہوں وہ مجھ سے شادی بھلا کیوں کرے گا؟“

میں یکا یک پھٹ پڑی اور اسے کہا۔ ”بذرا نا عورت.....! بات کرنے سے پہلے سوچ تو لیا ہوتا کہ تم کیا کہنے لگی ہو؟ میں تو ڈاکٹر کو اپنا باپ جیسا سمجھتی ہوں۔“

”میں بھی اسے باپ ہی سمجھتی تھی۔“ اس نے اداس سی مسکراہٹ سے کہا۔ ”پہلے میری بات سن لو پھر جو جی میں آئے“ کہنا۔ میرا خاوند بیمار ہو گیا تھا تو میں اس ڈاکٹر کو بلا لاتی تھی۔ اُس وقت میری گود میں ایک ہی بچہ تھا ڈاکٹر نے دوائی دی اور پھر میں اس سے دوائی لاتی رہی۔ وہ کبھی کبھار گھر آ کر میرے خاوند کو دیکھ جاتا تھا۔ میں اُسے اپنا سونچ کر اس کے گھر بھی چلی جایا کرتی تھی۔ وہ میرے ساتھ بے تکلف ہو گیا تھا۔ اکثر میرے بالوں اور میری انگلیوں کے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور پھر بے تکلفی اتنی بڑھی کہ..... حد سے بڑھ گئی۔ میرا خاوند ڈیڑھ سال بیمار رہ کر مر گیا اس کے مرنے کے چند ماہ بعد میرے ہاں دوسرا بچہ پیدا ہوا۔ اس حقیقت کا کامی کو بھی علم نہیں کہ میرے اس بچے کا باپ میرا خاوند نہیں بلکہ یہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ شادی کرے گا لیکن اس نے اچانک میرے ساتھ تعلق توڑ لیا۔ میں حیران تھی کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے؟ اور پھر ایک رات جب میں اس کے گھر کے دروازے تک پہنچی تو

میرے تم نکل رہی تھیں بات فوراً ہی میری سمجھ میں آ گئی تھی کہ تم نے ڈاکٹر کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ ڈاکٹر کی ملازمہ کو میرے اور ڈاکٹر کے تعلقات کا اچھی طرح علم تھا۔ ایک روز میں نے اس سے بات کی تو اس نے بھی یہی کہا کہ اب تم ڈاکٹر کو نہ پاسکو گی۔ اسے ایک نئی اور جوان دوست مل گئی ہے۔

اس روز میں نے شدت سے محسوس کیا کہ میں ایک نہایت نادان اور بے وقوف لڑکی ہوں اور مجھے دنیا والوں کے ہتھکنڈوں کی ذرا بھر بھی خبر نہیں۔ میری زبان گنگ ہو گئی اور میں کچھ کہنے بغیر اس عورت کے گھر سے نکل آئی اور سیدھی گھر پہنچ گئی مگر چین نہ آیا۔ جھوک تک غائب ہو گئی۔ میں نے امی سے جھوٹ بولا کہ مجھے ڈاکٹر کے ساتھ ایک کیس دیکھنے جانا ہے۔ امی کے سامنے میں نے ڈاکٹر کی ایسی اچھی تصویر پیش کر رکھی تھی کہ اب انہیں میرے متعلق کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ میں ڈاکٹر کے گھر جا پہنچی اس نے مجھے دیکھتے ہی روزمرہ کی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا لیکن میری نظروں میں اب اس کی شکل و صورت بدل چکی تھی۔ میں نے اس عورت کا قصہ شروع کیا اور جو جی میں آیا کہتی چلی گئی۔ میں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ آپ میرے ساتھ بھی وہی کھیل کھیل رہے ہیں لیکن میں اپنے آپ کو اس عورت کی طرح تباہ نہیں ہونے دوں گی۔

ڈاکٹر نے اپنی صفائی میں دیکھیں کہا کہ وہ عورت جھوٹ بولتی ہے نہ اس نے یہ کہا کہ میں اس پر چھوٹا الزام عائد کر رہی ہوں۔ میں اس سے دور بیٹھی واپس چلی جی بک رہی تھی اس نے سر جھک لیا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ کہے کہ وہ عورت جھوٹ بولتی ہے۔ وہ ایسا کہتا تو میں فوراً مان جاتی کہ میں تو اسے اپنا باپ سمجھتی تھی۔ کوئی بیٹی اپنے باپ کے خلاف ایسا غلیظ الزام برداشت نہیں کر سکتی لیکن ڈاکٹر نے اس الزام

کی تردید نہ کی۔ میں نے آخر اکتا کر کہا۔ ”آپ کہتے کیوں نہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے؟“

اس نے سر اٹھایا۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس محبوب چہرے پر میں نے پہلی بار آنسو بہتے دیکھے توجی میں آئی کہ اس کے آنسو اپنے دوپٹے سے پونچھ دوں مگر وہ مجرم تھا ایک عورت کو بر باد کرنے کا مجرم۔ میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا پھر وہ رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

”نہیں یہ سب سچ ہے۔“

میرے دل میں تیر سال کا اور میں وہاں سے اٹھ کر بھاگی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ اس نے میرا نام لے کر پکارا تھا لیکن میں سنی ان سنی کر کے وہاں سے نکل آئی تھی۔ میں اگلی صبح کلینک نہ گئی اب وہاں کی ملازمت سے میرا جی بھر گیا تھا۔ جسے میں باپ سمجھتی تھی وہ پاپی نکلا۔ رضیوں کو نشے والی دوائیوں کے جادو میں پھنسانے رکھنے والا پاپی..... میں نے سوچا وہ ایک عورت سے نہیں کئی عورتوں سے کھیل چکا ہے میں نے امی کو تو کچھ بھی نہ بتایا لیکن اس نرس کے ہاں چلی گئی جس نے مجھے یہاں رکھوایا تھا۔

وہ نرس جب کبھی مجھے ملا کرتی تھی تو میں اسے بتایا کرتی تھی کہ ڈاکٹر نکلتا اچھا آدمی ہے مگر اس روز نرس نے بتایا کہ وہ اس سارے ڈرامے سے واقف ہے اسی لیے اس نے مجھے ڈاکٹر سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی۔ خدا اسے اس نینسی کا اجر دے۔ اس نے اسی روز مجھے ایک اور اسپتال میں نوکری دلوادی تھی مگر کیونکہ میرے پاس تحریکیٹ نہیں تھا اس لیے تنخواہ کم دی گئی۔ اس نیک سیرت نرس نے میرے لیے ایک دو اور پرائیویٹ کام نکال لیے تھے جن سے میری ماہوار آمدنی میں کوئی فرق نہ آیا۔

کوئی ایک سال گزارا ہوگا کہ ڈاکٹر سہراب کی ملازمہ مجھے اسپتال میں ملنے آئی۔ اس نے خاصی مشکل سے مجھے ڈھونڈا تھا۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر اتنا بیمار ہے کہ شاید زندہ نہ رہ سکے۔ اس نے التجا کی تھی کہ میں اسے ایک بار دیکھ آؤں۔ میں جانے پر آمادہ نہیں تھی لیکن ملازمہ نے ایسی باتیں بتائیں کہ میں جانے پر مجبور ہوئی۔ اس نے بتایا کہ ڈاکٹر سہراب رات کو شراب پینے کا عادی تھا لیکن اس کی اس عادت کا کسی کو علم نہ تھا۔ (مجھے بھی پہلی بار بتا چلا تھا کہ وہ شرابی ہے۔) مگر بی بی.....! جس رات تم اسے لعنت ملامت کر کے آئی تھیں اس نے اسی رات شراب چھوڑ دی تھی۔ وہ سینے میں ایک ایسا دکھ اٹھائے پھرتا ہے جسے وہ شراب میں یا ہنسی مذاق میں ڈبو دینے کی کوشش کرتا رہا ہے۔ تم ناراض ہو کر چلی گئیں تو اس نے شراب چھوڑ دی اور اس کا مزاج اس قدر چڑچڑا ہو گیا کہ اس نے مرلیضوں کے ساتھ بھی بدکلامی شروع کر دی۔ چند ماہ پہلے اسے سینے میں درد شروع ہو گیا۔ پہلے وہ خود علاج کرتا رہا لیکن درد بڑھتا ہی گیا۔ آخر ایکس رے کے ساتھ دوسرے ڈاکٹروں سے معائنہ کرایا تو معلوم ہوا کہ اسے پیچھے پھروں کا سرطان ہو گیا ہے یہ شراب نوشی کا نتیجہ تھا۔ وہ اسپتال میں داخل ہو گیا مگر ڈاکٹروں نے تھک ہار کر اسے گھر بھیج دیا ہے۔ اب وہ آخری دنوں پر ہے۔ تمہیں ہر وقت یاد کرتا ہے کہتا ہے کہ اسے ایک بار میرے پاس لے آؤ تاکہ میں خدا کو منہ دکھانے کے قابل ہو جاؤں۔“

میں اسی روز ڈاکٹر کے گھر چلی گئی۔ ایک نہایت خوش طبع اور خوب رو انسان میرے سامنے لاش کی شکل میں پڑا تھا چہرے پر درد کے آثار نمایاں تھے۔ میں کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے سر گھا کر مجھے دیکھا اور پچکیاں لے لے کر رونے لگا۔ مجھ سے رہانہ

گیا۔ مجھے یاد آ گیا کہ جب میں روتی تھی تو وہ بہلا لیا کرتا تھا۔ آج وہ رو رہا تھا۔ میں اس کے بیٹھ گئی تو اس نے پرانی عادت کے مطابق میرا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میری انگلیوں میں لگا لگھانے لگا مگر اب اس کے ہاتھ سرد اور سہل ہو چکے تھے۔ اس نے بے ساختگی سے میرے ہاتھ ہونٹوں سے لگا لیا اور بچوں کی طرح بلک بلک رونے لگا۔ میرے بھی آنسو نکل آئے۔ اسے اس بے بسی میں دیکھ کر میرے دل سے تمام غلے نکل گئے۔

”آپ نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟“ میں پوچھا۔
 ”گناہ گاروں کا یہی حال ہوتا ہے۔“ اس نے نحیف آواز میں کہا اور آہ بھر کر آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ ”زندگی کی آخری خواہش یہی تھی کہ ایک بار آ جاؤ آج آ گئی ہو تو میری باتیں سن لو۔“
 مرنے تک میری صورت نہ دیکھنا۔ میں گناہ گاروں ہوں۔ تم نے مجھ پر جو الزامات لگائے تھے وہ سب ہیں۔ میں نے مرلیضوں کو نشہ آور دواؤں سے بے جا حال میں پھنسائے رکھا۔ میں نے ایک عورت کو دھوکہ دیا لیکن میں نے تمہیں کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ میرے متعلق مشہور ہو گیا تھا کہ میں نے بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے بھی یہی کہا تھا شروع کر دیا۔ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ میں نے تمہیں بھی یہی بتایا تھا لیکن آج میں تمہیں حقیقت بتا رہا ہوں کہ وہ میری بیوی نہیں تھی اور وہ بچی بھی میری نہیں تھی وہ تو میرے پاس ایک امانت تھی۔“

اس کے ہونٹ خشک ہونے لگے تو اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے اسے پانی دینا تو معلوم ہوا کہ وہ اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ میں نے اسے چچ سے پانی پلایا۔ وہ پھر بولا۔ ”یہ تو شاید کسی

بھی معلوم نہیں کہ میں ریاست النور کا مہاجر ہوں۔ وہ عورت جسے لوگ میری بیوی سمجھتے رہے مجھے پاکستان کی طرف آتے ہوئے راستے میں ملی تھی۔ انہی اس کی بچی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ بہت ہی اذیت میں تھی اس کا خاوند بھائی باپ اور گھر کے سارے ہی افراد شہید ہو گئے تھے۔ وہ مجھے پاگل پن کی حالت میں ملی تھی۔ میں اسے اپنی پناہ میں لے کر یہاں آ گیا۔ یہ کلینک ایک ہندو ڈاکٹر کا تھا جو ہندوستان جا چکا تھا۔ میں نے اس کلینک پر قبضہ کر لیا اور میرا کام چل نکلا۔ تین ماہ بعد اس عورت نے ایک بچی کو جنم دیا۔ اس نے مجھ سے کئی بار یہ کہا کہ میں اس سے شادی کر لوں لیکن میں اسے امانت کے طور پر لایا تھا۔ میں نے ایک دو بار سوچا کہ اس سے شادی کر لوں لیکن مجھے یوں لگتا کہ جیسے میں اس سے نیکی کی قیمت وصول کرنا چاہتا ہوں۔ آخر میں نے اسے صاف کہہ دیا کہ تم میری بہن اور بیٹی ہو۔ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے بیاہ دوں گا اور باپ بن کر تمہیں رخصت کروں گا اور میں ایسا کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک رات جب میں کلینک بند کر کے آیا تو میری میز پر ایک رقعہ پڑا تھا۔ یہ اس کا میرے نام آخری پیغام تھا۔ اس نے اتنا ہی لکھا تھا کہ میں آپ کی نیکیوں کو کبھی نہیں بھولوں گی۔ مجھے بخش دینا۔ میں نے اپنی منزل تلاش کر لی ہے۔ بچی کے مستقبل کی خاطر مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔“ اور وہ ہمیشہ کے لیے چلی گئی مگر مجھے اس کے اس طرح سے جانے کا بہت ہی دکھ ہوا تھا۔

”آپ اس کے ساتھ شادی کر لیتے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کا فیصلہ مجھے پسند نہیں آیا۔“
 ”میں تو پہلے ہی شادی کر چکا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”میری دو بچیاں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ بہن اور ماں بھی تھیں۔ وہ..... وہ.....“

میں نے اس کے ساتھ شادی کر لیتے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کا فیصلہ مجھے پسند نہیں آیا۔“

ڈاکٹر کو ایک بچی سی آئی اور وہ پھر کتنی ہی دیر سکیاں لے لے کر روتا رہا۔ میں سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ میں نے اس کے آنسو پونچھے تھے اور اس کے منہ میں پیچ سے پانی ڈالنے لگی تھی۔ جب اسے کچھ سکون ہوا تو اس نے بات پوری کرتے ہوئے کہا تھا۔

”وہ جل کر راکھ ہو گئی تھیں بلوایوں کے حملے کے بعد میں جب گھر آیا تھا تو میرے حملے کے کئی مکانوں سے شعلے نکل رہے تھے اور مسلمانوں کے بچے جل رہے تھے اور.....!“

میں نے اسے پوری بات سنانے سے روک دیا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کیفیت میں اس قدر بھیا تک اور یاد کو ذہن میں تازہ کرے۔ میں نے موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے میری یہ کوشش کامیاب نہ ہونے دی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

”میں نے اس عورت اور اس کی بچی کو پناہ میں لیا تو میرے زخم مندمل ہونے لگے تھے مگر وہ میرے زخموں پر نمک چھڑک کر چلی گئی تھی۔ میں انسان ہوں پتھر تو نہیں ہوں میں نے اپنے آپ کو دھوکے دینے شروع کر دیئے تھے۔ مجھے اپنی بیوی دو معصوم بچیاں بہن اور ماں یاد آتی تھیں تو کسی کو معلوم نہیں کہ میں اپنے آپ کو کس طرح سنبھالتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو مارنے کے انجکشن لگانے شروع کر دیئے تھے پھر میں نے مرلیضوں کے ساتھ ہنسی مذاق شروع کر دیا۔ اس سے مجھے کچھ سکون ملنے لگا پھر میں نے بار بار چھوڑ کر شراب پینی شروع کر دی اور نجانے کب نیکی اور ہدی کے درمیان بھٹک گیا۔ میں نے گناہ بھی کیے اور ڈھیروں نیکیاں بھی کیں۔ میں جانتا ہوں کہ لوگوں نے مجھے بدنام کر رکھا تھا اس کی وجہ یہی تھی کہ میں عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے ساتھ بہت محل

مل جایا کرتا تھا۔“ اس نے ایک آہ بھری اور اکھڑی ہوئی سانسوں کو سنبھال کر بولا۔ ”میں گناہ گار ہوں“ میں نے اس عورت کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا تھا جس کا خاندان میرے زیر علاج تھا۔ مجھے اپنے گناہ کا اعتراف ہے۔ میں نے اس کے خاندان کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ عورت نہیں چاہتی تھی کہ اس کا خاندان بچ جائے۔ میں نے اس کے خاندان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بیوی اسے باقاعدگی سے دوا نہیں پلا رہی۔ میں نے اسے انکشن دینے شروع کر دیے۔ میرے ڈیپنسر سے پوچھ لیا کہ وہ ہر روز اس کے گھر جا کر اسے انکشن لگاتا تھا مگر وہ عورت میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس کے خاندان کے مرنے کے بعد میں اس سے شادی کر لوں گا۔ میں نے پوری کوشش کر ڈالی کہ اس کا خاندان صحت یاب ہو جائے مگر وہ زندہ نہ رہا اور مر گیا..... میں بھی بے گناہ نہیں میری شخصی کمزوریوں نے مجھے اندھا کر دیا اور میں اس عورت کو سیدھی راہ پر لاتے لاتے خود بھٹک گیا۔“

وہ یہاں تک بات کر پایا تھا کہ اس کا ایک دوست ڈاکٹر آ گیا تھا۔ وہ ہی اس کا علاج کر رہا تھا۔ اس نے ڈاکٹر سہراب کا معائنہ کیا تھا اور تسلی آمیز جملے کہہ کر چل پڑا تھا۔ چلتے چلتے اس نے مجھے اشارہ کیا تھا تو میں اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئی تھی۔

اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کون ہوں؟ میں نے اسے تفصیل سے بتا دیا تو اس نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ میرا دوست زیادہ سے زیادہ آج رات یا کل کی وقت ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گا۔ تم اس کے ساتھ ہی رہو۔ اسے اچانک ہی اس قدر درد اٹھے گا کہ یہ بے ہوش ہو جائے گا اس وقت اس کی نجات کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ تم وضو کر کے اس کے سر ہانے بیٹھ کر قرآن

پاک پڑھنا۔ یہ جلدی جان دے دے گا۔“ میں ڈاکٹر کو اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ ”اچھا میں ہی کروں گی۔“ غم کی شدت سے حلق میں لکڑی لکڑی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر چلا گیا تو میں اپنے ڈاکٹر کے سر ہانے جا بیٹھی۔

ڈاکٹر سہراب نے پوچھا کہ ”ڈاکٹر کیا کہہ ہے؟“

میں نے کہا کہ ”وہ تسلی دے گیا ہے۔“ وہ بولا۔ میں بھی ڈاکٹر ہوں میں بھی مر والوں کو جھوٹی تسلیاں دیا کرتا تھا مجھے اب کی بار بھی مر جانا ہے..... اس لیے میں نے تمہیں بلایا کہ میری آخری باتیں سن لو۔“ پھر اس نے ایک بھری۔ اس کے ساتھ ہی اس کے دانت کھٹکے اس کا درد بڑھ رہا تھا اس کے چہرے پر پینے قطرے پھوٹ آئے۔ میں نے دوپٹے سے اسے پینے پوچھ ڈالا۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ لے لیا اور بولا۔

”جب تم پہلے روز میرے کلینک میں آئی تھی تو میں نے تمہیں دیکھ کر نہ جانے کیوں درد سکون محسوس کیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے تمہاری طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ تم صرف ہنسا رہی تھیں مگر میں تمہیں رلاتا چاہتا تھا۔ یہ میری فریب کاری تھی۔ میری نیت بری نہیں تھی پھر بھی تم اسے فریب کاری ہی کہوں گا۔ میں نے تمہارے دل میں غموں کو ہوا دی اور جب تم بچوں کی طرح رونے لگیں تو میں نے تمہیں بہلانا شروع کر دیا۔ میرا طریقہ کامیاب رہا اور میں نے تمہیں لیا مگر اس عورت نے تمہیں میرے گناہوں و واردات سنا کر تمہیں مجھ سے چھین لیا۔ تم نے گناہ گار کہا تو میں نے گناہوں سے توبہ کر لی۔ چوری چھپے شراب پیا کرتا تھا یہ بھی ایک فریب کاری

میں اپنے آپ سے کرتا تھا۔ میرا بہت سا وقت سرینوں کے ساتھ گزار جاتا تھا کچھ وقت تمہارے ساتھ بیٹھنے کیلئے گزارتا تھا اور رات کو جب میں تنہا رہتا تھا تو میری دو بچیاں بیوی ماں اور بہن میرے کمرے میں آ جاتی تھیں۔ میں انہیں دیکھتا تھا مگر انہیں چھو نہیں سکتا تھا اور رونے لگ جاتا تھا۔ اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے میں شراب میں ڈوبنے لگا۔ اس کا نتیجہ آج سامنے ہے کہ مجھے پچیس برسوں کا سرطان ہو گیا ہے جس روز سرطان ظاہر ہوا اس سے ایک ہی روز پہلے میں نے شراب پینے سے توبہ کر لی تھی۔ اس توبہ کا باعث تم بنی ہو۔“

”مجھے تو علم تھا“ اس نے ہچکے لے کر کہا۔ ”تمہارے روپ میں مجھے اپنی دو بچیاں مل گئی تھیں۔ میں نے تمہارے پیار میں ماں اور بہن کے پیار کی لذت بھی محسوس کی اور..... اور میں اس گناہ کا بھی اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ میں تمہیں اپنی دوست اور محبوب بھی سمجھتا رہا۔ تم شاید نہ سمجھ سکو یہ ایک ذہنی کیفیت ہوتی ہے جسے نفسیات کے ڈاکٹر ہی سمجھ سکتے ہیں۔“

”میں سمجھ سکتی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے آپ کے روپ میں اپنے مرحوم باپ اور دو شہید بھائیوں کو پایا تھا اور میں آپ کو اپنا دوست بھی سمجھتی رہی۔ آپ نے کوئی گناہ نہیں کیا۔“

”نہیں..... نہیں.....“ اس نے جھنجھلائی ہوئی آواز میں کہا۔

”میں نے گناہ کیا تھا“ میں نے کئی بار سوچا کہ تمہیں کہوں کہ میرے ساتھ شادی کر لو لیکن جب بھی میرے دل میں یہ خیال آیا تمہاری شکل و صورت بدل گئی تمہاری صورت میں مجھے اپنی جلی ہوئی بچیاں ماں بہن اور بیوی نظر آنے لگیں۔ میری یہ

سوچ میرا گناہ تھا۔“ وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ اچانک اس نے میرے ہاتھ کو اس قدر مضبوطی سے پکڑ لیا کہ میری انگلیاں ٹوٹنے لگیں۔ اس کے دانت پسے لگے اور اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا۔ اس کے منہ سے کرب زدہ چیخ نکلی درد کی بے رحم شدت نے اسے تڑپا دیا پھر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا کر بھاگی اور ملازمہ سے کہا کہ مجھے قرآن پاک دو۔ وہ قرآن مجید اٹھا لائی۔ میں نے اسے کھولا تو اس میں ایک کاغذ رکھا تھا۔ اس پر لکھا تھا۔

”ڈاکٹر صاحب! میں آپ کی نیکیوں کو کبھی فراموش نہ کر سکوں گی اپنی بچی کے مستقبل کے لیے میں نے اپنی راہ تلاش کر لی ہے آپ نے میری بات نہ مانی آپ کی مرضی اگر میں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں جا رہی ہوں۔“

آپ کی عارف! اُس کے نیچے ڈاکٹر کے ہاتھ کا لکھا ہوا فقرہ تھا۔ ”تمہیں میں اس مقدس کتاب کی طرح پاک سمجھتا تھا۔ خدا تمہاری حفاظت کرے۔ (آمین!)“

ڈاکٹر سہراب! میں قرآن کھول کے ڈاکٹر کے سر ہانے بیٹھ گئی اور سورۃ یٰسین پڑھنے لگی۔ ڈاکٹر درد کی شدت سے تڑپ رہا تھا۔ میں تلاوت بلند آواز سے کر رہی تھی لیکن میری آواز بار بار رقت میں دب جاتی تھی اور میرے آنسو نکل آتے تھے۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پا کر اور بلند آواز سے تلاوت شروع کر دی۔ میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کے چہرے پر سکون سا آ رہا تھا لیکن اب وہ آنکھیں نہیں کھول سکتا تھا۔ جب میں آخری آیت پر پہنچی تو ڈاکٹر تڑپ اٹھا اور چلا کر بولا۔

شہید کی کہانی (ہمارے وطن کا دفاع کرنے والے شہیدوں کے حوالے سے ایک دلگداز سوچ)

منزہ سہام

شہید کی ڈائری

علامہ اقبال کی پرواز خیال
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت ، نہ کشور کشائی

قوم کو حیات بخشے والے شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ



لیے دنیا سے چلی گئیں۔ میں نے پھر بھائیوں کی شادیاں کر دیں۔ بھابھیاں بہت اچھی تھیں۔ دو بچی کہتی تھیں۔ ”آپ بوڑھی نہیں ہوئیں۔ اب بھی وقت ہے شادی کر لیں۔“ لیکن میں انہیں بتا نہیں سکتی تھی کہ ایک ایسا آدمی میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا جس نے میرے روپ میں دو بیچوں کی بیوی کر لی اور بہن کو پالیا تھا۔ میں اسی کی ہوں اسی کی رہوں گی اس کی بیٹی بن کر بہن بن کر یا مجھو یہ بن کر بس پھر یوں ہی زندگی گزرنے لگی۔ میں نے اپنا آپ دوسروں کے لیے وقف کر دیا اور اس مکان میں رہنے لگی۔ یہ وہی گھر ہے یعنی ڈاکٹر سہراب والا گھر۔ اس کا کلینک ”بئی“ کے علاقہ میں تھا۔ وہاں بعد میں نرسنگ ہوم بن گیا تھا مگر اب کسی جگہ کام کرنے کو ہی نہیں چاہتا تھا۔ دونوں بھائی ملازمت کے سلسلے میں بیویوں کو ساتھ لے کر کراچی گئے تھے۔ کچھ عرصہ تو اُن سے رابطہ رہا اور پھر ہمیشہ کے لیے رابطہ ختم ہو گیا۔ میں نے کسی سے سنا تھا کہ کراچی میں جب حالات زیادہ خراب ہوئے تھے تو وہ ان فسادات کی زد میں آگئے تھے۔ پاکستان نے میرے خاندان سے ایک بار پھر قربانی لی تھی۔“

.....
مسی فضلاں نے اپنی کہانی ختم کی تو میں دگی دکھی سا گھر لوٹ آیا۔ تمام رات نیند نہ آئی اور ماسی فضلاں کا چہرہ نگاہوں میں گھومتا رہا۔ اگلے صبح ماسی فضلاں کی زندگی کا اختتام ہو گیا۔ محلہ کا ہر محلہ اشک بار تھا ہزاروں اشک بار آنکھوں کے ساتھ ”شاہ دی ناہلیاں“ والے قبرستان میں اُن کو پورا خاک کر دیا گیا۔ میں اب جب کبھی بھی اس قبرستان کے پاس سے گزرتا ہوں تو قبر پر جا کر فاتحہ ضرور پڑھتا ہوں۔

☆☆☆

”نہیں..... خدا مجھے معاف نہیں کرے گا۔ نہیں..... نہیں..... کبھی نہیں.....“
میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”آپ اطمینان سے سنتے جائیے۔ یہ پروردگار کا وعدہ ہے کہ وہ گناہ بخش بھی دیتا ہے۔ وہ معاف کرنے والا ہے مہربان ہے رحیم ہے۔“ میں نے پھر سے سورۃ یٰسین پڑھنی شروع کر دی۔
”نہیں..... نہیں.....“ وہ رورور کر کہنے لگا۔ ”خدا میرے گناہ نہیں بخشے گا۔ میرے گناہ تھوڑے نہیں، میرا ضمیر اس بوجھ کو اٹھانہیں سکتا۔ میری بیچیاں خدا کے نام پر قربان ہو گئیں مگر میں روتا رہا۔ یہ بھی گناہ تھا۔ میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی گناہ تھا۔“

میں نے آواز اور بلند کر دی۔ میں چاہتی تھی کہ اس کی نحیف آواز میری آواز میں دب جائے اور میں اس کا ایک لفظ بھی نہ سن سکوں۔ میں خدا کا کلام اس کی روح تک اتارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میرا ایک ہاتھ ڈاکٹر کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے میرے ہاتھ کو اٹھا کر منہ کی طرف لے جانے کی کوشش کی یہ اس کی زندگی کی آخری کوشش تھی جو کامیاب نہ ہو سکی اور میرا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے وہیں سے ہاتھ سرکا کر اس کے دل پر رکھا، اس کی دھڑکن رک چکی تھی۔ ڈاکٹر اپنی بیچوں بیوی ماں اور بہن کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میں نے دیکھا، اُس کے چہرے پر سکون اور اطمینان تھا۔ درد کا تاثر دھل گیا تھا شاید خدا نے اسے بخش دیا تھا۔

.....
میری زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا۔ امی نے بہت کوشش کی کہ وہ میری کہیں شادی کر دیں مگر میں نے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ امی یہی حسرت

ڈاک کیا یا ڈاک بابو کا سفر بہت پرانا ہے۔ زمانہ قدیم میں صاحب استطاعت لوگ اپنے پیغامات دوسرے شہروں یا علاقوں میں پہنچانے کے لیے تنخواہ دار قاصد رکھتے تھے جو ان کے عزیزوں میں خوشی اور غمی کے پیغامات سے لے کر حال احوال دریافت کرنے پر مقرر ہوتے تھے جو کہ زبانی اور تحریری دونوں صورتوں میں ہوتا تھا۔

قاصد اپنی پیغام رساں اور مختلف ناموں سے ہمکنار ہوتا یہ کردار موجودہ دور میں ڈاک یا پوسٹ مین کے نام کے ساتھ ہم تک پہنچا۔ ایک زمانہ تھا کہ ڈاک بابو خط پہنچانے کے ساتھ ساتھ خاندانہ گھرانوں میں خط پڑھ کر کبھی سناتا تھا اور جواب بھی لکھتا تھا۔ اس کی حیثیت خاندان کے فرد جیسی بھی جاتی تھی۔

دور دہیں بسنے والوں کا اپنے پیاروں سے خط کے ذریعے رابطہ آدھی ملاقات اپنے اندر لے پناہ خوشی و رومانس سمونے ہوتا ہے اور اسی رومانس میں ڈاک یا پوسٹ کی حیثیت رکھتا ہے۔

بیرون ملک مقیم حضرات وطن واپسی پر جہاں اپنے عزیزوں کے لیے تحائف لاتے تھے وہیں ڈاک بابو کا تحفہ بھی ان کے سنگ ہوتا۔

پھر زمانہ بدلا ریت بدلی، ٹیلی فون کی آمد کے ساتھ ہی خط و کتابت کے رابطے میں کمی واقع ہوئی۔ لوگ خطوط بھیجنے سے زیادہ ٹیلی فونک رابطوں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ جن گھرانوں میں یہ سہولت میسر نہیں ہوتی، وہ کسی پڑوسی کے گھر سے یہ فیصلہ اٹھا لیا کرتے تھے، پروہ طبقہ جو ٹیلی فون کی نعمت سے محروم تھا وہ اب بھی خطوں پر ہی اکتفا کرتا تھا۔ ان کے گھرانے میں پوسٹ مین کی اہمیت بدستور قائم تھی۔

اس کی آمد پر گھر میں پچل مچ جاتی اور خط وصول کرتے وقت ڈاک بابو کا شکر یہ ادا کیا جاتا اور چند

لمحوں میں بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی اس کے پردھری جاتی۔ اس کا حال احوال دریافت کرنے کے سلسلہ شروع ہو جاتا کیونکہ یہی وہ کردار تھا جو ان پیاروں کے پیغامات پہنچانے کا ذریعہ تھا پھر علاقے ٹاؤن و سڑک کے نام سے منسوب ہونے ترقی کی طرف گامزن ہونے لگے، وہیں ڈاک بابو اہمیت بھی تنزیل کا شکار ہونے لگی۔ معاشرتی ترقی کے ڈاک بابو بہت پیچھے رہ گیا۔ ماضی کے اس اہم کردار کو پست ڈالنے میں سماج کا بڑا عمل دخل ہے لیکن یہ شکوہ بھی بے کار ہے، جس سماج نے اپنے بزرگوں کو ماضی کا گھنڈر سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہو وہ بڑا ڈاک بابو کس کھاتے میں ڈالیں۔

اگر ہم ڈاک بابو سے گزشتہ دور کی بات کریں تو وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر محکمہ ڈاک کی عظمت گزشتہ کے قصے دہراتے ہوئے اس دور کو حسرت سے یاد کرتا ہے جب موسمیات کے علاوہ کونین کی فروخت اور محکمہ تار و ٹیلی فون بھی انہی کے پاس ہوا کرتا تھا۔

”کیا بھلا دور تھا کہ ہر ایک تار پر جو دفتری اوقات کے بعد آیا کرتی، ایک روپیہ فیس دیا کرتی۔ تنخواہ سے زیادہ تو ایٹ فیس ہوا کرتی تھی کے باعث پوسٹ ماسٹر دو تین شادیاں زچا لیا کرتے۔“ اس ریٹائرڈ ڈاک بابو نے ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔ ”پوسٹ مینوں کی اکثریت اسے بیٹوں کی پیکر کینڈی ڈب پورڈ اور پوسٹ مین لگوانے کے چکر میں ہوتی مگر ٹیلی فون مین کی آمد اور ٹیلی فونک ذریعے نے ان کے

ستہری سپنوں پر اس ڈال دی۔ دن بھر پوسٹ مین جھلسی ہوئی آگ اگتی سڑکوں پر بانی سائیکل ڈاک تقسیم کرتے پھرتے، پر لوگوں کی طرف سے موصول ہوتی عزت ٹھنڈی پھوار کی طرح ان کی

ذہنیوں میں شامل تھی، پر مشینوں کے ساتھ رہ کر ہم بھی مشین بن چکے ہیں ہمارے انسانی جذبات کب کے ختم ہو چکے ہیں۔ آج خطوط لکھنے کی روایت عالم نزع میں ہے۔ ٹیکس ای میل اور شارٹ میسجنگ سروس نے ہمارے تمام کاغذ کا رشت توڑ کر رکھ دیا ہے۔ ایسے میں ڈاک بابو کا کام نصف سے بھی کم ہو گیا ہے۔ حالات کی چکی میں پستے ڈاک بابو اپنی اور اہل خانہ کی بقا کے لیے تک و دو میں لگے ہیں۔

اس سکتی زندگی میں جلتے ہوئے ناموں میں سے ایک نام رشید الدین پوسٹ مین کا بھی ہے جو بلدیہ ٹاؤن کارہائی ہے اور نیا چورنگی پر واقع ڈاک آفس میں حاضری لگانے اور آفس کا کام مکمل کرنے کے بعد ڈاک لے کر روانہ ہوتا ہے۔ بلدیہ سے نیا چورنگی تک 18 کلومیٹر سفر طے کرنے کے لیے نیا چورنگی گھر سے نکلتا ہے۔ 19 سالہ سروس کے عوض اس پر حکومت کی مہربانی کے دروازے بند ہیں۔

رشید الدین سے میری ملاقات ادارے سے موصول ہونے والے ٹیلی آرڈر کے توسط سے ہوئی۔ پرانے کھسے ہوئے لباس میں لیٹا رشید کا وجود چہرے پر شکرت کی پرچھائیاں واضح نظر آ رہی تھیں۔ مٹی آرڈر دیتے ہوئے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے جب میں لگے بال بچوں کو بڑھاتے ہوئے دستخط لے رہا تھا وہ اپنی ہی راہ لیتے پستین پونچتے ہوئے ایک لمحے کو ٹھٹک گیا۔

”کیا پیالی مل سکتا ہے؟ گرمی بہت زیادہ ہے۔ ابھی بہت دور ڈاک لے جانا ہے۔ ڈیور ٹرنڈرز جن بڑے صاحب کے نام آتا ہے وہ خاصے خشک مزاج ہیں اس لیے ان سے پانی مانگنے کی ہمت نہیں چڑتی۔“

”آں..... ہاں! سوری! اخلاقی طور پر تو مجھے خود آپ سے پانی کا پوچھنا چاہیے تھا۔ ابھی لائی۔“

پانی کا گلاس اور بوتل اسے تھامتے ذہن میں ماضی قریب کا منظر گھوم گیا جب بیرون ملک مقیم والد صاحب کی ڈاک کے انتظار میں پوسٹ مین کی آمد کا شدت سے انتظار ہوتا۔ پوسٹ مین کی مخصوص آواز سے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ بھائیوں اور میرے درمیان دروازہ کھولنے کے لیے ریس لگ جاتی اور جو کامیاب ہو جاتا، وہ ہاتھ میں خط تھا، فاتح کی طرح گھر کے اندر داخل ہوتا جبکہ امی کی دھاڑ فاتح کی خوشی زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہتی۔

”ارے یہ کیا طوفان بد تمیزی چا کرھی ہے بے چارے پوسٹ مین کو پانی کا تو پوچھو جانے کئی دور سے پانی سائیکل پر سوار مارا مارا پھر رہا ہے۔ بتا تو دیا کرو، کم از کم چائے، سگریٹ کی خرچی ہی دے دیتی۔“ اور ہم نادم ہو کر دوبارہ دروازے کا پٹ کھول کر دیکھتے، پر پرانی پانی سائیکل کے سپڈل پر پیڑ مارتے پوسٹ مین صاحب دو گھر آگے نکل گئے ہوتے اور ہم شرمسار ہو کر امی سے نظریں چراتے جیسے بہت بڑا جرم سرزد ہو گیا ہو پھر امی بڑی نرمی سے پوسٹ مین کی محنت اور عظمت گنوا تیں کہ یہ پوسٹ مین ہی ہم تک ڈاک پہنچانے کا ذریعہ ہیں اور معمولی تنخواہ کے عوض موسم کی سختی سے بے نیاز اپنا کام جاری رکھتے ہیں، کڑی محنت ان کے حصے میں آتی ہے۔

مگر یہ سب باتیں وقت اور ہماری بے بسی کی نذر ہو چکی ہیں۔

”شکر یہ بڑی مہربانی۔“ خالی گلاس اور بوتل واپس کرتے پوسٹ مین کی آواز نے مجھے فوراً ہی حال کی دلہیز پر لا دھکیلا پھر اچانک ایک خیال ذہن

میں کوئٹہ اس کردار کی زندگی کو کھوجنا چاہیے جس کا تعلق بھی سڑک سے ہے۔

نام، تنخواہ اور رہائش کی معلومات حاصل کرنے کے بعد فوراً زبانی جمع خرچ کا رستہ اپنایا جو کہ ہم سمیت ہماری پوری قوم کا وہیہ ہے۔ خیر، مجھے تو اس زبانی کلامی جمع خرچ کا استعمال اس لیے بھی کرنا تھا کہ اس سے حاصل کردہ معلومات شاید ہمارے اور آپ کے رویوں میں مثبت تبدیلی لانے کا باعث ہو۔

”کیا گزارہ ہو جاتا ہے؟ میرا مطلب چار بچوں سمیت اس مہنگائی کے دور میں اتنی معمولی تنخواہ پر؟“

ادا سی سمونے ہلکی سی مسکراہٹ لیے رشید الدین کی کمزوری آواز ابھری۔ ”آپ نے کیا سمجھا؟ کیا تنخواہ ہی ہماری گزربسر کے لیے کافی ہوگی؟ ڈاک تقسیم کرنے کا کام تقریباً چار بجے ختم کر کے واپسی کی راہ لیتا ہوں۔ آدھے گھنٹے تک گھر پہنچ جاتا ہوں۔ یہ بھی شکر ہے کہ موٹر بائیک ہے ورنہ آدھے گھنٹے کی مسافت ڈیڑھ دو گھنٹے میں طے ہوتی۔ بس کے سفر وہ بھی ٹریفک جام سے نمٹتے گھر پہنچنے تک اعصاب جواب دے چکے ہوتے تھے۔“

”موٹر بائیک ذاتی ہے؟“

”محکمہ سے ملی ہے۔ تنخواہ سے اس کی قسطیں کتنی ہیں۔“

”مطلب اتنی کم تنخواہ میں بھی قسطیں کٹ جاتی ہیں تو.....“

”پھر بھی شکر ہے، کم از کم دو سالوں میں سب قسطیں ادا ہو جائیں گی ورنہ تو میں یہ سواری خریدنے کا تحمل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ جلد گھر پہنچنے کی بدولت دوسرا کام کرنے کا وقت مل جاتا ہے۔“

”دوسرا کام کون سا؟“

”گھر پر مشین کی کڑھائی کا کام۔ قریب مال اٹھاتا ہوں اور رات بارہ بجے تک کڑھائی کرتا ہوں۔ فیکٹری کے کام کے عوض تو روزانہ وہ گھر کے کرائے اور بجلی، گیس کے بلوں میں ہے۔“

”کرایہ کتنا ہوتا ہے؟“

”کرایہ پانچ ہزار روپے اور بل وغیرہ ہزار روپے۔“

”بچے پڑھتے ہیں؟“

”ایک بیٹے نے اسی سال میٹرک کیا۔ اس کی کالج میں پڑھنے کی بہت خواہش ہے۔“

حالات اجازت نہیں دے رہے۔ باقی بچے کے گورنمنٹ اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔

بڑی خواہش رہی کہ سب بچوں کو کالج پڑھاؤں پر ابھی بڑے بیٹے کے میٹرک کرنا ہوش ٹھکانے آ گئے۔ کالج پڑھانا ہمارے

بات نہیں مگر وہ پارٹ ٹائم کوئی چھوٹا موٹا کام کر کے کالج پڑھنا چاہتا ہے۔ باقی دیکھتے ہیں آگے

ہوتا ہے؟“ اس کے لفظوں میں حسرت اور ہار نے ماحول کو کافی بوجھل بنا دیا تھا چنانچہ میں

ماحول کی نمیبھرتا کو توڑتے ہوئے رشید الدین ماضی کے خوش کن احساس کی جانب موڑ دیا۔

ماضی محفوظ ہوتا ہے، اس میں ردوبدل کی گنجائش ہوتی اس لیے ہر شخص کو اپنے ماضی سے پیار ہوتا

خواہ وہ کیسے بھی حالات سے گزرا ہو۔ انسان کی تخیلوں کو ماضی کی یادوں سے مہرکا کر رکھنے کے

لیے سکون ضرور پالیتا ہے۔

”ماضی کے ڈاک نظام اور موجودہ نظام میں فرق آیا ہے؟“

رشید الدین کے چہرے پر چھائی اداسی بادل ایک دم چھٹنے لگے۔ ”ماضی کی کیا بات

بڑا ستر اور تھا۔ جن دنوں میں نئی نئی سرورس میں آیا تھا، مہنگائی کا یہ عالم نہیں تھا۔ گزربسر بڑی اچھی ہوتی تھی۔ والدین حیات تھے۔ نوکری لگتے ہی میری سادہ کردی گئی۔ دو ماہیں بھی نہیں پھر بھی خرچہ بڑے نام تھا بلکہ کچھ بچت بھی ہو جاتی تھی۔ خط لے کر جس گھر جانا بڑی عزت سے لوگ پیش آتے۔

خطوں کی آمدورفت کم ہوتے ہی اخلاقیات میں بھی کمی واضح ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ ملک کے

بگڑتے حالات بھی ہیں جہاں ہر آدمی پر شک کی مہر ثبت کر دی جاتی ہے۔ اچھی دور دراز مل ایک جگہ ڈاک

دینے کیلئے کئی لیٹر لے کر کئی بار تیل بجانے کے بعد دروازے پر لگے اسٹرکام سے پوچھا گیا۔ ڈاک کا

بتانے پر دروازہ کھلا لیٹر لے کر تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ اچھی لیٹر دے کر پلٹا ہی تھا کہ دو بندے

قریب آئے اور لگے جرح کرنے۔

”کون ہو میاں یہاں کیا کر رہے ہو؟“

اپنا حوالہ دیا۔ ان کی تسلی پھر بھی نہ ہوئی اور قریب آ کر میرے بیک کی تلاشی لینا شروع کر دی

یہ دیکھنے کے لیے کہ آیا میں سچ کہہ رہا ہوں یا جھوٹ؟ میرے استفسار پر کہنے لگے۔

”بھئی، کوئی خبر ورس نہیں، کیا پتا پوسٹ مین کی آڑ میں دہشت گردی بھی کر رہے ہو گے۔ یہ دیکھ

رہے ہیں کہ کوئی اسلحہ وغیرہ تو بیگ میں نہیں چھپا رکھا؟“

فصیح تو بہت آیا، جو دہشت گرد ہیں وہ کھلے عام دہشتاں پھرتے پھرتے ہیں اور یہاں میرا تعلق

وقت بڑھا کر رہے ہیں، بس زبان سے اتنا ہی کہہ سکتا

”کیوں بھائی میں کیا چہرے مہرے سے دہشت گرد لگتا ہوں؟“

”کیا مطلب؟ وہ کوئی آسانی مخلوق ہوتے

یاد نہ آیا کرو!

☆

تم مجھے یاد نہ آیا کرو

جو یاد چھینے نہ دے

وہ بات جو سونے نہ دے

وہ خیال جو روح پر گراں گزراں

وہ احساس جو آنکھ نم کر دے

وہ خوشبو جو دل بیزار کر دے

وہ سب تعلق جو تم سے مجھے ہیں

عذاب جاں بن جائیں

وہ سب لمحے جو تم سے مجھے ہیں

میں ان سب سے دور جانا چاہتی ہوں

میں سب کو بھول جانا چاہتی ہوں

میں تم کو بھول جانا چاہتی ہوں

☆

فرحت جمال

پانچ سو روپے کی مالیت کا تھا، چھین لیا
میں تنخواہ بھی لے لی۔ یہی نہیں، انہوں نے
صاحب کے پاؤں پر فائر بھی کیے، گولی مار
ہوئی نکل گئی۔ بروقت بہتر علاج نہ ہونے کی
کا ایک پیرنا کارہ ہو گیا۔ بڑے آپریشن
بہت رقم درکار ہوتی ہے جو کہ ہمارے پاس
بھی شکر ہے اللہ کا۔ محمدہ ڈاک والوں نے
معذوری اور پرانی سروں کو دیکھتے ہوئے ان
پر مجھے رکھ لیا اور ناس وقت جانے اور کتنی
سامنا ہوتا۔“

”پر تم تو آگے پڑھنا چاہتے تھے اور
ٹیوشن وغیرہ بھی پڑھانا شروع کر دیا تھا
رکھنے کے لیے؟“

”بس سمجھ لیں، کالج پڑھنا میرے مقصد
نہیں تھا۔ اب گھر پر مشینوں پر کڑھائی کا کام
ہیں۔ میں نے ڈاک کی نوکری کر لی ہے۔ ہزار
گاڑی چل رہی ہے، ایسے میں کالج پڑھنے کا
دیکھنا اب چھوڑ دیا ہے۔ بس جو اللہ کو منظور
حال میں شکر گزار رہنا چاہیے۔“

رشید الدین کا بیٹا مٹی آرڈر دے کر اور
احوال بتا کر چلتا بنا۔ اس نے اپنے خوابوں
چادر سے ڈھانپ دیا تھا۔

رشید الدین ہو یا اس کا بیٹا یا ان
جو غربی کی چکی میں پسینے کے بارے میں
ہیں، پڑھنا فوس کہ ہم لوگ ان کے صبر کو
میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ سڑک کا یہ
خطوط کے ذریعے لوگوں کو ان کے پیادوں
دیتا ہے، حالات کے جبر نے اس کی زندگی
پر پہنچا دی ہے کہ اس کی خبر گیری کرنے
نہیں۔

☆☆☆

پہنچانے ہیں۔“

”پارسل.....؟“

”ہاں، کبھی بکھار اندرون سندھ یا دوسرے
شہروں سے یہ آ جاتے ہیں۔ مٹی آرڈر بھی کم ہو گئے
ہیں۔ زیادہ تر مٹی لینے، ڈپورنڈ فنڈ وغیرہ ہوتے
ہیں۔“ اجازت لے کر رشید الدین نے واپسی کی
راہ لی اور میں نظروں سے اوجھل ہوتی موٹر بائیک
اور اس کے پیچھے اڑتی دھول میں اسے جاتا دیکھتی
رہی۔

.....

”پوسٹ مین۔“

”السلام علیکم! میڈم! یہ مٹی آرڈر آیا ہے۔ یہ
رہی رسید اس پر دستخط کر دیں۔“ دروازہ کھلتے ساتھ
ہی رو بوٹ کی طرح بولتے لڑکے نے قلم اور رسید تھا
دی۔

”تم سے پہلے جو پوسٹ مین، میرا مطلب رشید
الدین.....“

”وہ میرے والد صاحب ہیں۔ کچھ مہینے پہلے وہ
ڈاک تقسیم کر کے گھر جا رہے تھے، تھے میں کچھ ڈاکو
شری پسند یا غنڈے جو بھی نام دے لیں، انہوں نے
والد صاحب سے زبردستی ان کا سیل فون جو صرف

سلاخان

ایک نامور لکھاری کا تہلکہ خیز سلسلہ جسے پڑھنے والے مدتوں یاد رکھیں گے

سلیم فاروقی

آتش جنوں

فیض احمد فیض کا زریں خیال

سو پیکان تھے پیوست گلو جب چھٹری پیاد کی لے ہم نے
سو تیرتر ازو تھے دل میں جب ہم نے قلم آ غار کیا

.....



عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و اہمیت کے لئے جانے والے۔ ارسلان کچھ لاپالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر کھڑے ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لائیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان راشد کی لالچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ کاراشد کی لالچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی راشد کی لالچی میں اس کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون کی اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آل کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں گروہ کے کچھ افراد مسلح اور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا نقل ایک ایرانی علی اکبر شہدی ہے سے جو ایک بین الاقوامی لیگ کا سربراہ کی آمد ہوتی ہے اور وہ اور ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان سرداری ہو جانے کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرنے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن ہو جاتا ہے اور پھر شہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس جا کر شہدیت شدہ کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھرانے آ جاتا ہے اور اسے نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو شہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے۔ گھر پہنچتا ہے تو اس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران پولیس عمران کے ہوا اور اس کے گھر سے وہاں برآمد کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورت حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا اس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے سہماں ہو گئے ہیں۔ ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتے ساخاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد ان کی پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں پتہ لگتا ہے عدالت میں ان کا کیس لڑنے والا برٹری بھی پولیس کے ساتھ لیا گیا ہے۔ ارسلان کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں ان کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے۔ عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار شہدی سے اپنی بہن شائستہ کی بازیابی کرتے ہیں۔

راستے میں تیمور اور عمران شیرخان پر قابو پالیتے ہیں یہاں تک کہ وہ باہر خان کے پاس پہنچتے ہیں اور وہاں تیمور اچھا بیکار خان کی کپٹی پر رکھ دیتا ہے۔ باہر خان سکتے کی کیفیت میں تیمور کو دیکھنے لگتا ہے۔ فائلوں کے حصول کے بعد عمران اور تیمور گھر آتے ہیں تو ان کے گھر پر بم سے حملہ ہو چکا تھا۔ اس حملے میں ان کا بھائی ارسلان ہے اس کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ یہ سب کچھ شہدی نے کر لیا تھا۔ جوانی وار کے طور پر عمران اور تیمور شہدی کے ایک ترقی پسنی سماجی جان انوار کے اسے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ ان کی بہن کے بارے میں بتائے اور نہ اس کی بیٹیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ جان محمد کی بیٹیاں ندا اور عمران کو بھائی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں تو وہ بھی جذباتی ہو کر انہیں مبین کا درجہ دے کر ان کے گھر وعدہ کرتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کے بھائی عدنان کی آمد ہوتی ہے جسے وہ مردہ تصور کر چکا تھا۔ آج کل عمران تیمور اور ارسلان خان کو اغوا کرتے ہیں اور عمران اسے معذور کر دینے کی دھمکی دیتے ہوئے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسری طرف شہدی تھانے میں عمران کو بتاتی ہے اسے علم ہو گیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ شہدی کا دوبارہ فون آتا ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ وہ ایک گروہ ہے۔ وہ اسے انکار کر دیتی ہے۔ جان محمد کا فون آتا ہے اور وہ عمران کو بتاتا ہے کہ وہ اب شہدی کے ساتھ نہیں ہے۔ نادیا اور عمران ایک بار سے کے قریب آ جاتے ہیں۔ تیمور ہاشم خان کو گولی مار دیتا ہے۔ عدنان کی امریکہ واپسی کے انتظامات مکمل ہو جاتے ہیں مگر واپسی کے وقت اسے روک لیا جاتا ہے کہ اس کے پاس آتش کیمرہ ہے۔ یہ اطلاع غلط ہوتی ہے لیکن عدنان کی فلاحت مس ہو جاتی ہے۔ تیمور عمران کو قتل کرنے کے ارادے سے کراچی کی سڑکیں چلی۔ مگر آتے ہیں تو نادیا عمران کو اپنی کہانی سناتی ہے۔ دوسرے دن تیمور عمران کو لے کر لی مارکیٹ میں موجود تیمور ہاشم خان کو قتل کرتا ہے اور کاؤنٹر پر جا کر غلام رسول کے بارے میں معلوم کرتا ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

”غلام رسول چھپلی والا!“ تیمور نے کہا۔
”اچھا تم شیو چائے والے پو۔ ہم اس کو بلواتا ہے۔“
ابھی ہم چائے پی رہے تھے کہ چھپریرے بدن کا ایک بلوچ لڑکا ہمارے پاس آ گیا اور بولا۔ ”تیمور صاحب! ”
”ہاں میں تیمور ہوں۔“ تیمور نے کہا۔

”آپ لوگ کو وا غلام رسول نے بلایا ہے۔ آؤ ہمارے ساتھ۔“ میں نے چائے کے پیسے دینے کے لیے کاؤنٹر کی طرف جانا چاہا تو لڑکا بولا۔ ”چائے کا پیسہ لیا جاوے گا۔ آپ لوگ نکل نہیں کرو۔“
وہ ہمیں لی مارکیٹ کی مختلف جگہوں سے گھماتا پھرتا ایک پرانے سے مکان کے سامنے ٹھہر گیا اور دروازے پر دستک دی۔
اندر سے بھی ایک بلوچ نے جھانکا پھر لڑکے کو دیکھ کر اس نے ہمیں اندر آنے کا اشارہ کیا۔
وہ ہمیں لے کر ایک کمرے کی طرف بڑھا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے ہم نے اپنے جوتے اتار لیے کیونکہ اندر فرش چاندنی چھٹی تھی۔

میں اندر داخل ہوا تو غلام رسول کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ پہلے سے بہت بدل گیا تھا۔ اب اس کے جسم پر شلوار قمیص کی بجائے جینز اور شرٹ تھی۔ وہ اٹھ کر بہت والہانہ انداز میں مجھ سے گلے ملا پھر بولا۔ ”واجا! آپ تو بالکل عاقب ہی ہو گیا ہوئے بھی آپ لوگ کا ہم جیسے چھوٹے لوگوں سے تو دوستی تھا نہیں آپ تو ناصر صاحب کا دوست تھا۔ ہم تو اس کا ملازم تھا۔“

یہ بات سنیں سے غلام رسول ”میں نے کہا۔“ میں اس کے بعد اپنی ہی پریشانوں میں اتنا الجھا رہا کہ مجھے کس سے کسی نئے کا وقت نہیں ملا۔ تم سناؤ آج کل کیا کر رہے ہو؟“
”ناصر صاحب کے والد نے فینک کا کاروبار ختم کر دیا ہے۔ وہ بولتے ہیں یہ تو کاروبار سے زیادہ میرے لیے کماؤں تھا۔ اب وہ ہی نہیں رہا تو مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنا موٹر ایلچ رہے تھے۔ میں نے خوشامد کر کے ان کا موٹر ایلچ تم قیمت پر اور سٹوں میں ان سے خرید لیا۔“
”اچھا تو اب تم غلام رسول بیٹھ ہو گئے ہو؟“ میں نے ہنس کر کہا۔
”بیٹھ گیا صاحب!“ وہ ہنس کر بولا۔ ”بس گزارہ ہو جاتا ہے اور شکر ہے مالک کا پہلے سے۔“

”عنی بلوچ سے ابھی تک تمہارے تعلقات ہیں؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

”کیا کروں صاحب؟“ اس نے کہا۔ ”دریا میں رہ کر گھر چھوڑے۔ جھگڑا تو نہیں کر سکتا“ وہ بدحواسی میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ اسے جب بھی میرے ہوڑے کی ضرورت پڑتی ہے وہ لے جاتا ہے۔

”غلام رسول.....!“ تیمور نے کہا۔ ”میں نے سنا تھا کہ تم غنی کے ساتھ کام کر رہے ہو؟“

”ہاں صاحب! ٹھیک سنا تھا“ اس کے ساتھ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔“

”ناصر کے پاس دو اسپڈ بوش بھی تو تھیں؟“ اچانک مجھے ان بوش کا خیال آیا۔

”وہ ابھی تک موجود ہیں۔ میں نے تو بڑے صاحب سے کہا تھا کہ انہیں بھی بیچ دے ورنہ کھڑے گل جا میں گی۔ سمندر کا پانی انہیں کھا جائے گا لیکن وہ بولتے ہیں یہ میرے بیٹے کی نشانی ہے میں انہیں لگاؤں گا۔ انہوں نے میری ذمے داری لگائی ہے کہ میں ان بوش کی دیکھ بھال کروں ان کا انجن چالو کروں۔

”رنگ و روغن بھی دیکھتا ہوں۔ سمندری ہوا سب سے پہلے بوٹ یا جہاز کے رنگ پر اثر کرتی ہے۔“

”غلام رسول!“ میں نے پوچھا۔ ”پہلے تو میں تمہارا شکر یہ ادا کروں کہ تم نے بروقت اطلاع دی۔ ایک بڑی پریشانی سے بچا لیا۔“

”ہم نے برسوں ناصر صاحب کا نمک کھایا ہے۔ آپ نے بھی ہم کو بہت بخش دیا ہے۔ ہم نمک کرنا صاحب؟“ غلام رسول نے کہا۔

”لیکن غنی کو معلوم کیسے ہوا کہ عدنان امریکا جا رہا ہے؟“

”بس اچانک ہی اسے معلوم ہو گیا۔ اصل میں جس ٹریول ایجنٹ سے آپ نے عدنان کا ٹکٹ ہوا

بلوچ کا خاص آدمی ہے۔ غنی اس دن اتفاق سے اس کے پاس چلا گیا تھا۔ ٹریول ایجنٹ کے پاس پاس

ایک نوٹو کا پی بھی، غنی کی نظر اس پر پڑ گئی وہ عدنان کو پہچان گیا۔ اس نے مزید معلومات ایجنٹ سے کہیں

نے منصوبہ بنایا کہ عدنان کو ایئر پورٹ پر پکڑ دیا جائے۔ جیسے آپ نے اسے پولیس کے حوالے کیا تھا

سے اس تو بہن کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ غنی نے اس کے بعد بہت ہاتھ پیر پھیلا لیے ہیں صاحب! غلام

کہا۔ ”اب وہ پرانے بلوچ نہیں ہے جو ہمارا نائب تھا اب تو اس کے تعلقات پولیس والوں، کسٹمر

ایگریگیشن والوں سے بھی ہیں۔ ایئر پورٹ پر دو تین لوڈرز بھی اس کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس نے اس

لوڈرز کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ ایئر پورٹ پر آپ کے چاروں طرف موجود رہیں اور کوئی لوڈر آئے نہ جا

کچھ ہوا وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔“

”عنی بلوچ کہاں ہوتا ہے؟“ میں نے کہا۔

”اس کا کوئی ایک ٹھکانہ نہیں ہے صاحب!“ غلام رسول نے کہا۔ ”وہ کبھی کدھر ہوتا ہے کبھی کدھر

”تم سے رابطہ کیسے ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ٹیلی فون پر۔“ غلام رسول نے کہا۔ ”وہ ٹیلی فون کر کے ہم کو بتاتا ہے کہ کہاں پہنچتا ہے؟“

”اور اگر کہیں ہمیں ضرورت پڑے تو؟“ تیمور نے پوچھا۔

”ہمیں ضرورت پڑے؟“ غلام رسول اس کا سوال یا تو سمجھا نہیں یا جان بوجھ کر انجان بن گیا حالانکہ

سیدھا سا سادہ تھا۔

”میرا مطلب ہے کہ اگر کبھی تمہیں اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت پڑے تو تم کیا کرتے ہو؟“

”میں اسے ٹیلی فون کرتا ہوں پھر وہ جگہ فکس کرتا ہے اور مجھے وہاں بلا لیتا ہے۔“ غلام رسول نے کہا۔ ”کبھی

کبھی وہ ٹیلی فون ہی پر مجھے کسی اور آدمی سے ملنے کو کہہ دیتا ہے تو اس سے ملاقات بھی نہیں ہوتی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ روز تمہاری ملاقات غنی بلوچ سے نہیں ہوتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں صاحب! روز ملاقات کی تو ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ اس دن بھی اتفاق سے غنی بلوچ نے مجھے اپنے

ایک خاص کام سے بلایا ہوا تھا۔ اس دن وہ عدنان کو پھنسانے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا

تھا کہ میں اس کی اطلاع آپ تک پہنچا دوں گا۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ میرے پاس تیمور صاحب کا نمبر موجود تھا۔“

”تم تیمور کو کیسے جانتے ہو؟“

”تیمور صاحب اکثر ارسلان صاحب کے ساتھ آیا کرتا تھا۔ وہ لوگ ناصر صاحب سے اسپڈ بوش لیتے تھے

اور مجھے لے کر کھلے سمندر میں نکل جاتے تھے۔“

”کھلے سمندر میں جا کر کیا کرتے تھے؟“

”کبھی کھلے پانی میں کوئی جہاز ہوتا تھا اس پہ جا کر کوئی بات چیت کرتے تھے کبھی ویسے ہی گھومنے پھرنے

کے لیے چلے جاتے تھے۔ آپ تو جانتا ہے کہ ارسلان صاحب کو سمندر کی سیر کا کتنا شوق تھا؟“

”ہاں میں جانتا ہوں۔“ میں نے افسردگی سے کہا پھر غلام رسول سے بولا۔ ”تم ابھی غنی کو ٹیلی فون کرو

اور اس سے کہو کہ مجھے تم سے فوراً ملنا ہے ایک بہت ہی اہم معاملہ ہے۔“

”کوشش کرتا ہوں۔“ غلام رسول نے کہا اور جیب سے سیل فون نکال لیا۔

اسی وقت ایک لڑکا گھبرا ہوا آیا اور بلوچی میں غلام رسول سے کچھ کہا۔ میری سمجھ میں صرف غنی تیمور کا نام

آیا۔

غلام رسول اچانک گھبرایا گیا اور بولا۔ ”واجب تیمور! تم لوگ اس دوسرے راستے سے نکل جاؤ جلدی کرو۔“

”کیوں؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”عنی کو معلوم ہو گیا ہے کہ آپ لوگ ادھر آئے ہو۔ وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ ادھر ہی آ رہا ہے۔“

”آئے دو۔“ تیمور نے کہا۔ ”آج اس سے بھی دو دو ہاتھ کر لیں گے۔“

”خداقت کی باتیں مت کرو تیمور!“ میں نے کہا۔ ”عنی کوئی سڑک چھاپ غنڈہ نہیں ہے پھر اس کے ساتھ

جانے کتنے آدمی ہوں؟ یہ بزدلی نہیں، مصلحت ہے۔ ہم غنی سے بعد میں بھی نمٹ سکتے ہیں۔ چلو اٹھو جلدی

کرنا غلام رسول ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

غلام رسول ہمیں غنی دروازے تک چھوڑنے آیا پھر ایک لڑکے کو ہمارے ساتھ کر دیا کہ ان لوگوں کو گلیوں

سے نکال کر میں روڈ تک پہنچاؤ بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔“ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ”عمران صاحب!

آپ کے پاس کوئی ہتھیار ہے؟“

”ہاں ہمیں کئی خالی ہاتھ کھر سے نہیں نکلتے۔“ یہ کہہ کر ہم گھر سے نکل گئے۔

لڑکا ہمیں بتاتی تھی میری میزھی گلیوں سے نکالتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

ایک موڑ مڑتے ہی گلی کے ککڑ پر تین آدمی نظر آئے۔ لڑکا انہیں دیکھ کر چونک اٹھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ”واجا.....! یہ غنی بلوچ کا آدمی ہے۔ اب ہم واپس جائے گا تو یہ لوگ شہے میں پڑ جائے گا اور ہمیں لڑکے کی کوشش کرنے سے گاس لیے خاموشی سے سیدھے چلتے رہو۔“

وہ لوگ ہمیں دور سے دیکھ کر ہی چونکا ہو گئے تھے۔ ہم مزید آگے بڑھے تو مجھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بھدسا ایک ریوالور نظر آیا باقی لوگوں کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔

ریوالور والے نے آگے بڑھ کر اچانک میرا راستہ روک لیا اور بولا۔ ”کون ہو تم لوگ اور کدھر سے آ رہے؟“

”ہم لوگ ادھر علی حسن بلوچ کے پاس آئے تھے۔“ تیمور نے کہا۔ ”سنا ہے کہ اس کے پاس خالص مال مال ہے۔“

”تم لوگ شکل سے نشئی نہیں لگتا؟“ وہ خشک لہجے میں بولا۔ ”اور علی حسن بلوچ کوئی نیا پیدا ہو گیا ہے ادھر؟“

”اس نے اپنا یہی نام بتایا تھا۔“ تیمور نے کہا۔ ”لیکن وہ ملا نہیں۔“

ریوالور والے نے اچانک ریوالور کی نال لڑکے کی کینٹی پر رکھ دی۔ ”تم بتاؤ اصل بات کیا ہے؟“

”یہ لوگ..... یہ لوگ.....“

”جھوٹ نہیں بولنا۔“ ہمیں سنانے کو وہ اردو میں بات کر رہا تھا۔ ”اگر جھوٹ بولا تو تیری کھوپڑی اڑا دوں گا تو مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔“

اس سے پہلے کہ وہ لڑکے سے مزید کچھ پوچھتا میں نے اچانک اس کے دائیں شانے پر زوردار گھونسا مار کر دیا۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر گر پڑا اور دایاں ہاتھ بے جان سا ہو کر پہلو میں جھولنے لگا۔

میں نے فوراً ہی اپنا ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ”بیچے کو کیا مراد گئی دکھا رہا ہے مجھ سے بات کر۔“

تیمور نے بھی ریوالور نکال کر اس کے دونوں ساتھیوں کو گن پوائنٹ پر لے لیا تھا۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں تھا اگر غنی غلام رسول کے مکان پر پہنچ گیا ہوتا تو اسے معلوم ہو چکا ہوتا کہ ہم غنی دروازے سے نکل پائے ہیں۔ وہ ہماری تلاش میں مزید آدمی بھی بھیج سکتا تھا۔ میں نے ریوالور کا دستہ خاصی قوت سے اس شخص کے سر سے مارا یہی کام تیمور نے اس کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ کیا۔

لڑکا یہ منظر دیکھ کر بہت دہشت زدہ ہو گیا تھا وہ بے چارہ شاید ان معاملات میں ابھی تھا بھی نہیں غلام رسول نے اسے صرف ہماری رہنمائی کے لیے بھیجا تھا۔

”ابھی آپ لوگ سیدھا سیدھا جا کر دائیں بازو گھومے گا تو میں روڈ آ جائے گا۔ آپ کا گاڑی بھی اسی طرف ہے۔“

”ہاں ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔“ یہ کہہ کر میں اور تیمور کے ساتھ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

دائیں طرف گھومنے کے بعد جلد ہی ہم میں روڈ پر پہنچ گئے۔ وہاں سے کچھ فاصلے پر ہماری لینڈ کروزر رکھی تھی۔ میں نے ریموٹ سے گاڑی کے دروازے کھولے اور خود جلدی سے اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تیمور نے پینچر سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے گاڑی کا انجن اشارت کیا اور اسے تیزی سے آگے بڑھا دیا۔

لی مارکیٹ پہنچ کر میں نے گاڑی کا رخ ناوری کی طرف موڑنا چاہا لیکن اچانک پشت سے کسی نے میری گردن

پر ریوالور کی نال رکھ دی اور بولا۔ ”ادھر نہیں سیدھا چلتے رہو۔“

میں بری طرح اچھل پڑا تیمور بھی چونک اٹھا۔

میں نے بیک دیوڑ میں دیکھنے کی کوشش کی لیکن مجھے سوائے ایک ہاتھ کے کچھ نظر نہ آیا۔ بیٹھنے والا کچھ اس انداز میں جتنی سیٹ کے پائیدان میں بیٹھا تھا کہ اس کا چہرہ اور پورا جسم چھپ گیا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق سیدھا چلتا رہا۔

”اڑنے یہ گاڑی ہے کہ گدھا گاڑی؟“ اس نے جھنجھلا کر کہا۔ ”کیسا میل رفتار سے چل رہا ہے۔“ اڑنے تھوڑا اسپید دکھاؤ۔“

”اس کا گیر پھنس رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اس سے زیادہ تیز نہیں چل سکتی۔“ میں نے کہا۔

”بکواس کرے گا تو ابھی تمہارا کھوپڑی تریوز کے مائک بکھر جائے گا۔ یہ بالکل نیا لینڈ کروزر ہے ہمارے ماتھے پر کیا پگنل کا بوڈ (بوڈ) لگا ہے؟“

”تمہارا ہاتھ میں نظر ہی کب آ رہا ہے واجا! میں نے طنز لہجے میں کہا۔ ”اب مجھے کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس پر پگنل کا بوڈ ہے یا باو لے کا؟“ پھر میں تلخ لہجے میں بولا۔ ”تم ہو کون اور ہمیں کہاں لے جا رہے ہو؟“

”زیادہ بات کرنے کا ضرورت نہیں ہے عمران صاحب! اس نے کہا گویا وہ میرا نام بھی جانتا تھا۔“

”گاڑی کو اسپید دو رو نہ تمہارا اس دوست کو مار دے گا۔“

میرے ہاتھوں سے اس کی توجہ ہم لوگوں کی طرف سے کچھ کم ہو گئی تھی۔

”اڑ بھائی.....!“ تیمور نے کہا۔ ”ڈرائیونگ سیٹ پر میں نہیں ہوں جو تم مجھے مار دو گے؟ اس سے کہو اسٹیئرنگ میرے حوالے کر دے پھر دیکھنا میں اس لینڈ کروزر کو کیسے جیٹ ہوائی جہاز بنا تا ہوں۔“

”ابھی زیادہ بات نہیں کر دو رو نہ ہمارا کھوپڑی گھوم گیا تو دونوں کی کھوپڑی اڑا دے گا۔“

”یاز تم جب سے گاڑی میں بیٹھے ہو مسلسل مارنے کی دھمکی دے رہے ہو؟“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

”یہ دھمکی نہیں ہے۔ ہم جو کچھ کہتا ہوں اس پر عمل بھی کرنا ہوں۔ اب ہم پانچ تک گنوں گا اس کے بعد تمہارے ماتھے کا کھوپڑی اڑا دوں گا۔“ اس نے ریوالور کی نال تیمور کی گردن پر رکھ دی۔ ”ایک..... دو.....“

میں نے گاڑی کی اسپید ایک دم بڑھا دی۔ وہ جھٹکے سے اچھل کر پیچھے گرا۔ تیمور نے گھوم کر پلک جھپکتے میں کی ریوالور والی کٹانی پکڑ لی اور اسے زوردار جھٹکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ خود بھی قلابازی کھا کر پیچھے کی طرف چلا گیا۔

مجھے عقب نما آئینے میں اب پیچھے کا منظر واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ تیمور نے اس کی دونوں کلائیوں تمام رکھی تھیں۔ اچھی بات یہ تھی کہ اب اس کے ہاتھ میں ریوالور نہیں تھا۔

حملہ آوری کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح تیمور کی گرفت سے اپنی کلائیوں چھڑا لے مگر تیمور کی گرفت معمولی نہیں ہوتی تھی حملہ آور نے بھننا کر تیمور کو ایک غلیظ گالی دی اور اس کی ناک پر ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ تیمور نے اس کی خوف ناک ٹکر سے بچنے کی کوشش کی لیکن بچتے بچتے بھی اس کی ٹکر تیمور کے چہرے کی بائیں طرف لگی۔

مگر خاصی شدید تھی میں نے تیمور کو سر جھٹکنے دیکھا پھر کچھ سنبھل کر اس نے بھی ٹکر ہی کا استعمال کیا اور حملہ آور کی پیشانی پر اتنی زوردار ٹکر ماری کہ اس کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے۔ تیمور نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی

کلائی چھوڑ کر اس کے منہ پر اتنا زور دار شیخ مارا کہ حملہ آور ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح کرب ناک آواز نکالنے لگا۔
چنچا اور ہاتھ پیر ڈھیلے چھوڑ دیئے۔

”یہ کہیں مر تو نہیں گیا؟“ میں نے پوچھا۔
”یہ بہت سخت جان ہے بھیا! اس قسم کی چھوٹی موٹی چوٹیں تو ان کو لگتی رہتی ہیں۔“
پھر میں نے چونک کر پوچھا۔ ”اب اس کا کرنا کیا ہے؟“

”اسے اپنے ایک ٹھکانے پر لے جا کر نشتر کر دوں گا۔ آپ ایسا کریں، اب آپ اپنی نشست پر آجائیں۔
ڈرائیونگ میں کروں گا۔ آپ کو اس ٹھکانے کا علم نہیں ہے جہاں اس وقت میں اس حملہ آور کو لے جا رہا ہوں۔“
میں نے گاڑی روک دی اور ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دوسری طرف سے تیسرا اتار
اسٹیشننگ پر بیٹھ گیا۔ میں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

تیسور نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے نشتر سے کہا۔ ”بھیا! آپ نے ایک بات نوٹ کی؟ ہمارا اتار
ہورہا ہے۔“

”تغاقب ہورہا ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“
”ابھی جب آپ نے گاڑی روکی تو میں نے ایک آف وہائٹ سوزو کی کو بھی آتے دیکھا تھا مجھے اس میں
دو آدمی نظر آئے تھے، ممکن ہے سوزو کی کیری کے پچھلے حصے میں مزید آدمی بھی ہوں۔“

”کیا اب بھی وہ سوزو کی کیری ہمارے تغاقب میں ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”جی ہاں ہمارے روانہ ہوتے ہی وہ بھی حرکت میں آگئی تھی۔“

”پھر ایسا کرو کہ اپنے ٹھکانے پر جانے کی بجائے یونیورسٹی روڈ کی طرف چلو۔ میں اس سوزو کی کیری میں
موجود افراد کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

تیسور نے لیجنر سیٹ کو تھوڑا سا پیچھے کھسکا یا اور سیٹ کے نیچے واقع چھوٹے سے خفیہ خانے سے ریولور کے
سائیلنسر اور ٹیل ٹینس کی جتنی جا رگیندیں نکال لیں پھر وہ مجھ سے بولا۔ ”بھیا! ذرا اپنا ریولور مجھے دیں۔“

”فی الحال میرے ریولور کو چھوڑ دو تم ڈرائیونگ کی طرف توجہ دو۔ میں اس سوزو کی کیری کو کسی دہرائے ٹھا
لے جانا چاہتا ہوں کہ وہاں ہم بہت آسانی سے ان کا شکار کر سکتے ہیں۔“

”وہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے لیکن آپ اپنے ریولور پر یہ سائیلنسر توفت کر لیں۔“
”اور یہ بال کیسی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ رگیندیں نہیں ہیں بلکہ انتہائی طاقتور ترین بم ہیں ان میں ایسا آتش گیر مادہ ہے کہ جہاں بھی پڑے
وہاں آگ لگا دیتا ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہ بم استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔“

اس دوران میں ہم صفورا کوٹھ کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔
”یار تیسور یہاں بھی اچھی خاصی آبادی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ تمام گہما گہمی اور رونق زیادہ سے زیادہ جگہ
موسمیات کے دفتر تک ہوگی لیکن یہاں تو اس سے بھی زیادہ رش ہے۔“

”یہاں سے آگے ڈھلوانی کی طرف جاتے ہوئے اب بھی ہزاروں ایکڑ زمین ہے جو قبضہ مافیا کی دست
سے اب تک محفوظ ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ وہ زمین کسی انتہائی ذی اثر شخص کی ملکیت ہے۔ ممکن ہے وہ حکومت ہی کا کوئی بااثر وزیر یا
مشیر ہو۔“

ہم صفورا کوٹھ سے کافی آگے نکل گئے۔ بائیں طرف ملیئر چھاؤنی کا علاقہ تھا جہاں بڑی سی چمک پوسٹ کے
ساتھ ساتھ تیز لگے تھے اور دو تین سنتری موجود تھے۔ ہم سڑک کے اس دو شاخے سے دائیں طرف چلے گئے۔
چنچا کا میٹر بعد ہی ویرانہ شروع ہو گیا۔ سڑک کی دونوں اطراف خورد و جھاڑیوں کا ایک جنگل بھی تھا۔

میں نے تیسور سے پوچھا۔ ”وہ سوزو کی کیری اب کہاں ہے؟“
”وہ بہت مستقل مزاجی سے ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔“ تیسور نے ہنس کر جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ ہمارا شکار کچھ کسمسار ہاتھا گویا اسے بھی ہوش آنے والا تھا۔
میں نے اس کے سر پر ریولور کا ایک اور دستہ رسید کر دیا تاکہ وہ کم سے کم ایک گھنٹہ تک آرام سے لیٹا رہے۔

چنچا کو میٹر مزید چلنے کے بعد سڑک پر ایک ہلکا سا موڑ آیا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اس موڑ کی وجہ سے
سوزو کی کیری چند سینٹو کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

میں نے غلٹ میں تیسور کو گاڑی روکنے کا حکم دیا اور خود بائیں طرف کی خورد و جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔
میں نے تیسور سے کہا کہ تم گاڑی کا بوٹ کھول کر یہ ظاہر کرو جیسے اس کے انجن میں کوئی خرابی ہو گئی ہو۔

پھر میں پوری طرح جھاڑیوں میں چھپ گیا۔ اس کوشش میں میرے گھٹنے اور جسم کے دوسرے حصے زخمی
ہو گئے۔ کانٹے دار جھاڑیوں کی وجہ سے میرے پیڑے بھی پھٹ گئے لیکن میں پوری طرح مستعد تھا۔

فورا ہی مجھے کسی دوسری گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی وہ سوزو کی کیری ہی تھی۔ ان لوگوں نے ہماری
گاڑی کے تین نزدیک اپنی گاڑی روک دی تھی۔

پھر کوئی کرخت آواز میں بولا۔ ”کیا ہوا جناب ہم کوئی مدد کر سکتے ہیں؟“
”میرا خیال ہے کہ گاڑی کرنٹ نہیں لے رہی ہے پوائنٹ کا مسئلہ ہے۔“ تیسور نے سرسری انداز میں جواب
دیا۔

”کوئی بات نہیں جناب! میرا ساتھی شیرو بہت اچھا مینیک ہے۔ یہ ابھی منٹوں میں آپ کی گاڑی اسٹارٹ
کر دے گا۔“ کرخت آواز پھر سنائی دی۔

”خشتک! یو پیری بیچ!“ تیسور نے کہا۔ ”اتنا کام تو میں بھی جانتا ہوں میں ٹھیک کر لوں گا۔“
”آپ کے ساتھ اور کون ہے؟“ کرخت آواز پھر سنائی دی۔

”آپ پلیز اپنے کام سے کام رکھیں۔“ تیسور نے خشتک لہجے میں جواب دیا۔
”ہم اپنے کام سے ہی کام رکھ رہے ہیں۔“ کرخت آواز والا شخص بولا۔ ”ہمیں شبہ ہے کہ آپ کی گاڑی
مشکلات میں۔“

”مشکلات...؟“ تیسور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”ہاں ہیں تو پھر؟“
”پھر یہ کہ ہمیں گاڑی کی سلاشی لینا پڑے گی۔“ وہ آدمی پھر بولا۔

”آپ قیاس کن؟“ تیسور نے جھلا کر پوچھا۔ ”آپ کو سلاشی کا اختیار کس نے دیا ہے؟“
”میں ہاروکس کا اسٹریٹ شہاز خاں ہوں۔“ کرخت آواز والا بولا۔ ”اور میں کافی دور سے آپ کا پیچھا کرتا

ہوا آیا ہوں۔

”اور آپ کو یہ اختیار ہے کہ آپ کسی بھی شریف شہری کو پریشان کریں اس کی گاڑی کی تلاشی میں نے درشت لہجے میں کہا۔“ جائے میں آپ کو تلاشی نہیں دوں گا۔“

”تلاشی تو نہیں دینا پڑے گی۔“ شہباز نے کہا۔ نہ جانے وہ اس مردود کا فرضی نام تھا یا اصل؟
”یہ ریو اور جیب میں رکھ لو انپیکٹر صاحب!“ تیمور نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”ان کھلونوں سے عمر گزر گئی ہے میں اس سے ڈرنے والا نہیں ہوں، کوئی راکٹ لانچر یا توپ لے کر آؤ شاید میں ڈر جاؤں۔“

”تیری بہت زبان چل رہی ہے اس کھلونے میں سے ایک چھٹانک کی گولی نکلتی ہے جو انسان کو گولی آسمان پر پہنچا دیتی ہے، چل گاڑی کی تلاشی دے۔“

میں نے جھاڑیوں کی ادٹ سے سر نکال کر دیکھا، مجھے اپنی گاڑی کے نیچے سے دو آدمیوں کے سر نظر آتے تھے، گویا اس جلی انپیکٹر کے علاوہ وہاں ایک آدمی اور بھی تھا۔ ممکن ہے گاڑی میں دو چار آدمی مزید ہوں۔ میں نے نیچے سے جلی انپیکٹر اور اس کے ساتھی کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔

گولی لگتے ہی وہ کراہ کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کے گرتے ہی میں نے دوسرے آدمی کو نشانہ بنایا، چیخ مار کے زمین پر بیٹھ گیا، گولی اس کی پنڈلی ادھیڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس دوران میں تیمور بھی اچھا جھاڑیوں میں چلا گیا تھا پھر مجھے ”ٹھک“ کی آواز سنائی دی اور سوزو کی کیری کی طرف سے کسی کی کرب سنائی دی۔

میں پیٹ کے بل رہینگتا ہوا تیزی سے سڑک کی طرف بڑھا۔ اب میں اپنی گاڑی کی پشت پر تھا اور سوزو کی کیری بھی بہت واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ ایک آدمی سوزو کی کے دروازے کے نیچے میں آ رہا اور آدھا ہار لٹک رہا تھا اور وہ بری طرح زخمی تھا۔

پھر میں نے سوزو کی سے ایک اور شخص کو برآمد ہوتے دیکھا، وہ بہت احتیاط سے ارد گرد دیکھتا ہوا چلا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔

”اندر ہی رہو۔“ جلی انپیکٹر چیخ کر بولا۔ ”ابھی باہر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

لیکن اسے بہت دیر ہو چکی تھی اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر گاڑی میں گھستا، میں نے اس کا نشانہ لیا اور فائر دیا۔ وہ چیخ مار کے اچھلا اور پھر دھب سے زمین پر آگرا۔ میں نے دوسرا فائر گاڑی کے نائز پر کیا پھر مزید فائر کیا۔ اس کے دوسرے نائز پر کر دیا۔

اسی وقت بھاگتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی اور تیمور کی آواز آئی۔ ”اپنے ہتھیار چھیک دو اور ہاتھ کو اس ویرانے میں ہلاک کر دوں گا۔“

تیمور کی آواز سن کر میں بھی باہر آ گیا۔ وہ گھل چار آدمی تھے دو میری فائرنگ سے زخمی ہو گئے تھے، تیمور گولی سے مارا گیا تھا اور چوتھا میری گولی سے زخمی ہوا تھا جو آدمی گاڑی سے نکلے ہوئے میری گولی کا نشانہ بنا تھا اس کی حالت نازک تھی، گولی اس کی ریزہ کی ہڈی میں بیوست ہو گئی تھی۔ وہ شدید کرب کے عالم میں رگڑ رہا تھا۔ شکل و صورت سے وہ بھی کمزور تھا۔ پہلی نظر میں وہ نیکرو لگتے تھے کیوں کہ ان کے جسموں پر

نی کس جس۔
”مجھے ہاسپٹل پہنچا دو۔“ جلی انپیکٹر نے کہا۔ ”میرے زخم سے بہت زیادہ خون بہہ رہا ہے۔“
”تمیں اپنی فکر ہے؟“ تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اپنے اس ساتھی کی فکر نہیں ہے جو تکلیف کی شدت

میں پریشان کر رہا ہے؟“
”اس کا تو آخری وقت آ پہنچا ہے۔“ جلی انپیکٹر نے بے حسی سے کہا۔ ”ہمارے دھندے میں یہی ہوتا ہے موت ہر روز پرگھات لگائے بیٹھی ہوئی ہے اور کوئی نہ کوئی اندھی گولی ہمیں چاٹ جاتی ہے۔“
”تمہارا دھندے میں کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارا تعلق تو تارکوئس کے شعبے سے ہے میں تمہیں کسی سرکاری ہوسپتال پہنچا دیتا ہوں، اپنا آئی ڈی کارڈ مجھے دو۔“

جلی انپیکٹر زہریلے انداز میں مسکرایا۔ ”میں اگر سرکاری ملازم ہوتا تو آج بے یار و مددگار تم لوگوں کے رحم و کرم پر نہ ہوتا۔“
”اس کا مطلب ہے کہ تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا؟“ تیمور نے کہا۔ ”کیوں؟ تم گاڑی کی تلاشی کیوں لینا چاہتے تھے؟“

”میں آپ کو سب بتا دوں گا، پہلے مجھے فرسٹ ایڈ دے دیں ورنہ خون بہنے سے میں مر جاؤں گا۔“
”تم اتنی آسانی سے نہیں مرو گے۔“ تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
اس وقت تک اس کا دوسرا زخمی ساتھی شاید بے ہوش ہو چکا تھا یا پھر خون بہہ جانے سے مر چکا تھا۔

”تم ہمارا پیچھا کیوں کر رہے تھے اور گاڑی کی تلاشی کیوں لینا چاہتے تھے؟“
”اس گاڑی میں ہمارا ایک آدمی تھا۔“ اس نے یوں کہا جیسے آدمی نہ ہو، کوئی چیز رہ گئی ہو۔
”تمہارا آدمی؟ ہماری گاڑی میں؟“ تیمور نے حیران ہونے کا مظاہرہ کیا۔

”ہاں وہ ہمارے ساتھی آپ کی گاڑی میں چھپا تھا۔“
”لیکن کیوں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے کہا تھا کہ میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا، مجھے پہلے فرسٹ ایڈ دے دیں۔“
”اس کے جو آدمی مر گئے ہیں انہیں دوبارہ اس سوزو کی میں ڈال دو۔“ میں نے تیمور سے کہا۔ ”اور اسے اپنی گاڑی میں منتقل کر دو۔“

تیمور اس کی گاڑی کی طرف بڑھا، وہ اس وقت بھی بہت محتاط تھا کہ ہمارا ان کا کوئی اور ساتھی اب بھی گاڑی میں موجود ہو سکتا ہے، وہاں اب کوئی نہیں تھا۔

اس وقت تو وہ آدمی بھی مر چکا تھا جو میری گولی سے زخمی ہوا تھا۔ ایک آدمی تیمور کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ تیمور نے ان دونوں کو اٹھا کر دوبارہ گاڑی میں ڈالا پھر وہ اس جلی انپیکٹر اور اس کے اس ساتھی کی طرف متوجہ ہوا جو سب سے پہلے میری گولی کا نشانہ بنا تھا۔ وہ دوسرا آدمی بھی اٹھارے اٹھارے سانس لے رہا تھا۔ تیمور نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اس نے ایک گہری سانس لی اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

”تمیں کم جہاں پاک۔“ تیمور نے کہا۔ ”یہ بھی جان سے گیا۔“ پھر وہ جلی انپیکٹر سے بولا۔ ”یار تم لوگ

شہباز تھوک نکل کر رہ گیا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”ہاں اب بتاؤ یہ خادم حسین کون ہے؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”میں نے رجمو کے سامنے جھوٹ بولا تھا۔“ شہباز نے کہا۔ ”خادم حسین کا کوئی وجود نہیں ہے۔“

”تم تو بہت اچھی اردو بول لیتے ہو۔ کچھ پڑھے لکھے بھی ہو؟“

”میں نے انٹرمیڈیٹ کیا ہے صاحب! اس نے اچانک مجھے ”صاحب!“ بنا دیا۔

”تو پھر تم نے خادم حسین کا نام کیوں لیا؟“

”پرانے لوگ غنی بلوچ کو خادم حسین کی بجائے خادو کے نام سے پکارتے ہیں۔“

”کون غنی بلوچ؟“ میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

”آ..... آپ غنی بلوچ کو نہیں جانتے صاحب؟“ اس کے لہجے میں تحیر تھا۔

”غنی بلوچ کیا قائد اعظم ہے یا صدر اوباما؟“ میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ”کہا سے جانتا بہت ضروری ہے۔“

”ہمارا خیال تھا کہ آپ انڈورلڈ کا آدمی ہے آپ غنی بلوچ کو ضرور جانتے ہوں گے۔“

”میں نہیں انڈورلڈ کا آدمی لگتا ہوں؟“ میں نے کہا۔

”صاحب! لگتے تو نہیں ہو لیکن.....“

”اچھا چھوڑو اس بات کو غنی بلوچ نے تم سے کیا کہا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس نے مجھے پچیس ہزار روپے دیئے تھے اور کہا تھا کہ اس گاڑی میں جو سوار ہوا ہے انوار کے لیے پاس لے آؤ۔ اگر زیادہ اڑی کرے تو اسے وہیں گولی مار دو۔ میں نے رجمو سے کہا کہ تم اس گاڑی میں چھپ جاؤ اور گاڑی والوں کو اسٹیڈیم روڈ کی طرف لے آؤ پھر میں ان سے منٹ لوں گا۔“ پھر وہ آہستہ سے

”رجمو پر تم کے لاک کھولنے میں ماسٹر ہے پھر گاڑی کا لاک تو اس کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتا۔“

”فالتو بکواس سے پرہیز کرو تو اچھا ہے۔“ تیمور اگر بولا۔ ”تم سے غنی بلوچ نے اور کیا کہا تھا؟“

”اور تو اس نے کچھ بھی نہیں کہا تھا..... ہاں اس نے کہا تھا کہ اس کے گینگ کا ایک آدمی غلام رسول

ڈیل کر اس کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ عمران بھی اس وقت اس کے ڈیرے پر موجود ہے۔ اس کے ساتھ

ساتھی اور بھی ہے ان دونوں کو گھیر کر بنگلہ نمبر سترہ میں لے آؤ۔ غلام رسول سے تو میں خود منٹ لوں گا وہ

زادہ آئندہ زندگی بھر کسی سے بھی کچھ کہنے کے قابل نہیں رہے گا۔ میں اس کی زبان ہی کاٹ ڈالوں گا۔“

بانس نہ بچے گی بانسری۔“

مجھے غلام رسول کی طرف سے تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ غنی بلوچ نے اپنے آدمیوں کی ناکامی کا سارا غصہ

رسول پر اتارنا ہو گا۔

میں نے تیمور کو کمرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور اس سے کہا۔ ”تیمور! ذرا غلام رسول کا نمبر لاؤ۔“

تیمور نے موبائل فون جیب سے نکالا اور غلام رسول کا نمبر ڈائل کر دیا۔ اس نے احتیاطاً ایک فوننگ

کر دیا تھا۔

دوسری طرف بیل بجتی رہی پھر غلام رسول کی آواز آئی۔ ”ہیلو تیمور! کیسے کال کی سب خیریت تو ہے؟“

اس کی آواز سن کر میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا۔

”غلام رسول!“ تیمور نے کہا۔ ”لو عمران صاحب سے بات کرو یہ تمہاری طرف سے بہت فکرمند تھے۔“

اس نے سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔

”غلام رسول!“ میں نے سیل فون لے کر کہا۔ ”تم خیریت سے تو ہو؟“

”میں بالکل خیریت سے ہوں عمران واجب!“ اس نے کہا۔

”لیکن محتاط رہنا۔“ میں نے کہا۔ ”ہو سکتے تو اپنا وہ ٹھکانا عارضی طور پر چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہو جاؤ۔ غنی بلوچ

کے ارادے بہت خطرناک ہیں۔ میں نے اس کے تین آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے اور دو آدمی میری

قید میں ہیں۔ ابھی اسے اس کا علم نہیں ہے جب اسے معلوم ہوگا تو وہ پاگل ہو جائے گا۔ میں اس لیے کہہ رہا ہوں

کہ تم اپنا وہ ٹھکانا فوری طور پر چھوڑ دو۔“

”کیا بات کرتا ہے واجب؟“ غلام رسول نے برامان کر کہا۔ ”ابھی غلام رسول پر اتنا برا وقت نہیں آیا ہے کہ کوئی

اس کے گھر میں گھس کر اسے نقصان پہنچا سکے اور پھر زندہ سلامت وہاں سے لوٹ جائے۔ تم احتیاط کرو واجب!“

اس نے فکرمندی سے کہا۔ ”اگر کچھ بندے چاہیں تو اپنے کچھ بہترین ہندے تمہاری طرف بھیج دوں؟“

”شکر ہے غلام رسول!“ میں نے کہا۔ ”میں بھی اب اتنا گیا گزرا نہیں ہوں کہ غنی بلوچ جیسے تیسرے درجے

کے بدعاش مجھے نقصان پہنچا سکیں، تم اس اپنا خیال رکھنا۔“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور دوبارہ شہباز

کے کمرے میں آ گیا۔

”صاحب جی!“ غنی بلوچ کے منجر سارے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ آج نہیں تو کل آپ کا یہ ٹھکانا سلاش

کر لے گا۔“

”تمہارا سیل فون کہاں ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

”وہ تو مجھ سے پیسلے ہی آدمی نے لے لیا تھا۔“ شہباز نے کہا۔

”یہ گھڑی اور انگلی بھی اتار کر مجھے دے دو۔“ میں نے کہا۔

میں نے دیکھا میری اس بات سے شہباز کا چہرہ کچھ تاریک پڑ گیا، اس نے پیسلے انگلی اتاری وہ سونے کی

عکاس انگلی تھی جس میں باقوت جزا ہوا تھا۔ اس نے وہ انگلی میری طرف بڑھا دی۔

”گھڑی.....“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”یہ گھڑی تو بہت سستی ہے صاحب!“ اس نے کہا۔ ”صدر میں ڈھیریوں کی صورت میں ایک سوساٹھ

تیمور نے آگے بڑھ کر پھر اس کے چہرے پر زور دار تھپڑ رسید کر دیا اور ناگواری سے بولا۔ ”کیا تم بغیر مار

کھانے کوئی کام نہیں کرتے؟ جب تم سے کہا جا رہا ہے کہ گھڑی اتار دو تو اتار دو چاہے اس کی قیمت ایک سوساٹھ

دو سو ہو یا ایک لاکھ روپے!“

تھپڑ کھانے کے شہباز کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا وہ بھٹکا کر بولا۔ ”اپنے ہاتھ قابو میں رکھو مسٹر! انڈورلڈ کی دنیا

بہت چھوٹی ہے ہو سکتا ہے کل تم میری جگہ ہو اور میں تمہاری.....“

اس کا ہاتھ ادمورارہ گیا اور تیمور نے پیسلے سے بھی زیادہ قوت سے اس کے تھپڑ رسید کر دیا۔ ”تو مجھے دھمکی دے

رہا ہے اس انڈورلڈ کی دنیا بہت چھوٹی ہے لیکن جب تو اس چھوٹی دنیا میں واپس جائے گا تو کچھ کر سکے گا۔ میں

تجھے اس قابل ہی نہیں چھوڑوں گا کہ تو دوبارہ وہاں جا سکے۔ اب جلدی سے گھڑی اتار کے میرے حوالے کر دو۔
 ورنہ اب میرا ہاتھ نہیں بلکہ لات چلے گی۔“

شہباز کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اس کے چہرے پر تیوری انگلیوں کے نشانات ثبت ہو چکے تھے۔
 مجھے یقین تھا کہ اس کے دو چار دانت بھی بل گئے ہوں گے اور ممکن ہے کہ جبر سے کی ہڈی میں بھی فریخ ہو جائے۔
 اس کے دائیں رخسار کا گوشت کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔

اس نے فہر آؤں نظروں سے تیور کو گھور اور اپنے ہاتھ سے کلائی کی گھڑی اتار کر میری طرف بڑھادی۔
 میں ایک مرتبہ پھر تیور کے ساتھ کمرے سے باہر نکل آیا اور بولا۔ ”سب سے پہلے تو اس کا موبائل آؤ
 کر کے اس میں سے سیم اور بیٹری نکال لو۔ ممکن ہے موبائل میں کوئی لوکیشن فاسٹرز ڈیوائس لگی ہو۔ اس کے
 اس کی یہ گھڑی چیک کر دو اس میں کوئی ڈیوائس ہو سکتی ہے۔“

اس کا سیل فون تو میں نے پہلے ہی آف کر دیا تھا۔ میں اس کی بیٹری اور سیم بھی نکال دیتا ہوں ویسے ہی فریخ
 ہے کہ اگر کوئی ایسی ڈیوائس ہے بھی تو اس کی گھڑی میں ہوگی۔ آپ نے گھڑی اتارنے کے نام پر اس کا دل کھینچ
 دیکھا تھا؟“

”ہمارے آدمیوں میں کوئی الیکٹرانک کا ماہر ہے؟“ میں نے کہا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا آدمی
 کنفرم کر سکے کہ گھڑی میں کوئی ایسی ڈیوائس ہے یا نہیں؟“

”بالکل ہے۔“ تیور مسکرا کر بولا۔ ”آپ شاید عدنان کو بھول گئے۔ وہ ابھی امریکا نہیں گیا ہے اور میرے
 خیال میں تو وہ ہرمس کے الیکٹرانک سامان کا کیزا ہے۔ میں نے ہمیشہ اسے اپنے لپ ٹاپ پر مصروف دیکھا ہے۔
 ارے ہاں عدنان کو تو میں بھول ہی گیا۔“ میں نے کہا۔ ”اصل میں وہ ان تمام معاملات سے لاعلم ہے۔
 اس لیے اس کا خیال نہیں آیا۔“

”دوسری بات یہ کہ ہاشم بھی ان تمام کاموں میں بہت ماہر ہے اس نے تو پیکنگ کی بھی کی ہے۔“
 ”تو پھر ہاشم ہی کو بلا لو لیکن اسے بلائے سے پہلے ریمو کا سیل فون اور انگوٹھی بھی لے آؤ۔“

”اس کا بھی سیل فون میرے پاس ہے لیکن گھڑی میں نے اس سے نہیں لی شاید اس کے ہاتھ میں گھڑی ہے۔“
 ہی نہیں۔ دیکھتا ہوں کہ اس کے پاس ریسٹ وائچ ہے یا نہیں؟“

تھوڑی دیر بعد ہاشم اور تیور ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ تیور ریمو سے بھی ریسٹ وائچ اور
 لے آیا تھا۔ اس نے ریمو کے سیل فون سے سیم اور بیٹری دونوں نکال دی تھیں۔

”ہاں عمران! تم نے مجھے بلا یا؟“
 ”وہ چونکہ مجھ سے کافی سینئر تھا اس لیے مجھے ”تم“ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ مجھے اس کا یہ انداز مخاطب
 پسند تھا۔

”ہاں میں نے بلا یا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ڈرا یہ گھڑیاں غور سے دیکھیں۔ ان.....“
 ”یہ تو خاصی مہنگی گھڑیاں ہیں عمران! اس وقت ان دونوں گھڑیوں کی قیمت تقریباً ڈھائی لاکھ روپے ہوں
 گی۔“

”آپ پہلے میری پوری بات تو سن لیں میں نے آپ کو یہاں گھڑیوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے
 کیا تم یہ گھڑیاں خرید رہے ہو؟“

”آپ پہلے میری پوری بات تو سن لیں میں نے آپ کو یہاں گھڑیوں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے
 کیا تم یہ گھڑیاں خرید رہے ہو؟“

معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں دستی گھڑیوں میں کوئی ایسی چپ، کوئی ایسی ڈیوائس تو پوشیدہ
 نہیں ہے جو لوکیشن فاسٹرز کے طور پر لگائی جاتی ہے؟“

”اچھا اچھا۔“
 ”میں نے طویل سانس لیا اور بولا۔ ”مجھے اس کے لیے اپنا ہی تیار کردہ میٹر اور کچھ دوسرے اوزار استعمال کرنا
 پڑیں گے۔“

☆.....☆

دس منٹ کے اندر اندر ہاشم نے یہ بتا دیا کہ ان دونوں گھڑیوں میں مخصوص قسم کے سگنلز والی ڈیوائس موجود ہیں۔
 ”سنا کارہ کسے ہوں گی؟“ تیور نے پوچھا۔

”وہ کوئی پرائیلم نہیں ہے میں وہ چپ نکال کر ضائع کر دوں گا۔“
 میں ایک مرتبہ پھر شہباز کے کمرے میں جانے لگا تو ادیہ نے مجھے ٹوک دیا اور بولی۔ ”اب آپ دو گھڑی ذرا
 آرام کر لیں۔“

”بس دس منٹ اور!“ میں نے کہا اور شہباز کے کمرے میں داخل ہو گیا۔
 وہ میٹرز پہ دیوار کے سہارے سیم دراز تھا اور چہرے سے خاصا فکر مند نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”آپ
 لوگوں نے میرے زخم کی اچھی طرح صفائی تو کر دی تھی نا؟“

”اس صورت حال میں جو کچھ ممکن تھا ہم نے کر دیا ہے۔ اگر تمہارا زخم بگڑ بھی گیا تو زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا
 تمہاری ایک ٹانگ ہی تو کاٹنا پڑے گی۔“ تیور نے سفاک اور سرد لہجے میں کہا۔

”اب ذرا جلدی سے مجھے غنی بلوچ کا سیل نمبر بتاؤ تاکہ اس سے بھی دو باتیں ہو جائیں۔“ میں نے کہا۔
 اس نے بلا جیون وچرائٹی بلوچ کا نمبر بتا دیا۔

تیور نے وہ سیل فون نکالا تھا جو ایسے موقعوں پر ہم استعمال کرتے تھے۔ اس نے نمبر ملا کر سیل فون میرے
 حوالے کر دیا۔

دوہری طرف گئی جتنی رہی، میں مایوس ہو کر لائن کاٹنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے کال ریسیو کرنی لگی
 اور کوئی انتہائی اکھڑے لہجے میں بولا۔ ”ہیلو.....“

”کون بول رہا ہے؟“ میں نے بھی اسی لہجے میں کہا۔
 ”تم کو کس سے بات کرنی ہے؟“ دوسری طرف سے درشت لہجے میں کوئی بولا۔

”مجھے غنی بلوچ سے بات کرنا ہے۔“ میں نے بھی اسی طرح غیر مہذب لہجے میں کہا۔
 ”میں بول رہا ہوں تم کون ہو؟“

”میں تمہارا باپ ہوں.....“ میں نے کہا۔
 ”کیا کلاس کر رہا ہے؟“ غنی بلوچ تپ کر بولا۔ ”تو جانتا ہے کہ کس سے بات کر رہا ہے؟“

”تو نے ابھی تو اپنا نام بتایا ہے کم ذات..... اب مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ میں تجھے جانتا ہوں یا نہیں؟“ میں
 نے کہا۔

”میں تمہارا باپ عمران بول رہا ہوں۔“

”عمران.....!“ وہ ساٹ لہجے میں بولا پھر خاموش ہو گیا۔ میں سمجھا کہ اس نے لائن ڈراپ کر دی ہے۔
 ”بیلو.....“ میں نے کہا۔ ”میرا نام سن کر تجھے سانپ کیوں سونگھ گیا بے غیرت؟“
 ”تو ابھی تک زندہ ہے؟“ اس نے یوں کہا جیسے اسے میری موت کی اطلاع مل چکی ہو۔
 ”اللہ کے فضل سے میں زندہ ہوں اور تجھے جنم رسید کرنے سے پہلے مروں گا بھی نہیں۔“ پھر میں ہنس کر
 بولا۔ ”تو کیا سمجھ رہا تھا کہ اپنے ان پانچ چوہوں کو بھیج کر مجھے ختم کر دے گا؟ پانچ چوہوں کے ذکر پر مجھے بچپن
 میں پڑھی ہوئی ایک نظم یاد آ رہی ہے وہی
 پانچ چوہے گھر سے نکلے
 گرنے چلے شکار“

”دیکھو عمران! اگر میرے ان آدمیوں کو کچھ ہوا تو میں تجھے دنیا کے کسی کو نے میں نہیں چھوڑوں گا۔ تجھے شاید
 معلوم نہیں کہ ان لوگوں میں میرا بھائی بھی ہے۔“
 ”تم شاید بھول رہے ہو کہ ایک میرا بھائی بھی تھا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“
 ”میں پوچھتا ہوں کہ میرا بھائی کہاں ہے؟“
 ”آواز پیچی کر کے بات کر۔“ میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ ”پہلے تو یہ بتا کہ تو نے ان چوہوں کو
 میرے پیچھے کیوں بھیجا تھا؟“
 ”تجھے جنم رسید کرنے کے لیے۔“ غنی بلوچ غالباً دانت پیس کر بولا تھا۔
 ”لیکن معاملہ الٹ ہو گیا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تو صفورا گٹھ سے تقریباً بیس بائیس کلومیٹر اندر کی طرف جا
 ہاں ایک سوزو کی کیری میں تجھے تیرے آدمیوں کی لاشیں مل جائیں گی۔“

”بکواس کرتا ہے کتے..... کینے.....“
 ”اپنی اوقات میں رہ اچکے، بیرون فروش تو تو ان لوگوں میں سے ہے جو جس تھالی میں کھاتے ہیں اسی میں
 چھید کرتے ہیں۔ اپنے بھائی کی موت کی خبر سن کر کتنا دکھ ہو رہا ہے تو نے ناصر کو قتل کرنے سے پہلے سوچا تھا کہ وہ
 بھی کسی کا بھائی ہے کسی کا بیٹا ہے؟“
 ”مجھے بتاؤ، میں پریشان ہوں کہ میرا بھائی شہباز کہاں ہے؟“
 ”میں نے بتایا تو ہے کہ وہ صفورا گٹھ سے بیس بائیس میل کے فاصلے پر سوزو کی کیری کی خود ساختہ قبر میں پڑا
 ہے جا اسے جا کر لے آ اور کفن و دفن کا بندوبست کر۔“

”عمران! اگر واقعی میرے بھائی کو کچھ ہو گیا ہے تو یہ سمجھ لے کہ تو نے اپنی موت کے پرولنے پر دستخط کر دیے ہیں۔“
 ”بہت پرانا فلمی ڈائلاگ ہے اب تو بہت سارے نئے ڈائلاگ بھی مارکیٹ میں آ گئے ہیں۔ لگتا ہے تم
 آج کل فلمیں نہیں دیکھ رہے ہو؟“
 ”ابھی کر لے بکواس.....“ غنی بلوچ دبا کر بولا۔ ”لیکن جس دن بھی تو میرے ہتھے چڑھ گیا میں.....“
 ”بھونکتا ہے.....“ میں نے کہا۔ ”لیکن پہلے اپنے بھائی کی لاش کا بندوبست کرو ورنہ وہ وہیں سوزو کی
 پڑی پڑی سڑ جائے گی۔“ یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
 پھر میں ریمو کے کمرے میں پہنچا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور وہ ویران ویران نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”تم غنی بلوچ کے ساتھ کب سے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”غنی بلوچ.....!“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”میں غنی بلوچ کو نہیں جانتا۔ ہاں شہباز سے اس کا نام ضرور سنا
 ہے۔“
 ”تم نہیں جانتے کہ غنی بلوچ کون ہے اور وہ کیا کام کرتا ہے؟“
 ”میں یہ تو جانتا ہوں۔“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ”لیکن کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مجھے
 اور مجھ جیسے بہت سے دوسرے لوگوں کو شہباز ہی ہدایت دیتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کی گاڑی
 میں چھپ جاؤں۔“

”تم شہباز کو کیسے جانتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میں تو صاحب! معمولی درجے کا ایک اچکا تھا۔ ہاں ہر قسم کے تالے کھولنے کا فن مجھے آتا تھا۔ میرے
 باپ نے بچپن ہی سے مجھے ایک تالے والے کے پاس بٹھا دیا تھا کہ میرے ہاتھ میں کوئی ہنر آ جائے۔ وہاں رہ کر
 میں نے بہت چھوٹی عمر میں ہر قسم کے تالوں کا سسٹم سمجھ لیا۔ بارہ سال کی عمر میں تو میں نبروں والے تالے بھی
 بہت آسانی سے کھولنے لگا۔“

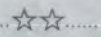
”پھر تم نے اس ہنر کو ناجائز کاموں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا؟“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔
 ”میں کہوں گا مجبوری تھی تو یہ بات ٹھیک نہیں ہوگی۔ اس شہر میں ہزاروں چابیاں بنانے والے جائز طریقے
 سے اپنا رزق کمارے ہیں۔ بس میں اپنے حالات سے مطمئن نہیں تھا۔ بابا کا بھی انتقال ہو چکا تھا اس لیے مجھے
 روکنے کوئی والا بھی کوئی نہیں تھا۔“

میرا استاد جو مجھے کام سکھاتا تھا وہ بھی چل بسا تو اس کے بیٹوں نے اس کی دکان پر قبضہ کر لیا اور مجھے نکال
 باہر کیا، بس اسی دن کے بعد سے میں دکانوں کے تالے کھولنے لگا، گھروں میں گھس کر چوریاں کرنے لگا۔ ایسے
 میں ایک موقع پر ایک دکان کا تالا کھولنے ہوئے علاقے کے چوکیدار نے مجھے پکڑ لیا۔
 اچانک وہاں شہباز اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جیب میں گزرا۔ مجھے دیکھ کر اس نے جیب روک لی اور
 چوکیدار کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا اور مجھے اپنے ساتھ لے گیا، بس اسی روز سے میں شہباز کے ساتھ ہوں۔“
 ”اگر میں تمہیں چھوڑ دوں تو کیا تم شہباز کا ساتھ چھوڑ دو گے؟“ میں نے کہا۔

”مشکل ہے صاحب! اس نے صاف کوئی سے کہا۔“ میں تو اس کا ساتھ چھوڑ دوں گا لیکن وہ مجھے نہیں
 چھوڑے گا۔ اس کے کہنے پر میں نے اتنے غیر قانونی کام کیے ہیں کہ وہ مجھے جیتے جی تو چھوڑنے سے رہا۔“
 ”اور اگر شہباز ہی نہ رہے؟“ تیمور نے جیب سے لہجے میں پوچھا۔

ریمو نے چونک کر تیمور کو دیکھا پھر سم کر بولا۔ ”صاحب! میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔“
 ”مطلب صاف ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اب میں شہباز کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ شہباز کو کیا میں تو غنی بلوچ کو
 بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

یہ پرتحس، سنسنی خیز اور لہورنگ آپ بیتی ابھی جاری ہے
 بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں



”عشاء کی اذان ہوتے ہی وہ گھر سے چلے گئے تھے۔ میں دیر تک اُن کے انتظار میں جاگتی رہی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی پھر رات میں جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔“ میں نے تھانے دار کو تفصیل بتائی۔ تھانے دار نے لفافے میں سے وہی دوپٹہ نکال کر میز پر رکھ دیا جو اسے جانے واردات سے ملا تھا۔

”کیا یہ دوپٹہ تمہارا ہے؟“ تھانے دار نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔
 ”ہاں.....“ دوپٹہ میرا تھا لہذا میں نے اقرار کر لیا۔

”ابھی تم نے کہا کہ تم ساری رات گھر پر تھیں پھر تمہارا یہ دوپٹہ لاش کے پاس کیسے پہنچ گیا؟“
 ”تھانے دار صاحب! یہ دوپٹہ بے شک میرا ہے مگر یہ چھ سات مہینے پہلے چوری ہو گیا تھا۔“

”تم نے اس چوری کا تذکرہ کسی سے کیا تھا؟“
 ”نہیں..... کیونکہ اس واقعہ کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی اسی لیے میں نے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔“

”تمہاری ساس کا کہنا ہے کہ اُس نے دوپٹہ سنگاپور سے آنے والی ایک عورت سے مہنگے داموں خریدا تھا۔“ تھانے دار نے پہلو بدلا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے تمہارا دوپٹہ کون چوری کر سکتا ہے؟“
 تھانے دار نے مجھے گہری نظروں سے دیکھا۔

”جب میرا دوپٹہ چوری ہوا تھا اُس وقت میں ساس سر کے گھر رہتی تھی اور وہاں میری نندا اور میری جیلانی بھی ہوتی ہیں۔ اُن کے علاوہ گاؤں کی دوسری عورتیں بھی ہمارے گھر آتی رہتی تھیں۔ میں کسی ایک پر الزام نہیں لگا سکتی۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارے شوہر کا کوئی دشمن ہے؟“ تھانے دار نے روایتی سوال کیا۔

”جی نہیں اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی کوئی اس کا دشمن ہو ہی نہیں سکتا تھا وہ ایک سیدھا سادہ معصوم شخص تھا۔“ یہ کہتے ہوئے میری آواز بھرا گئی۔
 ”اب تم اپنے بارے میں بتاؤ مجھے تمہارے متعلق بہت غلط قسم کی اطلاعات ملی ہیں۔ اگر تم قاتل نہیں ہو تو مجھے ساری باتیں سچ سچ بتا دو تا کہ میں اصل قاتل کا سراغ لگا سکوں۔“ بظاہر تو حالات تمہارے خلاف ہیں تم مصیبت میں ہو۔“

تھانے دار مجھے مصیبت کا احساس نہ بھی دلاتا تب بھی میں عہد کر چکی تھی کہ اس کے سامنے اپنی تمام حقیقت بیان کر دوں گی پھر چاہے وہ مجھے قتل کے الزام میں گرفتار کر لے یا اس مصیبت میں میری مدد کرے۔ یہ سوچ کر میں نے اسے اپنی داستان حیات سنانا شروع کی تھی۔ وہ میری طرف متوجہ تھا۔

”تھانے دار صاحب! میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئی۔ میرے ابو خاندان کے دوسرے مردوں سے بہت مختلف تھے۔ اُن کا زیادہ وقت شہر میں گزرتا تھا۔ وہ تھوڑے بہت پڑھے ہوئے بھی تھے اس لیے کسی حد تک آزاد خیال تھے اسی آزاد خیالی کی وجہ سے ابو نے خاندان کے تمام لوگوں کی مخالفت کے باوجود مجھے اسکول میں ڈل تک تعلیم دلوائی تھی۔

ہمارے گاؤں میں لڑکیوں کا کوئی علیحدہ اسکول نہیں تھا۔ ایک ہی پرائمری اسکول تھا جس میں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ یا نجویں تک میں نے گاؤں کے اسکول میں پڑھا پھر گاؤں سے ایک میل دور قصبے کے ڈل اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہاں بھی لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔

گاؤں کا ایک لڑکا امجد بھی میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ اس کا باپ فوج میں صوبے دار تھا اور اُن کے پاس بہت سی قابل کاشت زمین بھی تھی اس لیے وہ خاصے کھاتے پیتے اور خوش حال لوگ تھے۔ امجد

اور میں ایک ہی کلاس میں تھے لیکن شروع میں ہمارے درمیان کوئی تعلق نہ تھا۔

جب ہم روزانہ میل بھر بیدل چل کر ڈل اسکول میں جانے لگے تو امجد سے میری دوستی ہو گئی۔ ہم ساتھ ساتھ اسکول جاتے اور اکٹھے ہی واپس آتے۔ امجد بہت شوخ اور سر پر لڑکا تھا۔ وہ ہر وقت مجھے چھیڑتا رہتا۔ اکثر میں اس کی شرارتوں سے تنگ آ کر راض ہو جاتی یا رو پڑتی تب بھی اس کی شوخی و شرارت کم نہ ہوتی۔ مجھے ستانے میں اسے بڑا لطف آتا تھا۔ وہ مجھے چھیڑتے ہوئے کہتا۔

”شبو.....! جب تک تمہیں تنگ نہ کر لوں مجھے چین نہیں پڑتا۔ تم نہیں آتی ہو تو دن میرے لیے طلوع ہی نہیں ہوتا۔“

وقت کے ساتھ ساتھ امجد سے میری دوستہ پنختہ ہو چکی تھی۔ ڈل پاس کرتے ہی ابو نے میری پڑھائی چھڑادی۔ میں گھر کی چار دیواری میں قید ہوئی تو بہت اداس رہنے لگی۔ ہر وقت مجھے امجد کا خیال ستاتا رہتا۔ میرا بی چاہتا کہ امجد ہر وقت میرے پاس رہے مجھے چھیڑے اور ہنسائے مگر وہ بھی ڈل کرنے کے بعد اپنے ماموں کے پاس لاہور چلا گیا تھا اور وہیں آ کے پڑھ رہا تھا۔

گر میوں کی چھٹیوں میں وہ گاؤں آیا تو اُس کی شان ہی زبانی تھی نئے فیشن کے کپڑوں میں وہ بہت خوبصورت تھا۔ اس کا تو حلیہ ہی بدل گیا تھا لیکن میرے لیے وہی امجد تھا۔ وہ مجھ سے ملا تو اس کی باتوں میں وہی پہلے والی بے تکلفی اور شرارت تھی۔ میں کنویں پر چلنے بھرنے جاتی تو وہ بھی پہنچ جاتا اور دیر تک باتیں کرتا رہتا۔ میں اب بھی اس سے روتھتی تھی اور وہ شہے مٹاتا تھا۔ وقت پر لگا کر اڑتا ہے یونہی کھیلنے کھیلنے ہم جوان ہو گئے۔ جب دل میں میٹھا میٹھا درد جاگا اور اپنے اندر اونچائی سی کک محسوس ہوئی تو مجھے محسوس

ہوا کہ امجد مجھے کیوں اچھا لگتا تھا۔ اس کی جدائی مجھے کیوں ستاتی تھی۔ میرا دل خود بخود اس کی طرف کیوں کھینچتا تھا۔ اس کا خیال میرے ذہن و دل پر کیوں چھایا رہتا تھا۔

ایف اے کرنے کے بعد امجد گاؤں آ گیا تھا اور اب اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ پہلے ہم بے دھڑک ایک دوسرے سے ملتے تھے لیکن اب ہم پر زمانے کا خوف غالب آ گیا تھا۔ یہ شاید ہمارے دل کا چور تھا ورنہ کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ رفتہ رفتہ ہماری بے چیدیاں بڑھتی گئیں اور جذبوں میں شدت آتی گئی۔ ہم راتوں کی تاریکی میں ہستی سے دور کھیتوں میں ملنے لگے۔

امجد تمہیں کھا کر اپنی محبت کا یقین دلاتا تھا۔ ”شبو.....! دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے لیکن تجھے اپنی ذہن ضرور بناؤں گا۔“ اس کے خوش کن وعدوں سے میں سرشار ہو جاتی اور جاگتی آنکھوں سے سنے دیکھنے لگتی۔ میں بھی اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی اور اس کے ایک اشارے پر مسکراتے ہوئے موت کو گلے لگانے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

ایک رات میں اور امجد کھیتوں میں بیٹھے اپنے گرد و پیش سے بے نیاز میٹھی میٹھی محبت بھری باتوں میں مصروف تھے۔ امجد میرے زانوں پر سر رکھے لیٹا ہوا تھا میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی کہ اچانک کوئی ہمارے قریب گرج کر بولا۔

”امجد.....!“
 میرا دل دھک سے رہ گیا۔ امجد تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہمارے سامنے امجد کے ابا کھڑے تھے۔ اُن دنوں وہ چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے امجد کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر تین چار ٹھہر جڑ دیئے۔ امجد بھاگ کھڑا ہوا پھر وہ میری طرف مڑے خوف سے میرا رداں رداں کانپ رہا تھا پورا جسم جیسے سن

”او کلتیا..... کیوں میرے بیٹے کو تباہ کر رہی ہے تو؟ تجھ میں شرم و حیا نام کو نہیں کم ذاتِ جادغ ہو جا.....“ غصے میں اُن کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ تو ہن کے احساس سے چورچور میں بڑی مشکل سے گرتی پڑتی گھر پہنچی۔

دوسرے دن امجد کے والد نے میرے ابو کو بلایا اور جب وہ گھر واپس آئے تو اُن کی آنکھوں میں غصہ تھا اور چہرہ سُنا ہوا تھا۔ انہوں نے آتے ہی مجھے چوٹی سے پکڑ کر بے دردی سے مارنا شروع کر دیا۔ اماں نے مجھے بچانے کی بہت کوشش کی مگر ابو نے مجھے اُس وقت تک نہ چھوڑا جب تک میں نڈھال نہ کر بے ہوش نہ ہوگی پھر ابو پر کچھ ایسی وحشت سوار ہوئی کہ انہوں نے میری شادی کی تیاریاں شروع کر دیں اور چند ہی روز میں عظمت سے میرا نکاح کر دیا گیا۔ میں بہت روئی بہت تڑپی مگر میری کسی نے نہ سنی۔ نکاح سے پہلے میں نے امجد سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اُس کے والد نے اُسے ماموں کے پاس لاہور بھیج دیا۔

میرا شوہر عظمت ایک شریف سیدھا سادہ اور مذہبی قسم کا آدمی تھا۔ مجھ جیسی پڑھی لکھی اور خوبصورت بیوی پا کر اُس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا مگر میں اُسے دل سے قبول نہ کر سکی تھی پھر بھی والدین کی عزت و وقار کی خاطر میں نے کوشش کی کہ میں ایک بیوی کا حق ادا کر سکوں اور شوہر کی خدمت کروں مگر امجد کی محبت میرے حواس پر چھانی ہوئی تھی میں اسے بھلا نہ سکی۔ اسی وجہ سے میں اکثر اداس رہتی۔ میری ساس میرا بہت خیال رکھتی اور مجھے خوش رکھنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔

گو کہ مجھ سے پہلے گھر میں ایک بہو موجود تھی مگر میری ساس کی اُس سے ذرا نہ ہمت تھی۔ میری جیٹھانی

یوں تو اُن پڑھتی لیکن فیشن میں شہر کی لڑکیوں کو مات کرتی تھی جبکہ میری ساس کو فیشن کے نام سے تپا تھی۔ میری جیٹھانی کا شوہر یعنی میرا جیٹھو دہلی میں تھا اور سال دو سال بعد ایک ماہ کی چھٹی پر گھر آتا تھا۔ میری شادی ہوئے چار ماہ گزر گئے تھے شوہر اور ساس کی بھرپور توجہ اور چاہت کی وجہ سے میں ازدواجی زندگی میں دلچسپی لینے لگی تھی اور امجد کو اہستہ آہستہ بھولتی جا رہی تھی کہ ایک دن امجد اچانک آ گیا اور اس نے میری پرسکون زندگی میں پھل چھا دی۔ امجد نے مجھے پیغام بھجوایا کہ رات میں مجھ سے ملو۔

میرا پریشان ہونا فطری تھا اب میں ایک شادی شدہ عورت اور کسی کی عزت تھی اور پہلے کی طرح امجد سے راتوں کو نہیں مل سکتی تھی لیکن امجد کی محبت میرے دل میں اٹھ آئی تھی۔ اس نے مجھے بے پناہ چاہا تھا اور میں نے اس کے ساتھ جیسے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ دل کہتا تھا ایک بار ملنے میں کوئی حرج نہیں لیکن محفل اس بات کو رد کر رہی تھی۔

آخر میں نے بہت سوچا اور فیصلہ کیا کہ میں امجد سے ضرور ملوں گی لیکن آخری بار اور اس سے صاف صاف کہہ دوں گی کہ اب تم میری زندگی سے نکل چکے ہو اس لیے مجھ سے کوئی رابطہ نہ رکھو اور قسمت کے فیصلے کو میری طرح ہنسی خوشی قبول کر لو۔

رات کو جب میں امجد کے پاس پہنچی تو وہ مجھ سے مل کر رو پڑا۔ اس کی حالت بالکل پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔ اسے اس حالی میں دیکھ کر میرا دل کٹ کے رہ گیا تھا لیکن میں مجبور تھی میں بھی سوائے رونے کے اور کر بھی کیا سکتی تھی؟

”امجد..... اب رونے دھونے سے کیا ہوگا تقدیر کو یہی منظور تھا۔“ میں نے اس سے کہا۔

”نہیں شہانہ.....! وہ چیخ اٹھا۔“ میں تقدیر کے اس فیصلے کو قبول نہیں کرتا ہمارے ساتھ ظلم ہوا

ہے میرے ظالم باپ نے مجھے تم سے جدا کیا ہے شہانہ.....! میں تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔“ اس نے دیوانوں کی طرح کہا تو میں چونک اٹھی۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو امجد؟“

”ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ یہ شادی تمہاری مرضی سے نہیں ہوئی تم میری ہو شہانہ.....! اس بددھن کو توڑ دو ورنہ میری زندگی کی ڈور ٹوٹ جائے گی۔ تم میرا ساتھ دو شہانہ.....! میں تمہارے پناہ مر جاؤں گا.....“

”لیکن میرا شوہر مجھے طلاق نہیں دے گا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے بے پناہ محبت!“ میں نے بے بسی سے کہا۔

”لیکن تم مجھ سے محبت کرتی ہو شہانہ.....! کیا تم اپنے وعدوں سے پھر چکی ہو؟“ اس کا لہجہ زخمی تھا۔ میرا دل تڑپ اٹھا۔

”امجد.....! میں تمہاری محبت کو اپنے دل سے کبھی نہیں مناسکتی لیکن..... سوچو تو اب ہمارا ملن ممکن نہیں۔“

”اگر تم میرا ساتھ دو تو ہمارا ملن ہو سکتا ہے۔“ امجد کی باتوں نے میرے اندر پھل چھا دی اور اس کی سونٹی ہوئی محبت پھر سے جاگ اٹھی۔ میں ایک بار پھر امجد کے سینے دیکھنے لگی۔ اس کی محبت پھر میرے دل میں انگڑائیاں لینے لگی۔ اس کی چاہت نے مجھے مجبور کر دیا کہ تقدیر کے فیصلے کو تدبیر سے بدل دوں۔

شوہر سے طلاق کے لیے امجد نے مجھ سے کہا۔

”تم اپنے شوہر سے کھلم کھلا نفرت کا اظہار کر دو ساس سے بھی اپنا رو دینا تو ہن آ میر رکھو.....“

میری زندگی خوشگوار ہی نہ تھی بلکہ مثالی اور قابل رشک تھی مگر میں امجد کی خاطر اس جنت کو چاڑھنے پر تل گئی۔ انہی دنوں میرے ابو کا انتقال ہو گیا۔ اب میں بالکل آزاد تھی روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ تھا۔ میں

نے امجد کے منصوبے پر عمل شروع کر دیا اور اپنی گھریلو زندگی میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ ساس سے بات بے بات لڑائی ہونے لگی۔ شوہر سے بھی بات بے بات جھگڑ پڑتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا گھر جہاں دنیا زمانے کا سیکھ چین تھا اب اس کی نفضا بے چینی سے آلودہ ہو گئی تھی۔

ایک دن میں نے جان بوجھ کر گلی میں امجد سے علیک سلیک کی اور کافی دیر تک اس سے بے تکلفی سے باتیں کرتی رہی۔ میری توقع کے عین مطابق یہ بات میری ساس اور شوہر تک پہنچ گئی مگر مجھ سے کسی نے کچھ نہ کہا البتہ میرا شوہر اداس اداس رہنے لگا۔ ساس اب یقینی طور پر مجھے بدچلن سمجھنے لگی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے وہ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتی اس کی نظروں میں اب میری کوئی عزت نہ رہی تھی۔

ایک روز چھوٹی سی بات پر میں اپنی ساس سے خوب لڑی۔ اس جھگڑے میں میری زبان سے انتہائی گھٹیا اور غیر مہذب الفاظ نکلے جس کی میں نے اسے گالیاں تک دیں۔ اُس وقت میرا شوہر گھر میں تھا۔ گالیوں کی آواز اُس کے کانوں میں بھی پڑ گئی۔ وہ اپنی ماں کی یہ تو ہن برداشت نہ کر سکا اور غصے میں مجھے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔

شوہر سے مجھے اس وحشانہ سلوک کی توقع نہ تھی لیکن ماں کی محبت میں وہ پاگل سا ہو گیا تھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں ساس کو کوسنے اور گالیاں دیتی ہوئی اپنی اماں کے پاس آ گئی۔

دوسرے دن میرا شوہر پیشانی سے صورت لیے میرے پاس آیا اور مجھ سے اپنی زیادتی کی معافیاں مانگنے لگا۔ وہ مجھے گھر لے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اور میری ماں نے اسے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا پھر وہ خود نہیں آیا بلکہ گاؤں کے معزز لوگوں کو اماں کے پاس بھیجا کہ شہانہ کو گھر بھیج دیں مگر میں

ابھی جانا نہیں چاہتی تھی اس لیے ہر بار ٹال منول سے کام لیتی تھی۔

میں دو ماہ تک میکے میں بیٹھی رہی پھر الگ مکان کی شرط پر اپنے سسرال واپس گئی۔ میرے شوہر نے نہ صرف یہ شرط مان لی بلکہ چند دنوں میں اس پر عمل بھی کر دیا۔ میرے سسر کا آبائی گھر کافی عرصے سے خالی پڑا تھا اور وہ لوگ نئے مکان میں رہتے تھے۔ نیا مکان میرے جیٹھ نے بنوایا تھا۔ میرے سسر کا وہ مکان گاؤں کے عین وسط میں تھا۔ میرے شوہر نے اس کے مکان کی صفائی کروائی اور ہم اس میں رہنے لگے۔

الگ مکان میں آنے سے یہ فائدہ ہوا کہ میری اور امجد کی ملاقاتوں میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ امجد کا گھر میرے گھر سے ایک مکان چھوڑ کر تھا۔ رات کو جب میرا شوہر عشاء کی نماز پڑھنے جاتا تو امجد اپنے مکان کی چھت پر چڑھ کر کچھ کے مکان کی چھت سے ہوتا ہوا میرے مکان کی چھت پر آ جاتا اور میں شوہر کے آنے تک اس سے باتیں کرتی رہتی۔

پہلے ہماری محبت ہر گندگی سے پاک تھی مگر ان ملاقاتوں کے دوران ہم گناہوں کی دلدل میں وھستے چلے گئے۔ میں نے بھی یہ سوچ کر خود کو امجد کے حوالے کر دیا کہ بالآخر مجھے اس سے شادی کرنا ہے۔ اسی طرح چھ ماہ گزر گئے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ امجد کی محبت بھی سرد پڑتی چلی گئی۔ اب وہ اکثر ایک دو دن کا نانا گھر کے مجھ سے ملنے لگا۔ ایک روز میں نے شکوہ کیا تو اس نے نہایت بے زاری سے کہا۔

”میں صرف تمہارے ہی خیال میں تو نہیں رہتا“ مجھے اور بھی کام ہوتے ہیں۔“ اس کی بات اور لہجے سے میرا دل انجانے وسوسوں میں بھر گیا۔ کہاں تو میرے بغیر اس کا ایک پل گزرتا مشکل ہوتا تھا اور

اب وہ مجھ سے کتزار ہا تھا۔ میں اس سے شادی کے متعلق بات کرتی تو وہ ٹال جاتا۔ اس حوالے سے جتنا میں سوچتی تھی اتنا پریشان ہوتی کہ اگر امجد نے مجھے اس حال میں چھوڑ دیا تو میں کہاں جاؤں گی؟

ایک رات میں اور امجد گھر میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک عظمت آ گیا۔ میرے شوہر کو دیکھتے ہی امجد تو راز آئیں یہاں چڑھ کر بھاگ گیا۔ عظمت کی آنکھیں مارے غصے کے ابل پڑیں۔ اس نے ایک ڈنڈے سے مجھے اس بے دردی سے مارا کہ میں بے ہوش ہو گئی۔

صبح مجھے ہوش آیا تو عظمت پشیمان سا میرے پاس بیٹھا تھا۔ میرے انگ انگ سے ٹپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ امجد نے مجھے گرم دودھ میں گھی ملا کر پلایا۔ مجھے عظمت پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ نادم اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے ہمیشہ کے لیے گھر سے نکال دے گا۔ میں کئی روز تک بستر پر پڑی اپنی چوٹیں سہلائی رہی پھر جب چلنے پھرنے کے قابل ہوئی تو عظمت مجھ سے بولا کہ میں تمہیں جلد ہی آزاد کر دوں گا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے میکے جانے کو کہا۔ اس نے یہ سب ایسے دکھی انداز میں کہا کہ میرے دل میں کہیں چوٹ سی گئی۔ اس لمحے مجھے عظمت بہت ہی عظیم لگا۔ وہ مجھ آوارہ اور بد چلن کے ساتھ بھی کتنی نرمی اور خلوص سے پیش آ رہا تھا حالانکہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میں اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی اس لیے اس نے مجھے طلاق دینے کا فیصلہ کر لیا تھا یہ فیصلہ کرتے وقت اس کے چہرے سے پڑمانے پھر کی ادا سی تھی۔ اس کا چہرہ بگھا ہوا تھا کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا بے پناہ محبت!

عظمت اپنا فیصلہ سنا کے گھر سے باہر چلا گیا لیکن مجھے ایک عجیب وحشی اذیت میں مبتلا کر گیا۔ مجھے اپنا آپ بہت ہی گھٹیا اور ذلیل محسوس ہو رہا تھا۔ اس

میں کوئی شک نہیں کہ وہ مجھے بے پناہ چاہتا تھا اور مجھے چھوڑنا بھی چاہتا تھا مگر میری خوشی کی خاطر اس نے اپنے دل پر پتھر رکھ کر یہ فیصلہ کیا تھا۔ عظمت نے مجھے اماں کے گھر جانے کو کہہ دیا تھا مگر اب یہ سوچ کر ہی میرا دل ڈوبنے لگا تھا کہ اگر میں میکے چلی گئی تو عظمت مجھے کبھی لینے نہیں آئے گا اور مجھے طلاق دے دے گا۔

پہلے میں عظمت سے طلاق لینا چاہتی تھی مگر اب نہ جانے کیوں طلاق کے نام سے ہی مجھے خوف آنے لگا تھا۔ میں عجیب کرب و اذیت سے دوچار تھی اور فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ عظمت کا گھر چھوڑوں یا نہ چھوڑوں؟ میں اُس دن ماں کے گھر نہیں گئی۔ عظمت نے بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ چار دن تک ہم اجنبیوں کی طرح ایک ہی گھر میں رہتے رہے۔ پانچویں دن اُس نے مجھ سے محض اتنا پوچھا تھا۔

”تم اپنے گھر نہیں گئیں؟“ میرے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے سر جھکا لیا اور نہ جانے کیوں میری آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے بعد پھر ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو گئے۔ میں ہی کبھی کوئی بات نہ کرتی تو وہ ہوں ہاں میں جواب دے دیتا لیکن بات کرنے میں کبھی پہل نہ کرتا تھا۔ اب وہ زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہنے لگا تھا۔ گھر میں ہوتا تو خالی خالی نگاہوں سے خلا میں گھورتا رہتا۔

کئی دن یونہی گزر گئے۔ میں نے اس دوران امجد سے کہہ دیا کہ آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ امجد نے پلٹ کر اس کی وجہ بھی نہیں پوچھی جس شخص کی خاطر میں اپنے شوہر اور ساس سے بری بنی جس کی وجہ سے میری زندگی تباہ ہوئی وہی اب مجھ سے کتزار ہا تھا۔ میں نے تمام حالات پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ عظمت سے طلاق لینے کے بعد میں بالکل ہی تباہ و برباد اور بے آسرا ہو جاؤں گی۔ امجد

سے اب مجھے کوئی خوش گمانی نہ تھی۔ آخر بہت سوچنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ عظمت کے قدموں میں گر کر اس سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگوں گی۔ مجھے امید تھی کہ وہ مجھے معاف کر دے گا کیونکہ وہ بہت اچھا انسان تھا۔ اُس رات یہ فیصلہ کر کے میں مطمئن ہو کر سو گئی تھی۔ میں نے سوچا صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے عظمت کو مناناؤں گی لیکن اگلی صبح وہ میرے جاگنے سے پہلے ہی گھر سے نکل چکا تھا۔ وہ تمام دن گھر سے باہر رہا اور رات ہونے کے بعد گھر آیا۔ میں کھانا تیار کر چکی تھی۔ میں نے کھانا اس کے سامنے رکھ دیا۔

اس نے کھانا کھایا۔ میں برتن اٹھا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ جب میں واپس صحن میں آئی تو عظمت گھر سے نکل رہا تھا۔ اُس وقت مسجد سے عشاء کی اذان گونج رہی تھی۔ اُس وقت میں نے اُسے روکنا مناسب نہ سمجھا مگر میں نے سوچ رکھا تھا کہ چاہے وہ آدھی رات کو ہی کیوں نہ واپس آئے میں اس کے انتظار میں جاگتی رہوں گی اور جب وہ آئے گا تو اس کے قدموں میں گر جاؤں گی۔ میں رات گئے تک جاگتی رہی تھی پھر نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ صبح اٹھی تو ہر طرف یہی آوازیں تھیں۔ ”عظمت قتل ہو گیا.....“ عظمت کو کسی نے مار دیا.....“ میں اپنی داستان حیات سنا کر خاموش ہو گئی۔ تھانے دار بغور میری شکل دیکھ رہا تھا۔

اُس نے میری تمام باتیں پوری توجہ سے سنی تھیں۔ وہ کچھ دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ ”تمہاری یہ کہانی اگر حقیقت ہے تو پھر تمہارے شوہر کے قتل کی دو وجہ سامنے آتی ہیں ایک تو تمہارا معاشرہ جس میں تم اور امجد دونوں ہی یہ جرم کر سکتے ہو دوسری وجہ یہ ہے کہ تمہارے شوہر نے تمہاری طرف سے مایوس ہو کر کسی دوسری عورت سے تعلقات استوار کر لیے ہوں اور اس عورت کے وارثوں میں سے کسی نے

اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو لیکن میں فی الحال کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتا۔ میں اپنی تحقیقات جاری رکھوں گا اور جلد ہی اصل معاملہ سامنے آ جائے گا۔ اگر تمہیں اپنے مقتول شوہر کے بارے میں کوئی نئی بات معلوم ہو تو بلا تاخیر مجھے بتا دینا۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“

اس کے بعد پولیس کی تحقیقات کی کہانی کافی طویل ہے، جہاں تک امجد کا تعلق ہے وہ صاف سچ نکلا تھا کیونکہ واردات کی رات سے دو دن قبل ہی وہ لاہور چلا گیا تھا اور اب بھی وہیں تھا۔ ویسے بھی امجد کے والد نے اپنا اثر و رسوخ بھی استعمال کیا تھا۔ اس قتل میں صرف میری ہی ذات مشکوک تھی یا پھر بقول تھانے دار کسی غیر عورت کے تعلقات ہی اس کی موت کا سبب ہو سکتے تھے لیکن تھانے دار اب تک ایسی کسی عورت کا سراغ لگانے میں ناکام رہا تھا۔ تھانے دار نے مجھ سے کئی بار پوچھ گچھ کی تھی مگر اس نے مجھے حراست میں نہیں لیا تھا۔ میں بہت خوف زدہ تھی اور مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ تھانے دار چاہتا کیا ہے؟ وہ کس اور کتنے پر اپنی تحقیقات کر رہا تھا لیکن پھر اچانک ایک اور سنسنی خیز اور شرمناک انکشاف ہوا جس نے تمام الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھا دیا۔

میرا جیٹھ گزشتہ پندرہ برس سے دہلی میں تھا۔ وہ سال میں ایک دفعہ یا کبھی دو سال میں ایک دفعہ پاکستان آتا تو گاؤں بھر کی عورتیں ہمارے گھر جمع ہو جاتی تھیں اور اس کی لائی ہوئی قیمتی چیزوں اور کپڑوں کو حیرت سے دیکھتی تھیں۔ میرا جیٹھ دہلی میں خوب دولت کما رہا تھا۔ اسی کی کمائی سے میرے سرال والوں نے ایک وسیع و عریض اور نہایت خوبصورت مکان بنایا تھا۔ میرے جیٹھ کے پاس پیسے کی فراوانی تھی اس وجہ سے والدین بھی اس سے

دبتے تھے۔

اس کی بیوی ذکیہ بالکل اُن پڑھتی تھی لیکن اسے فیشن کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ وی سی آر پر انڈین فلمیں دیکھ دیکھ کر خود کو ہیر و ہن بھجھتی تھی۔ وہ نئے نئے فیشن کے کپڑے سلوایا کرتی اور ہر وقت نئی سنووری رہتی تھی۔ اس کے میک اپ کے سامان اور خوشبوؤں کا ایک ڈھیر تھا۔

اسے یہ غرور بھی تھا کہ سارا خاندان اس کے شوہر کی کمائی پر پل رہا ہے۔ وہ بات بے بات ساس کو طعنے دیتی ہر بات میں اپنی من مانی کرتی اسی وجہ سے میری ساس نے اس سے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ آزاد پرندے کی طرح جہاں چاہتی چلی جاتی، نہ اس پر کوئی روک ٹوک تھی اور نہ ہی کوئی اسے کچھ کہہ سکتا تھا۔

میرے شوہر کے قتل کے ایک ماہ بعد ذکیہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ میرے سراسی وقت ایک لیڈی ڈاکٹر کو لے آئے۔ ڈاکٹر نے ذکیہ کو دیکھتے ہی بتا دیا کہ اس نے زہر کھایا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر نے ایک اور سنسنی خیز انکشاف کیا کہ ذکیہ ماں بننے والی ہے۔ میری ساس اور سسر دونوں گنگ رہ گئے اُن کی حیرت دیکھنے کے قابل تھی۔ یہ کیسے ممکن تھا؟ پھر اس کے پیٹ میں کس کا گناہ تھا؟ یہ سوال سانپ بن کر ہر ایک کو ڈنڈے لگا۔ اب ذکیہ کے زہر کھانے کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی تھی اپنا گناہ چھپانے کے لیے اس نے مرنے کی کوشش کی تھی۔ اس انکشاف سے میرے شوہر کے قتل کا معمہ بھی حل ہو گیا۔

تھانے دار جو اپنے طور پر قتل کی تحقیقات کر رہا تھا میں نے یہ خبر فوراً تھانے دار تک پہنچا دی۔ وہ اسی وقت میرے سسر کے گھر پہنچ گیا۔ یہ شرمناک بات ابھی تک عام نہیں ہوئی تھی۔ گھر کے افراد اور ایک

بڑی عیالہ کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ مجھے بھی اس کے بڑبیبوں کے ذریعے اطلاع ملی تھی۔ تھانے دار کو دیکھ کر میرے سسر حیران رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ یہ خبر اتنی جلدی پولیس تک پہنچ جائے گی۔

تھانے دار نے ذکیہ سے پوچھ گچھ کی خواہش ظاہر کی۔ وہ اب ہوش و حواس میں تھی۔ وہ تو اپنے گناہ کے انکشاف سے پہلے ہی خوف زدہ تھی، تھانے دار کو دیکھ کر مزید گھبرا گئی، اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ وہ سمجھی کہ تھانے دار اسے اقدام خودکشی کے کیس میں گرفتار کرنے آیا ہے لیکن اس کے برعکس تھانے دار کا پہلا سوال ہی بوکھلا دینے والا تھا۔

”تمہاری وجہ سے عظمت مارا گیا، تاؤ اسے کس نے قتل کیا، تمہارے باپ نے یا بھائی نے؟“ ذکیہ گھبراہٹ میں رونے لگی۔ تھانے دار نے اسے نرمی سے سمجھایا کہ اگر وہ سب کچھ سچ بتا دے گی تو سزا سے بچ جائے گی چنانچہ اس نے سب کچھ گل دیا۔ ذکیہ نے گاؤں کے ایک ادھیڑ عمر اسکول ماسٹر سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے تھے جس کا نتیجہ اس کی بیاہی اور بربادی کا باعث بن گیا۔ وہ ماسٹر چار ماہ سے گاؤں کے اسکول میں پڑھا رہا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ڈرم ڈرو بھی کرتا تھا اور تعویذ گنڈے بھی دیتا تھا۔ گاؤں کے لوگ اسے عامل کامل سمجھتے تھے اور اس کا بہت احترام کرتے تھے۔ وہ بچوں کو قرآن پاک بھی پڑھاتا تھا۔

ذکیہ کا میک اپ اسکول کے بالکل ساتھ تھا۔ وہ اپنے شوہر کو اسی ماسٹر سے خط لکھوایا کرتی تھی۔ پہلے تو صرف یہ تعلق خط لکھوانے اور پڑھوانے تک محدود رہا پھر ذکیہ نے ماسٹر سے اپنے شوہر کو اپنا غلام بنانے کے لیے تعویذ وغیرہ بھی لینا شروع کر دیئے۔ ان تعویذ گنڈوں کی آڑ میں ماسٹر اسے دونوں ہاتھ سے

لوٹتا رہا۔ وہ دونوں آپس میں کھل مل گئے تھے۔ گاؤں کی دوسری عورتیں بھی اسی ماسٹر کے پاس اپنے اپنے روگ دور کرنے کی خاطر جاتی رہتی تھیں اسی لیے ذکیہ کے اس سے ملنے پر کسی کو اعتراض نہ ہوا۔

ذکیہ اس ماسٹر کو بہت قابل احترام سمجھتی رہی۔ اس نے بتایا کہ ایک دفعہ جب میرا شوہر دہلی سے آنے والا تھا تو ماسٹر نے مجھ سے کہا کہ تم رات کو میرے پاس آنا، میں تمہیں ایک بہت خاص تعویذ دوں گا۔ ذکیہ اُن بڑھی اور تو ہم پرست تھی اس لیے بغیر سوچے سمجھے رات کو ماسٹر کے پاس چلی گئی۔ اس رات ماسٹر نے اسے اپنا گھناؤنا روپ دکھایا، اس نے ذکیہ کو نجانے کیا چیز سگھائی کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو وہ لٹ چکی تھی وہ روتی دھوتی گھر آ گئی۔

شوہر کے آنے کے بعد وہ اس بات کو بھول گئی لیکن شوہر کے دہلی جاتے ہی وہ پھر ماسٹر کے پاس جانے لگی لیکن اب وہ اپنی مرضی سے وہاں جاتی تھی کیونکہ شوہر کی غیر موجودگی میں ماسٹر اس کی ضرورت بن گیا تھا۔ وہ اگر بھی نہ بھی جاتی تو اسے ماسٹر کے پاس جانا پڑتا کیونکہ ماسٹر نے اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح ذکیہ گناہ کی اس تار کی میں ڈوبتی چلی گئی اور بالآخر اس کے گناہ کا پھل سامنے آ گیا۔ ذکیہ کو اس لرزہ خیز حقیقت کا علم بہت پہلے ہو چکا تھا۔ اس نے اس مصیبت کا ذکر ماسٹر سے کیا تو اس نے کوئی توجہ نہ دی اور بے پروائی سے کہہ دیا کہ میں اس مصیبت سے جلد ہی تمہیں چھٹکارا دلا دوں گا۔ اس کے بعد ماسٹر نے ذکیہ میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔ ذکیہ اس صورت حال سے بہت پریشان اور فکر مند رہنے لگی۔ جب اس کا گناہ ظاہر ہونے لگا تو اس نے ماسٹر کو خدا اور رسول کے واسطے دے کر

غزل

تم کوئی سوال مت کرنا
 آنسوؤں کا خیال مت کرنا
 یاد کر کے پچھلی یادوں کو
 اپنا جینا محال مت کرنا
 تیرے لفظوں سے کوئی زخمی ہو
 ایسی قائم مثال مت کرنا
 زندگی کا سفر کوئی بھی ہو
 چاہتوں کو ٹھحال مت کرنا
 کچھ دنوں میں ہی لوٹ آنا تم
 جا رہے ہو تو سال مت کرنا
 رنج رانا جو پہنچے اس دل کو
 ایسا کوئی سوال مت کرنا

قدیر رانا

کہ میری اور عظمت کی ازدواجی زندگی اور میری
 چلن کیا ہے انہوں نے حالات سے فائدہ اٹھا کر
 کے لیے مجھے مجرم ٹھہرانے کا مکمل منصوبہ تیار کر
 ماشرنے ذکیہ سے کہا کہ عظمت کی بیوی کے اس
 کی کوئی چیز یہاں لاکر ڈال دو تاکہ تل کا شہ فرور
 پہ جائے۔ ذکیہ گھر آ کر وہی دوپٹہ لے گئی جو اس
 کافی عرصے پہلے میرے بس سے چرایا تھا۔ اس وقت
 وقت اس نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ وہ دوپٹہ یوں
 کے کام آئے گا۔ اس نے تو محض خوبصورت اور
 سمجھ کر دوپٹہ چرایا تھا۔ اس نے اس دوپٹے کو
 کی لاش کے پاس ڈال دیا اور یہی اس کی بنیادی
 تھی۔

تھانے دار نے مجھے بتایا کہ میں جائے داردار
 پر وہ دوپٹہ دیکھ کر ہی کھٹک گیا تھا کیونکہ کوئی بھی
 خواہ کتنا ہی جاہل اور بے وقوف کیوں نہ ہو اس کی
 غلطی نہیں کر سکتا۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا
 قاتل نے اپنا جرم کسی اور پر تھونے کی کوشش
 ہے۔ کوئی عورت اگر کسی مرد کو قتل کر سکتی ہے تو وہ
 بے وقوف ہرگز نہیں ہو سکتی کہ جائے واردات پر
 دوپٹہ ہی بھول جائے۔ تھانے دار نے اسی لیے
 حراست میں نہیں لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ
 جائے واردات پر وہ دوپٹہ نہ ہوتا تو وہ مجھے
 گرفتار کر لیتا۔

ماشرنے کو اسی دن گرفتار کر لیا گیا اور میں تارک
 کی زد میں آنے سے بچ گئی۔ تھانے دار کی ذہنی
 اور خدا کی مہربانی تھی جس نے مجھ گناہ گار کو
 کے پھندے سے بچالیا تھا۔
 ذکیہ کے زہر کھانے پر اس کے خلاف
 خودکشی کا کیس بنا تو اس نے عدالت میں بتایا
 میں نے خود نہیں کھایا تھا بلکہ ماشرنے نے مجھے
 طور پر دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ جرم کے احساس

مجھے کسی طرح اس بدنامی اور ذلت سے بچاؤ۔ ماشرنے
 نے اس سے رات کو گاؤں سے باہر ملنے کا وعدہ کیا۔
 وہ دونوں رات کو گاؤں سے باہر ایک کھنڈر میں
 ملے۔ ذکیہ نے رورور کر اس سے اپنی مصیبت بیان
 کی۔ اس پر ماشرنے بولا۔ ”تم بہت بھولی ہو ذکیہ.....!
 تم سمجھتی ہو تمہارا گناہ میں اپنے سر لے لوں گا اور اپنی
 عزت کو اپنے ہاتھوں خاک میں ملا لوں گا۔ اپنا گناہ
 میرے سر کیوں تھوپتی ہو؟“ یہ سن کر ذکیہ پیش میں
 آئی اور اسے بے نقط سنائیں۔ رات کے سناٹے
 میں دونوں کی آواز دور دور تک گونج رہی تھی۔ ذکیہ
 پر جنون سوار تھا اس نے غصے میں ماشرنے کی پیٹ تار تار
 کر دی۔

جب ان میں ٹکرا ہو رہی تھی تو میرا شوہر عظمت
 یہ آوازیں سن کر وہاں آ گیا۔ اس نے ان دونوں کو
 پہچان لیا اور اچانک اس نشیب میں اتر آیا جہاں وہ
 دونوں بیٹھے ہوئے تھے۔ جوش غیرت میں عظمت
 نے اس پر حملہ کر دیا۔
 ماشرنے جسامت میں عظمت سے کہیں زیادہ تھا
 اس نے عظمت کا گلا دبوچ لیا اور اس وقت تک دباتا
 رہا جب تک عظمت بے دم ہو کر ڈھے نہ گیا۔
 پھر ان دونوں کو ہوش آیا وہ دونوں بہت بری
 طرح گھبرا گئے۔ اب ذلت و رسوائی کے ساتھ ساتھ
 ان کے ہاتھ بے گناہ کے خون سے داغ دار ہو گئے
 تھے۔ ذکیہ تو اس وقت خوف سے اپنا ذہنی توازن ہی
 کھو بیٹھی تھی۔ ماشرنے اس وقت اسے سمجھایا کہ میرا
 ارادہ اسے قتل کرنے کا ہرگز نہ تھا، بس کچھ
 غیر متوقع طور پر ہو گیا تھا۔ اب ہمیں اس مصیبت
 سے بٹنے کے لیے کچھ سوچنا چاہیے۔

وہ لوگ کافی دیر تک اس سے چھٹکارا پانے کے
 منصوبے بناتے رہے پھر انہوں نے اپنا جرم میرے
 سر تھوپنے کا منصوبہ بنا لیا۔ ماشرنے اور ذکیہ جانتے تھے

نیلم الماس مغل

روپ بھروپ

ارتقاء وارثی کا خیال
کھوئی ہوئی سی چشم حقیقت نگر ہے آج
حسن نظر بھی ایک فریب نظر ہے آج

اس روپ کی رانی کا قصہ جس نے بہرہ دیا تو بھرا تھا مگر.....



چھتتاوانا سورتی طرح ہوتا ہے جو کبھی بھی نہیں
خبرتا ہمیشہ رستار ہوتا ہے اور انسان کو دیکھ کر
کی طرح چاٹ جاتا ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ہر
کام کو اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے بعد کرنا چاہیے۔
ایسا فیصلہ ایسی بات یا ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جو بعد
میں پچھتاوے کا موجب بنے۔

میرا نام حماد علی رضوی ہے۔ میں ایم بی اے
کرنے کے بعد ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کر رہا
ہوں۔ بظاہر تو میری زندگی بہت مطمئن اور بڑی
شان سے رواں دواں ہے لیکن میرے اندر کا
پچھتاوا مجھے مارے دیتا ہے۔ میں لمبے عرصے سے
اس بوجھ کو اپنے سینے میں دبائے پھر رہا ہوں۔

یہ اُن دنوں کا قصہ ہے جب مجھے اس فرم کو
جوائن کیے ہوئے ڈھائی ماہ ہوئے تھے کہ مشعل نامی
ایک لڑکی نے ہمارے آفس کو جوائن کیا۔ مشعل حد
سے زیادہ حسین تھی اور دوستانہ مزاج کی لڑکی تھی۔

سادہ دل پر خلوص سیدھی دل میں اتر جانے والی اس
کی لمبی لمبی سیاہ بھنورا آنکھوں اور دودھ جیسے سفید بے
دانش چہرے کو جو کوئی ایک بار دیکھتا دوبارہ دیکھنے کی
چاہ ضرور کرتا۔

میں نے پہلی بار اسے دیکھا تو میرے دل کے
تار چھڑ گئے۔ مجھے لگا جیسے مجھے میرے خوابوں کو ملکہ
مل گئی ہو۔ میرے خوابوں میں بھی ایسی ہی حسینہ کا
گزر ہوتا تھا۔

وہ تھی ہی ایسی بلا کی پرکشش حسن و معصومیت کا
مکمل استراج مجھے اس سے دوستی کرنے میں زیادہ
دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیونکہ وہ اپنی فرینک
نیچر کی وجہ سے ناصر فرم کے دوسرے
کولیکٹرز کی بھی بہت اچھی دوست بن گئی تھی۔ ہر قسم
کے موضوعات پر ڈھیروں باتیں کرنا اس کی باہمی تھی۔
میں نے محسوس کیا تھا کہ باقی کولیکٹرز کے مقابلے میں

مشعل کا جھکاؤ میری طرف زیادہ تھا۔ ایک تو میں
اس سے عمر میں بھی کچھ خاص بڑا نہ تھا اور دوسرا مجھے
باتیں کرنے کا ہنر آتا تھا۔ اگر یوں کہا جائے کہ میں
باتوں کا ماہر یا لفظوں کا کھلاڑی ہوں تو کچھ غلط نہ
ہوگا۔ خود کے بارے میں میرا کہنا یہ تھا کہ میں اپنی
باتوں سے کسی کو بھی متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا
ہوں اسی لیے میں پوری دلجمعی سے مشعل کو متاثر
کرنے کی تک و دو میں لگا ہوا تھا اور جس میں مجھے
کامیابی بھی حاصل ہو رہی تھی۔

وہ سردیوں کے شروع کے دن تھے موسم کی
طرح میرا موڈ بھی بہت فریش تھا۔ اُس روز میں
آفس میں پہنچا تو دو تین کولیکٹرز ہی آئے تھے۔ میری
کیمین پر فائلنگ کا انبار سا پڑا ہوا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں
سے طبیعت پرستی سی چھانی رہی تھی جس کی وجہ سے
میں اپنا کام مکمل جانفشانی سے کر ہی نہیں سکا تھا اور
کل باس کی ڈائنٹ سننے کے بعد مجھے کام کرنے کا
خیال آیا تھا۔

باس نے ڈائنٹے ہوئے کہا تھا۔ ”اگر آپ کو اس
جاب کی ضرورت ہے تو سیریس ہو جائیں بصورت
دیگر میرے پاس مٹنی اور میٹنگ لوگوں کی کمی نہیں
ہے۔“ باس کے الفاظ مجھے تیر کی مانند لگے تھے۔
اگرچہ باس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ جائز تھا مگر اس
کے باوجود میرا موڈ خراب ہو گیا تھا کیونکہ بے عزتی
خواہ جائز ہو یا ناجائز اسے اچھی لگتی ہے۔

میں خلاف معمول اپنے کام میں مصروف تھا
جبکہ مشعل خوب چپک رہی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ہی کام
کم اور باتیں زیادہ کرنے کی عادی تھی اور آج تو
اُس کی چپکار کا جواب دینے کے لیے کاشف بھی
موجود تھا۔ کاشف بھی اس ادارے میں میرے ساتھ
ہی اپائنٹ ہوا تھا۔ وہ حد سے زیادہ باتوں اور شوخ
طبیعت والا لڑکا تھا۔ اس کی کمپنی میں کوئی بور نہیں

ہوسکتا تھا پر میری اس سے نہیں بنتی تھی، مجھے وہ ایک نمبر کا لوفر لگتا تھا۔ میں اس قدر مصروف رہا کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔

لنچ ٹائم ہو رہا تھا، میں نے وقت دیکھا تو دو بجے میں صرف چند منٹ ہی باقی تھے۔ بھوک کی وجہ سے میرے پیٹ میں چوبے دوڑ رہے تھے۔ میں تمام ضروری فائلز کو کیبنٹ میں رکھ کر لاک لگانے لگا اور اس سے پہلے کہ میں مشعل کو رکنے کے لیے آواز دیتا ہوا مہربن اور کاشف کے ساتھ چلی گئی۔ میرے دل پہ جیسے پتھو نے ڈنک مارا جب سے مشعل نے آفس جوآن کیا تھا تب سے ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا تھا ہم نے ساتھ لنچ نہ کیا ہوا اور آج جب وہ میرے بغیر ہی لنچ کرنے چلی گئی تو میرے دل کو جیسے کچھ کے سے لگے۔ میرے موڈ کا ستیا ناس ہو گیا۔ بھوک کی وجہ سے میرے پیٹ میں ناپتے کودتے چوبے بیکدم ہی ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے اور میں اپنے دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔

پھر اکثر یونہی ہونے لگا، وہ میرے علاوہ دوسروں کے ساتھ بھی لنچ کرنے لگی تھی۔ میں روز بروز اپنے کام میں مصروف ہوتا گیا اور وہ مجھ سے دور ہوتی گئی۔ یہ میرا خیال تھا جبکہ اس کے مطابق تو وہ اب بھی مجھ سے پہلے کی طرح ہی ٹریٹ کرتی تھی۔ بقول مشعل کہ میرا شمار اب بھی اُس کے ہیٹ فرینڈز میں ہوتا تھا۔

خیر، یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر ایک دن جب وہ مجھے برتھ ڈے وٹ کرنا بھول گئی تو میرا غصے کی وجہ سے برا حال ہو گیا اور میں نے اس سے بات ختم کر دی۔

وہ پورا ایک ہفتہ میری منتیں کرتی رہی، مجھ سے ناراضگی کی وجہ پوچھتی رہی، مجھے منانے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی، تب کہیں میرا دل لہج گیا اور جب

میں نے اسے اپنی ناراضگی کی وجہ بتائی تو وہ کتنی دیر تک مجھے حیران نظروں سے دیکھے گی۔

”کیا تم واقعی اس وجہ سے مجھ سے ناراض تھے؟“ وہ گویا ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔ ”ہاں۔“ اس کی حیرانگی نے مجھے گل سا کر دیا۔ ”اوہ گاڈ! تو تم اس لیے اتنا ناراض تھے؟“ ”یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی ناراض ہونے کی تم جانتے ہو میری بھلکھلو طبیعت کو میں تو اکثر اپنا برتھ ڈے بھی بھول جاتی ہوں۔“ اپنی بات پہ وہ خود ہی مسکرائی۔

”اپنا برتھ ڈے تو اکثر لوگ بھول جاتے ہیں۔ لاسٹ ٹائم تو مجھے بھی یاد نہیں رہا تھا لیکن دوستوں کا برتھ ڈے یاد رکھنا چاہیے، نہ صرف یاد رکھنا چاہیے بلکہ انہیں وٹس بھی کرنا چاہیے۔“

”اوکے فائن اینڈ سوری اب ایسا نہیں ہوگا۔ آئندہ سے نا صرف میں تمہارا برتھ ڈے یاد رکھوں گی بلکہ سب سے پہلے وٹس بھی کروں گی۔“ وہ ہلکا سا مسکرائی۔

”اوکے۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”اب تو ناراض نہیں ہونا؟“ ”نہیں۔“ ”اچھا، کافی منگوا لوں میں؟“

”ہاں منگوا لو۔“ میں نے اپنے سامنے رکھی فائل بند کر دی۔

مشعل کو کاشف کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتا دیکھ کر میرے دل میں جولاوا پکنا تھا میں اسے کوئی نام نہیں دے سکا۔ جیلیسی، حسد، نفرت یا شاید کچھ اور.....!

میں ظاہری طور پر مطمئن نظر آنے کی کوشش کرتا، کوئی بات بری لگتی تو تب بھی خاموش رہتا یا مسکراتے کی کوشش کرتا اور حتی الامکان اس میں

کامیاب بھی رہتا لیکن میرے دل کی حالت یکسر مختلف تھی۔

میں اپنے والدین کا اکلوتا تھا۔ میرے اکلوتے ہونے کی وجہ سے میرے ماں باپ نے اپنی تمام تر شفقت و محبت مجھ پر نچھاور کر دی تھی۔ ان کی خوشیوں و امیدوں کا مرکز صرف میری ہی ذات تھی۔ امی کو دن رات میری شادی کی فکرتا رہتی آئے دن وہ میرے سامنے لڑکیوں کی تصویریں رکھ دیتیں اور میں ہمیشہ کئی کترا جاتا لیکن کب تک میں انہیں نالتا، آخر وہ ماں تھیں، اُن کے بھی ارمان تھے انہوں نے میری شادی کے حوالے سے کتنے ہی خواب اپنی آنکھوں میں سجا رکھے تھے۔ میں کب تک ان کے ارمانوں کا خون کرتا، دوسرے مشعل کے علاوہ کسی اور کا تصور کرنا بھی میرے لیے محال تھا اس لیے میں نے اس سے بات کرنے کا ارادہ کر لیا، چاہے وہ کچھ بھی کہے، مجھے اس سے بات کرنی تھی۔

اُس دن موسم بہت خوشگوار تھا، ٹھنڈی ہواؤں کے جھوکے جب جسم سے کھرتے تو سردی کی لہر پورے وجود میں سرایت کر جاتی۔ اتنے اچھے موسم میں میرا موڈ بھی خوشگوار تھا۔ مجھے آج مشعل سے بات کرنی تھی لیکن اندر ہی اندر کوئی احساس مجھے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ شاید ٹھکرائے جانے کا خوف تھا۔

میں فطرتاً اپنی ذات کے حوالے سے خاصا حساس واقع ہوا تھا۔ مجھے اپنی ذات کی نفی کسی صورت بھی گوارا نہ تھی تو پھر میں ٹھکرائے جانے کے احساس کو کیسے سہہ پاتا؟ مشعل بہت حسین تھی، پر بھی لکھی تھی اسے بھلا رشتوں کی کیا تھی لیکن میں نے بھی ہمت کر کے موقع دیکھ کر اس سے اپنے دل کی بات کر ہی لی۔ میرے پروپوز کرنے پر ہمیشہ کی طرح وہ پہلے تو

حیران ہوئی پھر شرمناکرا اپنی نظریں جھکا گئی۔ یہ اس کی رضامندی کا مشرقی قسم کا اظہار تھا۔ سدا کی بولڈ اور ماڈرن لڑکی کا یہ روپ میرے دل پہ جیسے نقش ہو کر رہ گیا۔ بعد کے مراحل بہت تیزی سے انجام پائے۔ اماں میری خوشی میں خوش تھیں اور میں اپنی خوش قسمتی پہ نازاں۔ جب میں نے اس کی انگلی میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنائی تو خوشی کے مارے میرے دل کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔

ہماری فرم میں لڑکیاں بھی کام کرتی تھیں اور لڑکے بھی لیکن مشعل کی لڑکیوں کے بجائے لڑکوں سے زیادہ بنتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ فرم کی تمام لڑکیاں اس سے جلتی ہیں اور دوسروں سے جلتے والے اسے زہر لگتے ہیں۔

وقت بہت اچھا گزر رہا تھا، پر لگا کر اڑتے وقت میں ٹھہراؤ اُس وقت آیا جب حالات نے تیزی سے پیئٹر ابدلنا شروع کیا۔ کچھ دنوں سے مجھے لگ رہا تھا، مشعل کچھ بدل رہی ہے، کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ! پہلے بھی وہ نان اسٹاپ بولتی تھی لیکن اب تو اُس کی زبان چچی کی طرح چلنے لگی تھی۔ پہلے جو باتیں مجھے نظر نہ آتی تھیں اب وہ بالکل واضح ہو کر جیسے سامنے آ گئی تھیں۔ میرے ذہن میں یہ سوال سوئی کی نوک کی طرح چبھتا تھا کہ مشعل، کاشف کی کمپنی کو اتنا انجوائے کیوں کرتی ہے؟ میں نے اسے آفس میں کبھی بھی کسی لڑکی کے ساتھ ہنس کر بات کرتے نہیں دیکھا جبکہ کاشف کی باتوں پر اس کے توجہ ہنسنے میں ہی نہ آتے۔ پہلے مجھے مشعل کی ہنسی بہت خوب صورت لگتی تھی، جھیل کے جھرنوں کی طرح شفاف..... اور اب جب وہ کاشف یا کسی اور کی بات پر توجہ نہ لگاتی تو مجھے اس کی ہنسی میں بے حیائی یا بے باکی کی نظر آتی تھی۔ میں اسے ہر اس بات پر ٹوکنے لگا جو مجھے ناپسند ہوتی۔ کبھی بس وہ میری بات

مان جاتی اور کبھی بہت بری طرح جھنجھلا جاتی تھی۔ ہمارے درمیان اب ذرا ذرا سی بات پہ نوک جھونک ہونے لگی تھی۔ انہی دنوں ہمارے آفس میں ایک نئی لڑکی جیلہ کا اپائنٹ ہووا۔ وہ قدرے مختلف لڑکی تھی۔ ہر وقت سر کے بالوں کو اسکارف سے ڈھانپے رکھتی میک اپ سے عاری چہرہ جس پر ہمہ وقت گہری سنجیدگی رہتی تھی۔ میں نے اسے کبھی کسی بات پہ مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی تو وہ بہت ہی پراسرار لگنے لگتی تھی۔

شاید یہ اس کی سادہ شخصیت کا اثر تھا یا میری باتوں کا اثر کہ آہستہ آہستہ مشعل خود کو میری پسند کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ میرے کہنے پر وہ حجاب لینے لگی۔ میک اپ بھی کافی لائٹ کرنے لگی لیکن جہاں بات آئی اس کے منہ پھاڑ کر ہنسنے کی اور کاشف سے دوستی کی تو اس معاملے میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے اسے براہ راست کبھی بھی کاشف سے بات کرنے سے منع نہیں کیا تھا۔ اگر کرتا تو شاید وہ میری یہ بات بھی مان جاتی۔ مشعل بہت ہی سادہ مزاج کی لڑکی تھی اور مجھے اس کی اس قدر سادگی سے ڈر لگتا تھا۔ ہر کسی کے ساتھ غلطی اور ہمدردی مجھے اس کا ہر کسی سے خصوصاً کاشف سے بات کرنا بہت ہی برا لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ میری اس سے ناراضگی ضرورت سے زیادہ رہنے لگی تھی۔ ایک ہی آفس میں کام کرنے کے باوجود، فتوں گزر جاتے مجھے اس سے بات کیے ہوئے پر اس نے بھی نہ تو کبھی مجھ سے اس بے رہی کا شکوہ کیا اور نہ ہی مجھے کبھی منانے کی کوشش کی۔ اس کی یہی بے نیازی مجھے کھولائے رکھتی تھی۔

پھر نجانے کب میرے رویے میں یہ تبدیلی آئی کہ میں مشعل کو جیلہ سے کمپیز کرنے لگا۔ وہ بھی خوب صورت تھی، پرہیز گاہی تھی، گفتگو کا نہایت

شائستہ سلجھا ہوا تھا طامداز اور اپنے آپ میں گم رہتی تھی۔ نہ کسی سے فضول بات نہ کسی مذاق اور ایک مشعل تھی جس کی بے ہمار زبان اور بے باک ہنسی کو کنٹرول کرنا میرے اختیار میں نہ تھا یا شاید ایسا کرنا اس کے اپنے اختیار میں بھی نہ تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی اس کی جن باتوں نے مجھے اس کی طرف مائل کیا تھا آج انہی نے شاک کر دیا۔ رفتہ رفتہ مجھے اس سے بے زاری ہی ہونے لگی نجانے کیوں؟

شاید اس وجہ سے کہ وہ پہلے میری صرف گرل فرینڈ تھی اور اب فیوچر وائف۔ مرد کو جو باتیں اپنی گرل فرینڈ میں اچھی لگتی ہیں وہی اس کی وائف میں ہوں تو زہر لگتی ہیں۔ ماڈرن بولڈ فیشن ایبل لڑکی کو گرل فرینڈ تو بنایا جا سکتا ہے پر بیوی نہیں، بس بیہوش پر مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ میں بھی مردوں کی اس قسم میں سے تھا جو جیلہ مظاہر جیسی بے زبان اور سیدی سادی عورتوں کو اپنا شریک سفر بنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں جن کے منہ میں نہ تو زبان ہوتی ہے اور نہ ہی احتجاج کرنے کی صلاحیت۔

میری شادی میں دو ماہ رہ گئے تھے مگر اب مجھے ایسا لگنے لگا جیسے جلد بازی میں مجھ سے کوئی غلط فیصلہ ہو گیا ہے جس پر مجھے کچھ کچھ پچھتاوا سا ہونے لگا تھا۔ میں جب بھی جیلہ مظاہر کو دیکھتا تو یہ پچھتاوا سا ہو جاتا۔ اب مجھے مشعل کا آفس میں جا کر کرنا بھی سخت برا لگتا تھا۔ اسے میں نے جا بجا چھوڑنے کا کہا تو وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ اسی بات کو لے کر میں نے اس کی ای کو نوٹ کر دیا۔ میری بات سن کر وہ کچھ دیر کے لیے تو سن رہے تھے۔

”حماد بیٹا.....! تم فکر نہ کرو میں سمجھاؤں گی مشعل کو وہ ضرور میری بات سمجھ جائے گی۔“

”ٹھیک ہے آئی! آپ اسے اچھی طرح سے سمجھا دیجیے گا۔ مجھے لڑکیوں کا فضول میں گھر سے باہر

مارا مارا پھر ناخست ناپسند ہے۔“

پھر آئی نے بھی اسے سمجھایا مگر وہ جا بجا کرنے پر بند رہی۔ نوکری چھوڑنے پر وہ بالکل تیار نہ تھی اس کا کہنا تھا کہ میں نے اتنی تعلیم اس لیے حاصل نہیں کی کہ اسے گھر بیٹھ کر ضائع کر دوں۔ میرے لیے مسئلہ اس کے جا بجا کا نہیں تھا ان لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا تھا جو مجھے سخت ناپسند تھے۔ اب عالم یہ تھا وہ مجھ سے خفا تھی اور میں اس سے نہ وہ مجھ سے بات کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی میں اس سے۔ پورا اسٹاف حیران تھا کہ آخر ہم دونوں کو ہوا کیا ہے؟ آفس میں کسی کے سامنے ہم نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی اس لیے سب ہی ہمارے جھگڑے سے لاعلم تھے۔

پچھلے کچھ دنوں سے مجھے ایک عجیب سا احساس ہونے لگا تھا جب بھی میرا جیلہ مظاہر سے سامنا ہوتا یا وہ میرے پاس کسی کام کے سلسلے میں آتی تو اس کی نظریں میرے چہرے پر ہی جمی ہوتیں اور میں جب اس کی طرف دیکھتا تو وہ جھٹ سے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیتی۔ یہ ایک عجیب انوکھا اور پر لطف سا احساس تھا جسے محسوس کر کے میرے رگ و پے میں ایک سرور کی سی کیفیت چھا جاتی تھی لیکن جب مجھے اپنی فیوچر وائف کا خیال آتا تو ساری خوشی اڑن چھو ہو جاتی۔ میں اپنی اس رنگ بدلتی فطرت سے خود ہی حیران رہ گیا۔ کہاں تو میں اس کے لیے مر جا رہا تھا اور اب کہاں وہ مجھے حلق میں پھنسی ہوئی اس ہڈی کی مانند لگ رہی تھی جسے نہ تو میں گل سکتا تھا اور نہ ہی اگل سکتا تھا۔

اس روز میں اسے کیمین میں بیٹھا تھا کہ کاشف بھی میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا پھر وہ اپنے مطلب کی بات پر آ گیا۔

”حماد.....! ایک بات پوچھوں تم سے؟“

”ہاں پوچھو۔“ میں نے اپنی ناک پر ہاتھ رکھے ہوئے کہا۔

”یہ تم، مشعل سے ناراض کیوں ہو؟ دیکھو جا بجا نہ کرنا اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں ہے جس کو اتنا سنگین بنایا جائے؟“

”کیا مطلب؟“ میرا دماغ جھک سے اڑ گیا۔

”مطلب یہ کہ اگر مشعل جا بجا کرنا چاہتی ہے تو اسے کرنے دو۔ تمہیں کیا برا بلغم ہے؟ یہ تو اس کا ذاتی مسئلہ ہے ناں کہ وہ اپنے لیے کیا پسند کرتی ہے یا کیا نہیں؟ جا بجا کرنے کا اسے جنون ہے اور تم ایویں ہی اسے پریشان کر رہے ہو؟“

”تمہیں کس نے بتایا ہے یہ سب؟“ میں نے کمال ضبط کا مظاہرہ کیا۔ مجھے حیرت تھی جو بات آفس میں کسی کو معلوم نہیں تھی وہ اُسے کیسے پتا چلی؟

”ظاہر سی بات ہے مشعل نے بتائی ہے مجھے بہت اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے اس کی۔ وہ مجھ سے ہر بات شیئر کرتی ہے۔ اسی نے مجھے کہا تھا کہ تمہیں سمجھاؤں۔“

”مشعل.....! ادھر آؤ۔“ میں نے تقریباً چلا تے ہوئے اسے پکارا تھا۔ پہلے تو وہ میرے اس طرح کے انداز پر حیران ہوئی پھر آہستگی سے چلتی ہوئی ہمارے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔

”جی“ کیوں بلایا ہے آپ نے مجھے؟“ وہ خفا سے انداز میں بولی۔

”کیا کہا ہے تم نے کاشف سے؟“

”کچھ بھی غلط نہیں کہا جو بات ہے وہی بتائی ہے اور دیکھو یہ تو میری بات سمجھ گیا ہے پر پتا نہیں تم کیوں نہیں سمجھ رہے؟“ اس نے شکایتی انداز میں کہا اور میں چاہ کر بھی اسے یہ نہیں کہہ سکا کہ تمہارا

جانب کرنا مجھے کبھی بھی برا نہیں لگا، براتو اس سے بات کرنا لگتا ہے۔ آفس ٹائم آف ہو چکا تھا۔ میں نے اپنی ضروری فائلز لاکھیں۔ کہنے کو تو بہت کچھ تھا اور کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے باوجود ایک لفظ بھی کہے بنا اپنی گاڑی کی چابی اٹھا کر آفس سے نکل گیا۔

اگلے چند دنوں تک میں اس سے ناراض رہا پھر اس دن کے بعد کاشف نے بھی مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔

پھر ایک دن تو جیسے انہونی ہوگئی، مشعل نے ریزائن کر دیا۔ پورا اسٹاف حیران تھا اس کے اچانک فیصلے سے۔ ایک لمحہ کو تو میں بھی چکرا گیا تھا۔ اس نے میری بات مان لی تھی۔ اصولاً تو مجھے خوش ہونا چاہیے تھا پھر بھی پتا نہیں، کیوں؟ ایک نامعلوم سی اداسی میرے دل و دماغ پر چھا گئی۔

مشعل کی سیٹ پر اب جمیلہ مظاہر بیٹھ گئی تھی جو عین میرے سامنے تھی۔ میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا جو ہمیشہ کی طرح سنا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے کسی بھی بات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا تھا۔ میری شادی محض چند دنوں بعد تھی۔ اگر وہ مجھے پسند کرتی تھی تو اسے ممکن یا پریشان نہیں تو تھوڑا اداس تو ضرور ہونا چاہیے تھا۔

’ہوسکتا ہے‘ مجھے غلط فہمی ہوگئی ہو یا میرا وہم ہو کہ وہ مجھے چاہتی ہے۔ جمیلہ مظاہر تو بہت شریف اور باکردار لڑکی ہے۔ میں انہی سوچوں میں غلطیاں تھا جب اس نے قدرے چونک کر میری جانب دیکھا۔ اس کے اس طرح دیکھنے سے میں بھی بری طرح چونک گیا۔ اپنی چوری پکڑے جانے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی آنکھوں سے۔ اس کا چہرہ ضرور بے تاثر تھا، اس کی آنکھیں بے تاثر نہیں تھیں۔ کچھ تھا اس کی آنکھوں میں جو مجھ پر اس کے اندر کے بہت سے

راز منکشف کر رہا تھا۔ یکا یک اس نے اپنی نظریں جھکا لیں اور میں بہت کچھ سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ چھٹی والے روز میرا شیڈول ہفتے کے باقی دنوں سے مختلف ہوتا تھا۔ میں ہفتے کو لیٹ ٹائم مووڑ دیکھا کرتا تھا اور اتوار کو دن چڑھے تک سوتا رہتا تھا۔ وہ دن بھی معمول کی طرح خوب صورت تھا۔ میں اس وقت سو رہا تھا۔ دن کے بارہ بج رہے تھے جب دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک بار دو بار تین بار میں نے سوچا ہی ہوں گی اور پھر سے کروٹ بدل کر سو گیا مگر دروازے پر مسلسل دستک ہونے لگی۔ امی نے ویسے تو مجھے کبھی ڈسٹرب نہیں کیا تھا، آج کیا مصیبت آگئی ہے؟ میں نے غصے سے کمر پرے پٹھا۔ دروازے پر لگا تار دستک ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے پاؤں میں چنچل پہنی۔

”آ رہا ہوں۔“

”کیا قسطوں میں آ رہے ہو دروازہ کھولنے؟“ میری بات کے جواب میں جو آواز گونجی وہ یقیناً امی کی نہیں تھی۔ میں نے تیزی سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے میرا دوست سعد کھڑا تھا اسے دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔

”کیا ٹرین چھوٹ رہی تھی تمہاری؟“ میں اس سے بغلیں ہوتے ہوئے بولا۔

”ہاں، یہی سمجھ لو اور تم کیا شریف عورتوں کی طرح گھر میں منہ چھپا کر بیٹھ گئے ہو؟ کم از کم اپنی شکل ہی دکھا دیا کرو۔“

وہ دن میں نے اپنے دوستوں کے ساتھ بھرپور طریقے سے گزارا۔ رات تقریباً گیارہ بجے کے قریب جب میں اپنے گھر واپس آئے لگا تو دوستوں نے مجھے روک لیا۔

”چل یا ز آج ایک جگہ تمہیں لے کے چلیں۔“

”کہاں؟“ میں نے پوچھا۔

”ادھر پاس ہی ایک ڈانس کلب ہے۔ وہاں.....“

”ارے نہیں یا ز میں ایسی جگہوں پہ نہیں جاتا۔“

میں نے اپنی جان چھڑائی۔

”جانتا ہوں اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔“ سعد نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ میں قدرے چونک سا گیا۔

”یا ز میری ایک فرینڈ ہے، سبکی وہ اس کلب میں ڈانس ہے بلکہ بہت مشہور ڈانس ہے، کیا کمال کا ناچتی ہے وہ اس کے سامنے تو ماہ صوری ڈکٹ اور ایٹورنری رائے بھی پانی بھرتی نظر آتیں.....“

”تو میں کیا کروں؟“ رضا کو اس لڑکی کی قضیہ خوانی کرتے دیکھ کر میں بے زارگی سے بولا۔

”کرنا کیا ہے یا ز ان لوگوں کو اس سے ملوانے لے جا رہا ہوں، ساتھ تم بھی چلو۔“

”نہیں یا ز مجھے نہ تو شوق ہے اور نہ ہی ضرورت۔“ میرے رکھائی سے بولنے پر وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

پھر رضائے اپنی فرینڈ سبکی کے بارے میں وہ گل افشائیاں کہیں کہ جنہیں سننے کے بعد میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس دنیا میں عورتوں کی کتنی اقسام ہیں۔ ایک وہ ہے جمیلہ مظاہر عورت کا پاکیزہ دلکش روپ جسے دیکھنے کے بعد عورت کی عزت کرنے کا دل چاہتا ہے۔

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی۔ ”تم واقعی نہیں چل رہے؟“ مجھے اپنی سیٹ پر جمادیکھ کر وہ تینوں ایک ساتھ بولے۔

”نہیں، میں گاڑی میں ہی بیٹھوں گا، تم لوگ جاؤ اور جلدی آ جانا۔“ میں نے اطمینان سے کہا۔

”او کے!“ ان لوگوں نے بھی زیادہ اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ اس لڑکی کو دینے ہوئے ٹائم کے مطابق تینوں آل ریڈی لیٹ ہو چکے تھے۔ ان کے جاتے ہی میں نے سیٹ کی پشت سے اپنا سر نکالا۔

پتا نہیں، میں مشعل کے ساتھ نباہ کر سکوں گا یا نہیں؟ اگر کرنا چاہوں بھی تو کیسے؟ میں جب بھی اکیلا ہوتا تھا سوچیں مجھے گھیر لیتی تھیں اور مجھے اکیلا ہی نہ ہونے دیتیں۔ اس وقت تو مجھے اس کی صرف پرائیاں ہی نظر آرہی تھیں، خوبیاں تو جیسے کہیں کھو گئی تھیں۔

بہت سے لمحے یونہی خاموشی اور تنہائی کی نذر ہو گئے پھر دور کہیں سے آتی آوازیں سنائیں دیں کسی کی ہنسی کی، کسی کی ہیل کی ٹک ٹک کی، کسی کی باتوں کی، کسی کے ہتھوں کی، آہستہ آہستہ یہ آوازیں میرے قریب آتی گئیں، نزدیک اور نزدیک پھر سے دور.....

”ٹھک..... ٹھک.....“ کی آواز پر میں چونکا۔

میں نے جھٹ سے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا، کوئی میری گاڑی کے شیشے پر تاک کر رہا تھا۔ میں ڈور کھول کر نیچے اتر آیا۔ وہ میرا دوست سعد تھا جو ابھی ہم لوگوں کے ساتھ ہی آ تھا تھا۔

”یا ز گاڑی باہر روڈ پر لے آؤ، ہم بھی وہیں ہیں۔“ اپنی بات کہہ کر وہ جن کی طرح غائب ہو گیا۔

میں نے بھی شکر کا سانس لیا کیونکہ مجھے عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے گاڑی روڈ پر ڈال دی۔ سامنے ہی وہ لوگ مجھے کھڑے نظر آئے۔ میں نے گاڑی ان کے پاس لے جا کر روک دی۔

”آ جاؤ نا، اب۔“ میں نے اشارے سے ان لوگوں کو بلایا۔

سچے کہانیاں

105

سچے کہانیاں

104

سچے کہانیاں

سچے کہانیاں

نازیہ بتول رضا

جاننا تو ہوتا ہے

طلعت اخلاق احمد کا خیال

سارے رتے بھول گئی
لوٹ کے کیسے گھر جاؤں

ایک ایسی مظلوم لڑکی کا قصہ غم، ہنسراں جنس کے لیے جہنم بن گیا تھا



”تم آؤ ناں۔“ بجائے خود آنے کے، الناز رضا مجھے ہی بلانے لگا۔ میں نے سنی ان سنی کر دی۔
”ایک منٹ کے لیے آ جاؤ یار!“ کچھ تو وقت کے بعد سعد میرے پاس چلا آیا۔ ”کیا کہے گی وہ کہ کتنے بد اخلاق ہو تم؟“ میں نے گھور کر سعد کو دیکھا اور پھر ان موصوفہ کو دیکھا جن کی پشت میری طرف تھی۔
”کیا اس لڑکی کو پتا ہے کہ میٹرز کسے کہتے ہیں؟“
”یکومت اور چلو۔“ اس نے خود ہی فرزند ڈور کھول دیا۔
”اچھا چلو۔“ میں گاڑی سے نیچے اتر آیا۔
”شکر ہے، تم نے اپنی قسم تو توڑی۔“ مجھے دیکھتے ہی عذیر نے شوخی سے کہا۔
”یہ ہمارا سب سے شرمیلا اور ضرورت سے زیادہ ہی شریف دوست ہے۔“ سعد کی بات پر ان چاروں نے مشترکہ تہقیر لگایا۔ میں نے تیز نظروں سے سعد کو دیکھا۔
”اس نے تو کچھ کہنا ہے نہیں، تم ہی حال احوال پوچھ لو اس بے چارے کا۔“ عذیر کی شوخی عروج پر تھی۔
سعد کے کہنے پر ان موصوفہ نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ کچھ کہنے کے لیے اس نے اپنے ہونٹ کھولے جو سیٹی کے انداز میں ہی کھلے گئے اور میں بھی اپنی جگہ بت بنا کھڑا رہ گیا، ساتوں آسمان سر پہ گرنا اور زمین پیروں کے نیچے سے کھٹک جانا کے کہتے ہیں یہ بات اُس وقت مجھ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ ہمیشہ سے اسکارف میں لپیٹے رہنے والے لہجے سیاہ گھنے بال اُس وقت اسٹریٹنگ کنگ کی صورت میں اس کے شانوں اور پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہمیشہ میک اپ سے عاری رہنے والا

کسی دانشور نے کیا خوب کہا ہے۔ ”کتاب کو پڑھے بغیر اس کے بارے میں کوئی بھی رائے دینا سراسرے وقتونی ہے۔“
جس طرح کوئی انسان کتاب کو پڑھے بغیر اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا، ٹھیک اسی طرح انسان بھی ہوتے ہیں جن کو سمجھے بغیر پرکھے بغیر جانے بغیر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی، ان پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ دنیا میں ایسا کوئی بیان ایجاد نہیں ہوا جس سے کسی کی اچھائی یا برائی کو پرکھا جاسکے۔
واپسی تو ہر انسان کی ہوتی ہے، میری بھی ہوتی تھی اور ہوئی ہے اپنی سنگیتر کی طرف، اپنی زندگی کی طرف، میری سنگیتر جسے میں نے جہل نظر میں پسند کیا تھا۔ وہ جو بھی تھی، جیسی بھی تھی، میرے سامنے تھی۔ اس نے خود کو کسی بہروپ میں پوشیدہ نہیں رکھا تھا۔ وہ میرے سامنے کھلی کتاب کی مانند تھی۔

ہر لڑکی کی زندگی میں ایک دن ایسا آتا ہے جب اُسے پیا گھر جانا ہوتا ہے۔ اُسے سجایا ستوارا جاتا ہے اُس کے گھر والے لال کراچی سے اچھا انتظام کرتے ہیں کہ کوئی کنہ نہ رہ جائے۔ ہینجز کے معاملے میں چھوٹی سے چھوٹی چیز کا دھیان رکھا جاتا ہے کہ کسی بھی چیز کی کمی سے ہماری بیٹی کو کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ الغرض والدین بیٹی کی خوشیوں کے لیے اپنی بساط و حیثیت کے مطابق ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی وہ دن آیا جب مجھے پیا گھر جانا تھا ایک نیا گھر بسانا تھا۔ میرے والدین نے بھی میری شادی کی بڑھ چڑھ کر تیار پایا کیں، کوئی کنہ نہیں چھوڑی لیکن میری قسمت وہ میری قسمت کی کوئی توتو دور نہیں کر سکتے تھے۔

میری شادی جس گھر میں ہو رہی تھی وہ بھر اپرا گھر نہ تھا۔ میرے جیٹھ جیٹھانی بھی تھے اور دیور اور نندیں بھی۔ میرے شوہر سے سب بڑے تھے سوائے ایک بھائی کے۔

خیر میں بہت دھوم دھام سے پیا گھر سدھاری۔ گھر میں سب ہی اچھے تھے لیکن ساس سر کے ہوتے ہوئے بھی گز نہیں جیٹھ اور نندوں کی حکمرانی تھی۔ گھر میں ہر کام جیٹھ اور نندوں کی مرضی سے ہی ہوتا تھا جس پرئی امانال مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ بہر حال وہ سب مجھ سے بڑے تھے اور میں اُن سب کی دل سے عزت کرتی تھی، ویسے بھی میں بچپن ہی سے خاصی ڈر پوک اور دیوتسم کی تھی ہر بڑے کی بات ماننا اور عزت کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی لیکن کبھی کبھی عیب بھی لگتا تھا کہ شادی شدہ نندیں ہمارے مسئلوں میں ناگ اڑاتی تھیں ہر بات میں اپنا فیصلہ صادر کرتی تھیں لیکن میں یہ سوچ کر سر جھک دیتی تھی کہ ہلکی پھلکی نوک جھونک تو ہر گھر میں ہوتی ہے اور پھر مجھ سے تو براہ راست کوئی بھی کچھ نہیں کہتا تھا کیونکہ میں کسی کو شکایت کا موقع ہی نہیں دیتی تھی۔

ہر کام وقت سے پہلے کرنے کی تو میری عادت تھی سارا دن گھر کے کاموں میں چکر گھنی رہتی۔ (یہ فیصلہ بھی میری نندوں کا تھا کہ گھر کا سارا کام میں ہی کروں گی)۔ ہر ایک کی خدمت کرتی اپنے ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا نے میں اپنی زندگی میں گن گئی اس لیے سب مجھ سے خوش تھے۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا میرے شوہر مسعود ایک سیدھے سادے اور اچھے انسان تھے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے اوچی آواز میں بات نہیں کی تھی بلکہ میری ہر چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ اُن کا ساتھ پا کر کوئی بھی عورت فخر کر سکتی تھی تو پھر میں کیوں نہ کرتی؟ کیوں رب کی ناشکری بنتی؟ کیا ہوا اگر مجھے گھر کے تمام کام کرنا پڑتے تھے کیا ہوا جو مجھے ہر ایک کی بات سننا پڑتی تھی، میں اپنے شوہر کی خاطر ہر دکھ ہر تکلیف سہتی تھی دن بھر کی تنگی کے بعد جب رات میں اپنے شوہر کا ہنستا مسکراتا چہرہ دیکھتی اور اُن کی محبتیں دیکھتی تو میری دن بھر کی تنگی اتر جاتی اور میں پھر سے دوسرے دن کے صبر آزما حالات کے لیے تیار ہو جاتی۔ زندگی یونہی گزرتی رہی اور قدرت نے میری جھولی میں تین پھول ڈال دیئے تھے سب سے بڑا ایمان پھر بیٹی ایمان اور پھر سب سے چھوٹا اور چہیتا شایان جو گھر بھر کی آنکھ کا تارا تھا۔

بچوں اور اپنے شوہر کے پیار میں گن میری زندگی کی گاڑی زواں ڈواں تھی۔ پتا ہی نہیں چلا اور بارہ سال کا عرصہ بیت گیا۔ اس دوران میرے پیارے ابو اور میرے ساس سسر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ساس سسر کے گزر جانے کے بعد اب میں اپنے جیٹھ جیٹھانی کو ساس سسر کا درجہ دیتی تھی۔ عزت تو اُن کی پہلے بھی کرتی تھی اب اور زیادہ احترام بڑھ گیا تھا۔ میرے جیٹھ تو مجھے بیٹی کہتے نہ تھکتے تھے۔ ”بیٹی! آئیہ یہ کام کرو“

”بیٹی! ذرا میرے کپڑے استری کر دو۔“ اور میں بھاگ بھاگ کر اُن کے تمام کام نمٹا دیتی۔ زندگی کے سفر میں اچانک تقدیر نے پلٹا کھایا اور میری ہنستی کھیلتی زندگی دکھوں میں تبدیل ہو گئی۔

اس روز میں معمول کے کاموں میں مصروف تھی، شوہر آفس اور بچے اسکول جا چکے تھے کہ ایک فون آیا جس کے ذریعے یہ اندوہناک خبر ملی کہ میرے شوہر ایکسڈنٹ میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ میرے تو ہوش اڑ گئے میرے چاروں طرف جیسے اندھیرا اچھا گیا، مجھے کچھ ہوش نہ رہا اور میں غم کی شدت سے مٹھا لے بے ہوش ہو گئی۔

شوہر کا جنازہ کب اٹھا، کب تدفین ہوئی، مجھے کچھ خبر نہ تھی مجھے تو اپنا ہوش نہ تھا۔ بچے کس حال میں تھے میں نہیں جانتی تھی۔ رورور کر میرے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔

خدا جب غم دیتا ہے تو اُسے سنبھالنے کا حوصلہ بھی عطا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ مجھے بھی صبر آ گیا، میں بچوں میں گن ہو کر دوبارہ جنینے لگی لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ ابھی میرا امتحان ختم نہیں ہوا تھا ابھی میری تقدیر کے ترکش میں مجھ پر برسنانے کے لیے اور بھی تیر باتی تھے۔

شوہر کے چہلم کے اگلے روز میں اداس و ملول سی اپنے کمرے میں بیٹھی سب سے چھوٹے بیٹے کو ملانے کی کوشش کر رہی تھی جو اپنے پیار سے بہت انسیت رکھتا تھا اور اب ہر دم اُن کو یاد کرتا رہتا تھا کہ میری بڑی نند کمرے میں داخل ہوئیں اور بند کے کنارے پر تک گئیں۔ کچھ دیر تک وہ خاموش بیٹھی پہلو پلٹی رہیں۔ میں گن آنکھوں سے اُن کا مشاہدہ کر رہی تھی وہ شاید کچھ کہنا چاہا رہی تھیں لیکن پچکار ہی نہیں۔ اُن کا تذبذب دیکھ کر میں اندر ہی اندر ہول رہی تھی۔ نہ جانے وہ کیا کہنے والی ہیں؟ کہیں مجھے گھر سے جانے کا تو نہیں کہیں گی یا پھر میری دوسری شادی!!

نہیں، نہیں، بھلا وہ میری دوسری شادی کیوں کروائے لگیں، میں اب بچھن میں خود سے سوال جواب کر رہی تھی کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میری نند بول انھیں۔

”دراصل میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آئی ہوں۔ اگر تم میری بات مان لو گی تو اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے ورنہ پھر.....“ وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر مجھے ہٹانے لگیں۔ اُن کی نگاہوں میں اُس وقت ایسی سختی اور سفاکی تھی کہ میں پوری جان سے لرز کر رہ گئی۔

”باجی!.....! آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں میں کچھ سمجھی نہیں؟“ میں اچھٹے ہوئے بولی۔

”میں چاہتی ہوں بلکہ ہم سب چاہتے ہیں کہ.....“ وہ ذرا رک کر مجھے دیکھنے لگیں پھر بولیں۔

”کیا.....! باجی!.....! آپ جانتی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”میں اچھی طرح جانتی ہوں میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ وہ لفظ لفظ چباتے ہوئے بولیں۔ ”اور اب تم بھی یہ بات اچھی طرح جان لو کہ عدت کے بعد تمہیں دوسری شادی کرنی ہے۔ تمہارے پاس سوچنے کے لیے کافی وقت ہے۔ میں نے اسی لیے ابھی سے یہ بات تمہارے کان میں ڈال دی ہے تاکہ تم اس عرصے میں خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کے فیصلہ کرو اور ہاں یاد رہے تمہارا فیصلہ شادی کے حق میں ہونا چاہیے ورنہ.....“ وہ دم کی آ میز لہجے میں بولیں۔

”ورنہ..... ورنہ..... کیا باجی؟ اگر میں انکار کر دوں تو؟“ میں سختی سے بولی۔ اُن کے لہجے اور باتوں کو سن کر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ مجھے اُن لوگوں سے یہ توقع نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اپنی بھابھی کے بارے میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں؟ میں اُن کے بھائی کی بیوی تھی اُن کے گھر کی عزت تھی پھر..... پھر وہ ایسی باتیں کیوں کر رہی ہیں؟ اُن

کے ارادے کیا تھے؟ یا اس میں اُن کا کیا فائدہ تھا؟ میرے پاس ان سوالوں کے جواب نہیں تھے۔
 ”ورنہ تم ماتا کے سٹون سے محروم کردی جاؤ گی۔ ہم تمہیں اس گھر سے نکال کر بچے اپنے پاس رکھ لیں گے.....“ وہ نہایت سفاکی سے بولیں۔ میں اندر تک لرز کر رہ گئی۔ اُن کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ارادے میں بہت مضبوط تھیں۔ وہ جو کہہ رہی تھیں، کر گزریں گی۔

مجھ پر لرزہ طاری ہونے لگا اور میں پکپکاتے لہجے میں بولی۔ ”بابی! آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہیں؟ آپ بھی تو ایک عورت ہیں ایک ماں ہیں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بولیں کیا آپ اپنے بچوں کے بغیر رہ سکتی ہیں؟“
 میرے اس جذباتی سوال پر وہ لمحہ بھر کو شیشا گئیں پھر سنہلنے ہوئے بولیں۔ ”تم مجھے خواہو یا نہ خواہو جذباتی باتوں میں مت الجھاؤ۔“ پھر قدرے نرم انداز میں کہا۔ ”دیکھو آسیہ.....! میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، میں تمہارا بھلا چاہتی ہوں اور پھر میں تمہیں اس گھر سے دور تو نہیں بھیج رہی ہوں، میں تو چاہتی ہوں کہ گھر کی بات گھر ہی میں رہے۔“
 ”مطلب؟“ میرا ماتھا ٹھکا۔ ”گھر میں کون مجھ سے شادی کرے گا؟“

”اور میں بھائی.....!“ انہوں نے میرے سر جیسے جیٹھ کا نام لیا تو میرا دماغ گھوم گیا۔
 ”بابی.....! آپ ہوش میں تو ہیں؟ میں اور میں بھائی کو ابو (سسر) کی جگہ دیتی ہوں اور وہ بھی مجھے بیٹی کہتے ہیں۔ آپ جانتی ہیں اس بات سے انہیں کتنی تکلیف ہوگی؟“
 ”زیادہ چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے اس میں اور میں بھائی کی بھی مرضی ہے۔“ وہ بڑے آرام سے بولیں اور میرے سر پر جیسے چھت گر پڑی۔ میں ہاتھ جوڑتے ہوئے گڑ گرائی۔

”خدارا.....! بابی.....! ایسا ظلم مت کریں یہ سب مجھ سے نہیں ہوگا۔ اگر آپ سب پر میں اور میرے بچے بوجھ ہیں تو میں پیساں سے چلی جاتی ہوں۔“ میں اب باقاعدہ رو رہی تھی۔
 ”تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی، تمہیں اسی گھر میں رہنا ہے اور اس فیصلے کو ہر صورت ماننا ہے ورنہ اپنے نقصان کی ذمہ دار تم خود ہوگی۔“ وہ وارننگ دیتی ہوئی بولیں۔

میں جانتی تھی کہ اس صورت حال سے نکلنا اتنا آسان نہیں کیونکہ انکار کی صورت میں وہ میرے بچے مجھ سے چھیننے کی بات کر رہی تھیں۔ میں بہت بڑی مشکل میں تھی۔ مجھے فی الحال حکمت عملی سے کام لینا تھا چنانچہ میں سنہلتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے بابی.....! اگر آپ سب کا بھی فیصلہ ہے تو میں سوچ کر جواب دوں گی۔“

میری بات سنتے ہی وہ نرم پڑ گئیں۔ ”میں جانتی ہوں، تم بہت سمجھدار ہو، جو فیصلہ کرو گی، بہتر ہوگا، تمہارے لیے بھی اور بچوں کے لیے بھی۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئیں اور میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ آج حقیقت میں میں خود کو اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ اب مجھے سمجھ آ رہا تھا کہ یہ سب چکر کیا تھا؟ دراصل میرے سسر سے ملنے والے حصے کو میرے شوہر نے میرے اور بچوں کے نام کر دیا تھا۔ اب اگر میں یہ گھر چھوڑتی یا کسی اور سے شادی کرتی تو لازماً میرے سسر والوں کو مجھے میرا حصہ دینا پڑتا جو وہ نہیں چاہتے تھے۔ اسی دولت کے لالچ میں میرے جیٹھ جو مجھے بیٹا بنا کر دیتے تھے اب مجھ سے ہی شادی کے خواہش مند تھے۔ میرے وہ ہم دنگان میں بھی نہیں تھا کہ تقدیر میرے ہاتھ ایسا گھٹاؤ مذاق کرے گی۔ یہ صورت حال میرے لیے انتہائی پریشان کن تھی کیونکہ میرے بچے کسی کی سپورٹ نہیں تھے، میں یہ پریشانی کس کے ساتھ

شیر کرتی؟ بھائی کوئی تھا نہیں ابو کی وفات ہو چکی تھی۔ ایک امی کا وجود ہی تھا جو زندگی کے تپتے صحرا میں میرے لیے شجر سایہ دار سے کم نہیں تھا مگر یہ سب بتا کر میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ بے چاری پہلے ہی اپنی بیماریوں سے نبرد آزما تھیں اور ابو کے بعد تو ایسے بھی وہ اڈھی رہ گئیں پھر میں نے اپنے رب سے لو لگالی کیونکہ وہی تو ہے جو ہماری رگ جال سے بھی نزدیک ہے۔ وہ ہمارے دلوں کے حال جانتا ہے۔ اسی کے آگے میں نے اپنا مقدمہ پیش کر دیا اور دن گزرتے گئے۔ میں ہر روز دُعا کرتی کہ کاش! دن طویل ہو جائیں لیکن لگتا تھا جیسے دنوں کو پر لگ گئے ہیں تیزی سے گزرتے ہی جاتے تھے۔ انہی دنوں میرے بڑے بچے کی طبیعت خراب رہنے لگی، جب حالت زیادہ خراب ہوئی تو اُسے آغا خان کے ڈاکٹر ز کو دکھایا گیا۔ وہاں اُس کے تمام ٹیسٹ ہوئے تو یہ دل دہلا دینے والا انکشاف ہوا کہ ایان کو برین ٹیومر ہے۔ گھر میں سب ہی ایان کے لیے پریشان ہو گئے۔ اسے آغا خان میں ایڈمٹ کر لیا گیا۔ میں ایان کی لمبی عمر کی دُعا میں مائل، وقتی طور پر میری شادی کا مسئلہ حل کیا تھا لیکن اُن دنوں میں بہت پریشان رہتی تھی۔ مجھے صرف اور صرف فکر تھی تو ایان کی!

آخر ڈاکٹرز کی کوششوں سب کی دُعاؤں اور رب کریم کی مہربانی سے میرا ایان رو بہ صحت ہونے لگا۔ میں اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہ چھٹتی تھی۔ ایان کو نئی زندگی ملی تھی، میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میری منہ نے میری شادی کی بات چھیڑ کر میری خوشیوں کو بس نہیں کر ڈالا۔

”پھر تم نے کیا سوچا آسیہ.....؟“ ایک روز وہ اچانک بولیں۔
 ”کس بارے میں بابی؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”اب اتنی انجان نہ بنو، اس بارے میں تم سے پہلے بات ہو چکی ہے۔ تم نے سوچنے کا وقت مانگا تھا؟“ وہ تڑخ کر بولیں۔ میں حیران پریشان اُن کی شکل تنے لگی۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ خطرہ مل گیا ہے مگر وہ تو میرے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں؟ بس اتنا ہی کہہ پائی۔
 ”بابی.....! کچھ خیال کریں، ایان ابھی باسپٹل میں ہے، گھر میں سب پریشان ہیں اور آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں؟“

”میں تمہیں صرف اطلاع دے رہی تھی کہ ایان کے ڈسچارج ہوتے ہی، ہم تمہارا نکاح اور میں بھائی سے کر دیں گے۔ یوں بھی بھابھی کے انتقال کے بعد سے بھائی خود کو بہت اکیلا محسوس کرنے لگے ہیں اور میں اپنے بھائی کی خاطر کسی بھی حد تک جا سکتی ہوں۔ تم سمجھ رہی ہوں امیرا مطلب؟“ انہوں نے ہونٹ سکڑاتے ہوئے کہا۔

”جی بابی.....!“ میں فقط اتنا ہی کہہ پائی کیونکہ ان کے تیور اچھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ اگر میں ذرا بھی چوں چرا کرتی تو کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ ابھی میرا نکاح پڑھوادیتیں اسی لیے میں نے خاموشی میں ہی عافیت جانی جبکہ میری خاموشی کو وہ میری رضامندی سمجھیں اسی لیے پھر کچھ نہیں بولیں۔

مزید دو دن گزر گئے، میں باسپٹل میں ہی تھی لیکن ہر دم سوچ کی سولی پر لگی رہتی تھی عقل ماؤف ہو چکی تھی، کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ گھر جانے کے دن قریب آ رہے تھے اور میرا دل حلق میں آ رہا تھا۔ میں اور میں بھائی سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اور بچے بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی خاص طور پر شایان کو کیونکہ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا، اُسے میری ضرورت تھی۔

آخر بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک

آپ بی بی سچ بی بی سنانے والے آپ کے اور ہمارے درمیان ہی موجود ہیں

یا سمین چودھری

بیٹے دنوں کی یادو!

شاید بخاری کا خیال
دل سے اک ہوک سی اٹھتی ہے تو لگتا ہے مجھے
مندمل ہو تو گیا زخم کسک باقی ہے

خواب محبت کا عسکر ہونے والے نوجوان کی یادوں سے آراستہ دوداد



فیصلہ کیا اور فوراً اس پر عمل بھی کر ڈالا کیونکہ میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اب میرا فیصلہ سچ تھا یا غلط یہ میں نہیں جانتی تھی بس مجھے یہی بہتر لگا تھا۔

دن میں جب میری نند ہاسپٹل آئیں تو میں نے ان پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں کیا کرنے والی ہوں۔ میں نارمل انداز میں ان سے ملتی ان سے باتیں کیں اور پھر پروگرام کے مطابق بولی۔

”باجی! کیا آپ دو گھنٹے مزید یہاں رک سکتی ہیں؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں کوئی کام ہے کیا؟“
”وہ..... دراصل میں گھر جا کر نہانے کا سوچ رہی تھی ذرا فریش ہو جاتی اور شایان کو نہلا دیتی۔“

”ٹھیک ہے، چلی جاؤ لیکن جلدی آنا۔“ میری نندنے تاکید کی۔

اجازت ملنے کی دیر تھی مجھے جیسے آزادی کا پروانہ مل گیا میں نے سوئے ہوئے ایان کے ماتھے پر طویل محبت بھرا بوسہ دیا کہ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ شایان کو گود میں اٹھایا اور ہاسپٹل سے نکلتی چلی گئی۔ باہر آ کر ایک رکشہ روکا اور اپنی امی کے گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔ جی ہاں میں اپنی امی کے پاس جا رہی تھی ہمیشہ کے لیے!

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، تمام راستے میری آنکھوں سے اٹیک بپتے رہے۔ میں اپنے دو جگر گوشوں کو چھوڑ آئی تھی اس دنیا کی سفاکی نے میرے بچے مجھ سے جدا کر دیئے تھے میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ گھر کے دروازے پر اتر کر کتنی دیر سوچتی رہی کہ امی سے کیا کہوں گی پھر کانپتے ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ گیٹ امی نے ہی کھولا۔ میری اجڑی اور روئی روئی شکل دیکھ کر وہ پریشان ہو گئیں اور مجھے اندر لے گئیں۔

”خیریت بیٹا! ایسے اچانک کیسے آنا ہوا؟ ایان

کیسا ہے اب؟ اور ایمان کہاں ہے؟“ انہوں نے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ مجھ سے کچھ جواب نہ بن پڑا اور میں اُن کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ امی مزید پریشان ہو گئیں۔

”بی بی! کچھ بتا تو سہی ایسے زور کر ہلکان ہو رہی ہے اور مجھے بھی ہولارہی ہے؟“

پھر میں آہوں اور سسکیوں کے درمیان تمام زرداد کہتی چل گئی۔ امی ششدر رہ گئیں۔

”بی بی! اتنی بڑی بات تو مجھ سے بھی چھپا گئی؟ اکیلی سہتی رہی؟ ارے بچوں کا ہاتھ تمام کر چلی آئی۔ میرے لیے تو اور بچے بوجھ نہیں ہیں۔“ امی یہ کہتے کہتے رو پڑیں۔

”نہیں امی! یہ اتنا آسان نہیں تھا مجھ پر گھر سے باہر نکلنے پر پابندی تھی۔ اگر آج نہیں آتی تو پھر آنا ممکن نہیں تھا اسی لیے میں نے اپنی ممتا کی قربانی دی ہے اور میں اُس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی ہوں۔ اب میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گی.....“ میں نے امی کی گود میں سر رکھ لیا اور آنکھیں موند لیں۔

”ممکن ہے آپ کو میرا فیصلہ ٹھیک نہ لگے لیکن ان حالات میں مجھے یہی ٹھیک لگا۔“ امی کے گھر میں رہتے ہوئے مجھے ایک سال ہو گیا اس عرصے میں میں نے انصاف کے لیے ہر ڈر کھٹکھٹایا لیکن کہیں سے انصاف نہ ملا۔ میرے سسرال والے بڑے اثر و رسوخ والے ہیں ان کے پاس دولت کی طاقت بھی ہے۔ بھلا میں غریب اور بے سہارا عورت ان کا کیا بگاڑ لوں گی؟ میری ممتا اپنے دو بچوں کے لیے تڑپ رہی ہے لیکن میں مجبور ہوں کچھ نہیں کر سکتی سوائے دُعا کے۔ مجھے امید ہے کہ ایک دن میری دُعا کیں رنگ لائیں گی اور مجھے انصاف ملے گا مجھے میرے بچے ملیں گے انشاء اللہ!

.....☆☆☆.....

میں ابھی گھر سے دفتر کے لیے نکلا ہی تھا کہ گوتم تیز رفتاری سے اسکوڑر چلا تا ہوا گلی میں داخل ہوا اور میرے تریب آکر اسکوڑر روکتے ہی بولا۔

”نورالدین! چل میرے ساتھ بیٹھ جلدی کر۔“

”ابے یار خیر تو ہے؟ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے بات کیا ہے؟“

”تو بیٹھ تو سہی! کہیں چل کر بیٹھتے ہیں پھر بتانا ہوں۔“ میں اسکوڑر پر اس کے ساتھ بیٹھ گیا تو گوتم نے پھر تیز رفتاری دکھائی اور گلی سے نکل کر مین روڈ پر آ گیا۔

”ارے یار گوتم! ہم کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے پھر سوال کیا تھا۔

”ابے یار تو چپ نہیں بیٹھ سکتا؟ کہاں جا رہے ہیں ابھی پتا چل جائے گا۔“ وہ چھلا کر بولا تھا۔

گوتم کی عادت ہی ایسی تھی کہ ہر بات میں سسپنس پیدا کر دیتا تھا۔ وہ میرے بچپن کا بڑا ہی پکا دوست تھا اور ہم ایک دوسرے سے ہر دم کی ذاتی و غیر ذاتی باتیں بھی کر لیا کرتے تھے۔

سے کسی بھی قسم کے تعلقات رکھنا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ قصہ مختصر یہ کہ ابا کے انتقال کے بعد اماں نے بڑے مشکل حالات میں ہماری پرورش کی تھی۔

سہارن پور میں یوں تو مسلمان ہندو سکھ اور عیسائی سب ہی رہتے تھے مگر سب لوگ مختلف آبادیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی آبادی میں ہندو نہیں رہتے تھے اور ہندوؤں کی آبادی میں مسلمان رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مذہب کی بنیاد پر آبادیوں کی واضح تقسیم تھی۔ ہمارا گھر سہارن پور شہر کے مشہور علاقے تھامسہ بازار میں واقع تھا اور اس آبادی گھر کی پر اپنی چچا اور ہمارے درمیان جھگڑے کا باعث تھی۔

میں نے بہت شوق اور محنت سے تعلیم حاصل کی تھی تا کہ اپنے مستقبل کو سنوار سکوں اس سلسلے میں کسی کی مدد حاصل نہیں کی تھی اس لیے جو بھی کرنا تھا اپنے بل بوتے پر ہی کرنا تھا۔ میں ابتدا میں نریول ایجنٹ کا کام کرتا تھا اور پھر میں نے پولیس کی نوکری کر لی جہاں مجھے ایس پی او (ایجنٹ پولیس آفیسر) کی پوسٹ پر بھرتی کر لیا گیا تھا۔

.....

جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، گوتم اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتا تھا مگر اُس دن تو کوئی خاص بات ہی تھی جو وہ اتنی افراتفری میں میرے پاس آیا تھا۔ ہم مختلف سڑکیوں سے ہوتے ہوئے کیلاش پور ایکسپریس گڑھ پارک پہنچے تھے جسے گاندھی پارک بھی کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ اسٹیڈیم بھی موجود ہے۔

پارک میں پہنچ کر گوتم گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولا تھا۔ ”بڑی ضروری بات کرنی ہے تم سے۔“

”تو یہ بات کہنے کے لیے اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ضروری بات تو وہاں بھی ہو سکتی تھی!“

”ہو سکتی تھی مگر یار! کچھ باتوں کے لیے ماحول کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو وہاں نہیں تھا۔“ گوتم نے میرے سوال کے جواب میں خاصے سنجیدہ لہجے

میں کہا تھا پھر مسکراتے ہوئے بولا تھا۔ ”یاد ہے ناں! میں نے تجھ سے وجہتی کے نام کو لیکر کھویا تھا؟“

”اوہ! تو یقیناً تیرا خط وجہتی کے بھائیوں کے ہاتھ لگ گیا ہے اور اب تو ان سے چھپتا پھر رہا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔

”ارے نہیں یار! ایسی کوئی بات نہیں وجہتی نے تو جواب دیا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی گوتم نے جب سے خط نکالا تھا۔ ”یار! تو نے میرے جذبات کی تیج لفظی کی تھی وجہتی بھی مجھ سے پیار کرتی ہے اور ملنا چاہتی ہے۔“

”تو پریشانی کی کیا بات ہے؟ ملاقات کر لے۔“ میں نے اسے مشورہ دیا تھا۔

”یہی تو مسئلہ ہے کہ ملاقات کب اور کہاں کروں؟ تم مشورہ دو اور وجہتی کے لیکر کا جواب بھی لکھ دو۔“

”میرے بھولے دوست! جواب لکھنے کے لیے کاغذ، قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”وہ میں ابھی لے کر آتا ہوں! جب تک تو یہ وجہتی کا پتہ پڑھ۔“ گوتم تو خط میرے ہاتھ میں پکڑا کر چلا گیا اور میں ہاتھ میں تھا سے خط کو دیکھ کر اپنے نامی میں کھویا گیا تھا۔

.....

میں بتا چکا ہوں کہ چچا کی فیملی سے ہمارا ملنا جلنا نہیں تھا حالانکہ ہم ایک ہی عمارت میں رہتے تھے مگر میں اپنے دل کا کیا کرتا جس سے مجبور ہو کر میں اکثر چچا کی بیٹی میرا کو چوری چوری دیکھا کرتا تھا۔ وہ مجھے بہت پسند تھی اور اگر کبھی آتے جاتے آمانسا ملنا ہوتا تو مجھ اس کی بولتی آنکھوں میں بھی اپنے لیے پیاری پیار نظر آتا تھا اور پھر میں نے ہمت کر کے اُسے اپنے دل کا حال بتانے کے لیے ایک خط لکھا تھا لیکن وہ خط پکڑا گیا تھا بڑا ہنگامہ اور جھگڑا ہوا تھا ناراضگیاں اور بڑھ گئی تھیں۔

وقت گزارتا رہا اور میرا سے میری محبت وقت کے

ساتھ ساتھ بڑھتی اور پروان چڑھتی رہی تھی۔ اس دوران میں میرا کی منگنی بھی کر دی گئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ مجھے جب کہیں نظر آتی تو مجھے ایسی نظروں سے دیکھتی جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو اس کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے پیار نظر آتا تھا دوسری طرف میں بھی اکثر دوستوں سے اُس کے بارے میں باتیں کرتا تھا۔ گھر میں ہمیں جب یہ کہتی تھیں کہ بھائی کے لیے کوئی رشتہ تلاش کر کے شادی کر دی جائے تو میں فوراً منع کر دیتا اور صاف کہتا کہ شادی کروں گا تو میرا کے ساتھ ورنہ کنوارا رہوں گا۔ اس بات پر گھر والوں سے ڈانٹ بھی بڑتی تھی۔ میں انہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا کہ گوتم کاغذ، قلم لے کر آ گیا تھا۔

”لے یار یہ کاغذ اور قلم تو تم نے پڑھ لیا ہوگا“ اب خوبصورت سا جواب لکھ دے۔“

میں نے کاغذ، قلم لے کر گوتم کے خط کا جواب لکھ دیا تھا۔ اس دوران وہ نہ جانے کیا کیا بولتا رہا تھا دوسرے ایک بات کئی تھی کہ گوتم بہت خوش تھا اور اس کی خوشی کا مجھ سے زیادہ کون احساس کر سکتا تھا کیونکہ میں تو اس مرحلے سے گزر چکا تھا۔

.....

میرا اور میری محبت کی کہانی پورے خاندان میں مشہور تھی۔ میرا کی جو منگنی ہو چکی تھی وہ تین سال رہی اس دوران میرا اس سے بھی کبھار سامنا ہوتا رہا تھا۔ میں یہ بات اچھی طرح سے جانتا تھا کہ میرا کا منگیتر اچھا شخص نہیں تھا ڈرنک وغیرہ بھی کرتا تھا مگر یہ بات میں میرا کو نہیں بتا سکتا تھا اور پھر میرا کو اس بارے میں ہی پتا نہیں چل گیا تھا بلکہ اس نے اپنے منگیتر کو کسی اور لڑکی کے ساتھ بھی دیکھ لیا تھا اور پھر یہ منگنی ٹوٹ گئی تھی۔

منگنی ٹوٹنے کے بعد دوبارہ ہم قریب آتے گئے تھے ہمارا گھر سے ہار ملنا جلنا بڑھ گیا تھا لیکن یہ بات

میں ہندوستان کے علاقے یونی کے شہر سہارن پور سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہم پانچ بچپن اور دو بھائی تھے۔ ابا میرے بچپن ہی میں انتقال کر گئے تھے۔ یہ شکر ہے کہ اماں اپنی زندگی ہی میں بہنوں کی شادیاں کر گئی تھیں۔ ہمارا آباؤی گھر دو منزلوں پر مشتمل تھا اور پر کی منزل میں میرے چچا اپنی فیملی کے ساتھ رہتے تھے اور نیچے کا پورشن ہمارے پاس تھا۔ چچا سعودی عرب میں کام کرتے تھے اور معاشی طور پر ان کی فیملی ہم سے زیادہ آسودہ تھی اور خاندانوں کی طرح ہمارے یہاں بھی وہی روایتی مسئلہ موجود تھا کہ چچا کی فیملی اور ہماری بیٹی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ بول چال بھی ہند تھی۔ میری چچی ستارہ بیگم بڑی سخت مزاج واقع ہوئی تیں اور انہیں گویا ہم سے بہت نفرت تھی وہ ہم

ابھی ہمارے گھر والوں کے علم میں نہیں تھی اور آخر کار ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ہمیں شادی کر لینے چاہیے لیکن ہم دونوں جانتے تھے کہ ہمارے گھر والے کبھی بھی ہماری شادی پر رضامند نہیں ہوں گے اس لیے ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ کورٹ میرج کر لیتے ہیں اور یوں ہم نے گھر والوں کی لاعلمی میں کورٹ میرج کر لی تھی اور نکاح کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے گھر وں کو چلے گئے تھے۔

یہ بات دو تین دن تو چھپی رہی تھی مگر کسی جاننے والے نے ہمیں کورٹ میں دیکھ لیا تھا لہذا اس نے آ کر ہمارے گھروں میں یہ اطلاع دی تھی۔ اس بات کا پتہ چلنا تھا کہ ایک زلزلہ آ گیا بہت شور شرابہ ہوا، جھگڑا ہوا۔ میرا کے گھر والے بضد تھے کہ میں اُسے طلاق دے دوں لیکن میں نہیں مانا اور ڈٹا رہا۔ میرا کے گھر والوں سے بھی جھگڑا مول لیا اور اپنے گھر والوں سے بھی باتیں سننا رہا۔ آخر کار خاندان کے بزرگوں نے فیصلہ کیا کہ ہماری شادی کو منظور کر لیا جائے مگر میرا کی والدہ یعنی میری چچی ستارہ بیگم اپنی بیٹی کی طلاق پر بضد تھیں اور جب میرا کے گھر والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ میں اُسے طلاق نہیں

دوں گا تو انہوں نے سعودی عرب میں مقیم میرا کے بھائی کو بلا دیا تھا۔ اُس نے گھر پہنچ کر بہن کو بہت ڈرایا دھمکایا اور مارا پیٹا تھا اور یہاں تک کہا تھا کہ اگر تم نے کہنا نہیں مانا تو میں تم پر تیزاب ڈال دوں گا۔ میرا نے اُس رات گھر والوں سے چھپ کر مجھے فون کیا تھا اور تمام رور دانا کر بولی تھی۔ ”میں کل صبح سات بجے ریلوے اسٹیشن پہنچ جاؤں گی مجھے اپنی زندگی کا خطرہ ہے۔ تم آؤ۔ آؤ۔ آؤ۔ مگر میں واپس گھر نہیں آؤں گی۔“ میں صبح اسٹیشن پہنچ گیا۔ میرا بھی خاموشی سے گھر سے نکل کر چھپ چھپا کے اسٹیشن پہنچ گئی تھی اور پھر اُس نے مجھے ساری بات تفصیل سے بتائی

تھی۔ اُس کی بات سن کر میں نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور میرا کے ساتھ چند ہی گڑھ روانہ ہو گیا تھا۔ میرا پر وگرام چند ہی گڑھ سے ہو کر شملہ جانے کا تھا۔

شملہ میں ہم تقریباً آٹھ دن رہے تھے۔ اس دوران گھر والوں سے فون پر رابطہ کیا تو کہا گیا تھا کہ ”تم لوگ واپس آ جاؤ۔“ مگر ہم ڈرے ہوئے تھے کہ وہ ہمیں بھانے سے ہمارے ہیں مگر میرے گھر والوں نے مجھے بہت سمجھایا تھا کہ واپس آ جاؤ اور یہاں سہارن پور میں اپنی بیوی کے ساتھ رہو۔ ہم نے میرا کے گھر والوں کو بھی منا لیا ہے اور اب ان کا کہنا ہے کہ اُن کی بیٹی جہاں جی چاہے رہے انہیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اس یقین دہانی کے بعد ہم واپس سہارن پور آ گئے تھے جہاں حالات کافی حد تک نارمل تھے۔ میں نے ایک چھوٹا سا گھر کرائے پر لے لیا تھا۔ ہمارا یہ کرائے کا گھر ہم دونوں کے گھروں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس صورت حال میں میرے گھر والے تو مجھے ملتے تھے مگر میرا کے گھر والوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔

ہمیں اس کرائے کے گھر میں رہتے تقریباً تین ماہ ہو چکے تھے کہ ایک دن دوپہر کے وقت میرے آفس میں میرا کا فون آیا تھا کہ اُس کی ماں ستارہ بیگم گھر کے دروازے پر کھڑی ہے اور ہمیں برا بھلا کہہ رہی ہے۔

”دروازہ کھولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میرا نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا۔ اُس کی یاں ٹھوڑی دیر دروازہ کھٹکنا کر اور باتیں بنا کے چلی گئی تھی۔

کچھ دن خیریت سے گزرے تھے اور ہم دونوں اپنی ہی زندگی میں مگن بہت خوش تھے اور میں تو کچھ زیادہ ہی خوش تھا کہ میں نے اپنی محبت کو پایا تھا اور وہ

ان دنوں امید سے تھی۔ اُس روز جب میں گھر لوٹا تھا تو میرا کو پریشان پایا تھا وہ مجھے دیکھتے ہی بولی تھی۔

”آج تو حد ہو گئی اماں آئی تھیں میں نے پہلے تو دروازہ نہیں کھولا تھا انہوں نے پتھر مارنے شروع کر دیے تھے محلے والوں کو جمع کر لیا تھا تو مجھے دروازہ کھولنا پڑا تھا۔ اماں مجھ سے لپٹ کر بہت روئی تھیں۔ وہ مجھے اپنی تم سے کر گئی ہیں کہ ہم دونوں اُن سے ملنے جائیں۔“

میں نے ساری بات توجہ سے سنی تھی اور کہا تھا۔ ”مجھے تمہاری اماں کا بھروسہ نہیں ہے مگر کیونکہ انہوں نے تمہیں تم دی ہے تو ضرور چلیں گے۔“

دوسرے دن میں میرا کو لے کر اُس کی ماں کے گھر گیا تھا۔ وہ ہم دونوں سے بڑے پیار سے پیش آئی تھی اور بڑی آؤ بھگت کے بعد بولی تھی۔

”بیٹا! میرا اب کچھ دن یہیں رہے گی۔ چند روز میں میں اس کی رخصتی کروں گی تاکہ خاندان بھر میں منہ دکھانے کے قابل تو ہو جاؤں۔ تم مجھے اتنا موقع تو دو کہ میں بدنامی کے داغ کو دھوسکوں لوگوں کی زبانیں بند کر سکوں!“

میرا ساس نے یہ باتیں کچھ اس طرح کی تھیں کہ ”میں ماننی پڑی تھیں۔ ہم نے سوچا تھا کہ چند دنوں کی تو بات ہے پھر ہم ہوں گے اور ہماری زندگی! مگر میرا ساس نے تو چند ہی دنوں میں اپنی اعلیت دکھانی شروع کر دی تھی اور میرا کو کچھ اٹنا سیدھا کھلا کر بچے ضائع کر دیا تھا اور پھر اُس کے علاج اور تندرستی کے بہانے رخصتی کے لیے بھی ٹال مٹول کرنے لگی تھی اور ایک روز یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ”کوئی مکان وغیرہ میری بیٹی کے نام کر دو پھر رخصتی کروں گی۔“ اور میرے ساتھ ظلم یہ ہوا تھا کہ اُس نے میرا کو بھی ایسی ہی پڑھائی تھی کہ وہ بھی ماں کی باتوں میں آ کر اُس کی طرف داری کرنے لگی تھی۔

میں نے اپنی ساس کی یہ بات نہیں مانی تھی تو اس

نے مطالبہ کیا تھا کہ میں میرا کو طلاق دے دوں۔ ظاہر ہے میں نے انکار کر دیا تھا تو انہوں نے مجھ سمیت میرے بھائی اور بہنوں تک پراپیٹی بیٹی میرا کے نوا کا پرچہ کروا دیا۔ پولیس کیس کے بعد مجھے بہت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ میں خود پولیس میں ایک اچھی پوسٹ پر تھا بڑی مشکل سے وارنٹ کیسلس کروائے تھے اور ضمانتیں کروائی تھیں اور پھر آخر کار دوست احباب کے سمجھانے پر بات چیت سے ہی یہ مسئلہ حل کرنا پڑا تھا۔

ستارہ بیگم نہایت تیز ہوشیار اور چالاک عورت تھی باوجود اس کے کہ میں حق مہر کی رقم پہلے ہی میرا کو دے چکا تھا اس کے علاوہ بھی مجھے ایک لاکھ روپے ان لوگوں کو دینے پڑے تھے اور گھر کا سامان بھی انہوں نے ضبط کر لیا تھا۔ یہ سب مانے اور کرنے پر میں مجبور تھا مجھے اپنے گھر والوں کو اس عذاب سے نکالنا تھا اور یوں میں نے میرا کو طلاق دے دی تھی جس کا مجھے بہت دکھ تھا۔

میں میرا سے واقعی بہت محبت کرتا تھا اتنی محبت کہ اپنی عدت کی مدت کے دوران مجھے میرا نے ایک دن فون کر کے کہا کہ ”نور تم یہ شہر چھوڑ دو!“ اُس کی بات سن کر ہی سنانے میں آ گیا تھا اور پھر میں اُس کی خوشی کی خاطر اپنا شہر اپنا سہارن پور چھوڑ کر ممبئی چلا گیا تھا۔

زندگی اب بھی رواں دواں ہے۔ میں نے حالات سے سمجھوتہ بھی کر لیا ہے مگر میں اب بھی میرا کو بھلا نہیں پایا ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ میں نے میرا کو ٹوٹ کر چاہا تھا مگر شاید میری تقدیر ہی ایسی ہے۔ آج میرا تو میرے ساتھ نہیں ہے مگر ہر لمحے اُس کی باتیں میرے ساتھ رہتی ہیں اور شاید زندگی بھر میرے ساتھ ہی رہے گی۔ میں چاہوں بھی تو میرا کو نہیں بھلا سکتا!!

☆☆☆

زیر ونگر کے ساتھ۔ سچ بتاؤ حسن، کیا میں موٹی دھومین لکتی ہوں اور اب کوئی بھی ڈریس میرے اوپر سوٹ نہیں کرتا؟“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہے جانم، تم اب بھی اتنی ہی خوبصورت اور چارمنگ ہو جتنی شادی کے دن تھیں بلکہ شادی والی رات تو تم ہادلوں میں ڈھکا چاند تھیں تو اب چودھویں کے چاند کی طرح روشن اور چمکدار ہو اور حسن ترمذی مابدولت سمیت طحہ ترمذی، ہلال ترمذی اور ماڑہ ترمذی تمہارے گرد ستاروں کی مانند ٹٹماتے ہیں۔“

”ہاں ہاں بنا لو حسن، مجھے تم زبان سے تو تم مجھے چاند کہہ رہے ہو اور دل میں کہہ رہے ہو گے کہ پہلے پہلی تاریخ کا نازک سا ہلال عید تھیں اور اب چودھویں کا موٹا تازہ گول موٹل چاند ہو۔“

”جان من، تمہیں سمجھانا تو جوئے شیر لانے سے بھی مشکل ہے، تم نے تو چاند کی توہین میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کیا ہو گیا اگر تم ہلال عید نہیں ہو پورن ماشی (پورا چاند) ہو۔ میرے لیے چاند تو چاند ہوتا ہے، چاہے ہلال عید ہو یا ایک لکیر کی طرح یا پورن ماشی ہو۔ اچھا چھوڑو جلدی کرو گاڑی میں بیٹھو ایک گھنٹے کا تو راستہ ہی ہے اگر دیر ہوگی تو تمہاری چھوٹی بہنا جی اپنے جیبا جی سے سخت ناراض ہو جائیں گی اور یہ جو کم میرے سر پر چند بال بچے دیکھ رہی ہوں انہیں یہ بھی اُس کی نذر ہو جائیں گے۔“

وہ سب تیار تو ہو ہی چکے تھے لہذا باہر نکلے اور گاڑی میں بیٹھ کر شادی ہال کی طرف روانہ ہو گئے۔

ساڑھ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں نازک چلی اور شرارتی دھان پان ہی لڑکی ہوا کرتی تھی جو کہ مختلف تقریری مقابلوں، شعر گوئی، نعت

خوانی، ملی نغموں سمیت نصابی وغیر نصابی سرگرمیوں میں بھر پور حصہ لیتی تھی۔ نازک کی شخصیت سیاہ گنے لمبے بالوں اور حسین چہرے کی معصومیت کے ساتھ ایک دن ڈاکس پر کھڑی اپنے خیالات کا اظہار اس پر جوش انداز میں کر رہی تھی کہ لگتا تھا بدن کا سارا خون چہرے کی طرف رواں ہو گیا تھا، پسینے سے تر ہوتی پیشانی پر آئی بالوں کی لٹک ساڑھ نے جھٹک کر پیچھے کیا اور پُر جوش آواز میں بولی۔

”جناب سچ صاحب.....! عورت اگر بیٹی کے روپ میں ہو تو باپ کے لیے سراپا ڈُعا ہوتی ہے۔ عورت اگر بہن کا روپ لیے ہو تو بھائی کے سر کی چھایہ ہے۔ بہو کے روپ میں سسرال کا نور ہے تو بیوی کے روپ کے کیا کہتے ہر روز آتش جوالہ ہے اور ہاں عورت اگر فضل خدا سے ماں کے عہدے پر متمکن ہو جائے تو جنت اُس کے قدموں تلے آجاتی ہے۔ واقعی عورت رگوں میں بہتے خون کی روانی ہے، جذبوں میں بہتی جوانی ہے، کائنات کا حسن ہے، واقعی شاعر نے کیا خوب کہا ہے کہ

”جو وزن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ“ اور جب اپنی انتہائی جذباتی تقریر کے بعد وہ اپنے دوپٹے کا پلو اپنی منگی میں مروڑتے ہوئے آج سے نیچے اتری تو جوجیوٹ پر بیٹھے فائل ایئر کے حسن ترمذی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ساڑھ ہاتھوں نے مٹھی میں اپنے دوپٹے کو ناسختی سے نہیں تھا بلکہ حسن ترمذی کا دل تھام لیا ہے اور اب اس کے اندر کسی اور پری و ش کے جلوے کی تاب لانے کی سکت نہیں ہے۔

اس تقریری مقابلے کے بعد فائل ایئر کے سوہ اور چارمنگ حسن یونیورسٹی کے شعبہ ابلاغ عامہ کے چکر لگانے پر مجبور ہو گئے۔ دوستوں نے معاملات کی من گن لینے کی کوشش کی مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ حسن نے

یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد برسر روزگار ہوتے ہی ساڑھ ہاتھوں کے گھر رشتہ بیجا جہاں سے مناسب چھان بین کے بعد حسن ترمذی کے رشتے کی منظوری دے دی گئی۔ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کا مقدمہ اُن پر پوری طرح صادق آیا اور ایک رات ساڑھ دلہن بنی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ حسن کے سامنے موجود تھی۔

ساڑھ نہ صرف ایک اچھی مقررہ ادیبہ اور شاعرہ تھی بلکہ شادی کے بعد وہ ایک اچھی بیوی بہو بھانجی اور ماں بھی ثابت ہوئی، بے درپے تین بچوں کی ولادت اور تیسری بچی کی پیدائش کے ساتھ ہی ساس کی بیماری نے ساڑھ کو گھر بلو کاموں میں اتنا مصروف کر دیا کہ وہ اپنی فتنس کی طرف توجہ نہ دے سکی۔ اس کا وزن بڑھتا گیا۔ حسن کی والدہ خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی تھیں کہ اللہ نے اُن کو اتنی اچھی بہو سے نوازا تھا جس نے بیٹی کی کمی پوری کر دی اور جو دیگر بہوؤں کی طرح فتنس سینئر یوگا ایرو بکس کلاسز جاتے کے بجائے اُن کے لیے سوپ اور جوسز بنانے کی فکر کرتی تھی اور اپنا بھر پور وقت گھر کو ایک ذمہ دار ماں اور بہو کے طور پر دیتی تھی۔

ساڑھ بھی ویسے تو ہر طرح مطمئن تھی مگر اُس کا مسئلہ یہ تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ اسے اپنا بڑھا ہوا وزن از حد ناگوار لگنے لگا تھا، وہ حسن سے اس حوالے سے بات کرتی تو حسن ٹال جاتا مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساڑھ کے دماغ میں یہ بات پختہ ہوتی چلی گئی کہ اُس نے ہر حال میں وزن کم کرنا ہے، بچوں کے اسکول جانے اور ساس کو ناشادینے کے بعد اکثر اوقات چکن کے دوسرے کاموں کے دوران کسی نہ کسی چینیئل پر مارنگ شوڈ دیکھنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا جو چینیئل پر ٹیل کا کام کر رہا تھا۔ اکثر اُن شوڈ کس موٹاپے کا شکار بیویوں کے شوہروں کا دوسری

اسارٹ خواتین کے ساتھ چکر چلانے سے بے کر شادی تک کے واقعات کچھ اس طرح سے ٹمک مریج لگا کر بتائے جاتے کہ ساڑھ اپنے وزن کو کم کرنے اور موٹاپا ختم کرنے کے لیے خاصی محنت کرنے لگی تھی۔ بڑوسنوں کے گھر جانا، کسی پارٹیز اور ہر قسم کے سوشل سرکل کا اُس نے بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک وہ دہلی پتلی اور اسارٹ نہیں ہو جاتی، وہ کہیں نہیں جائے گی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ گھر پر بیٹھے اور کہیں نہ آنے جانے کی وجہ سے اس کا دو چار کلو وزن اور بھی بڑھ گیا۔ اب تو ساڑھ کی پریشانی مزید بڑھ گئی، سونے سے پہلے ایک روز اُس کی چند دوستیں ملنے کے لیے گھر آئیں۔

باتوں باتوں میں ایک سخرانہ انداز میں بولی۔ ”ساڑھ! تم تو موٹی ہو گئی ہو، پچھلے مہینے کے مقابلے میں پیٹ بھی کافی نکل آیا ہے، کہیں.....؟؟؟“ اس بات پر ہانی سب دہلی دہلی ہنسی بننے لگیں۔

”ارے نہیں، پچھلے مہینے ساس کی طبیعت خاصی خراب تھی، مصروفیت کی وجہ سے بنی بیلٹ (Belly belt) وغیرہ کا استعمال نہیں کر سکی ناں اُس لیے۔“ اُس نے توجیہ پیش کی۔

”ارے نہیں، چھپاؤ نہیں، بتاؤ، کوئی بات نہیں۔“ اور ساڑھ چھپتی ہی ہنسی پٹس دی۔

دوستوں کے جانے کے بعد تو وہ مزید پریشان ہو گئی اور دل میں پکا تہیہ کر لیا کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ اپنا وزن کم کر کے ہی رہے گی۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ اس کے تین بچے ہیں تو اسے موٹاپے کا شکیںٹل لگ گیا یا یہ کہ اسے کوئی بیماری شوگر، بلڈ پریشر وغیرہ نہیں تو موٹاپا چارٹر ہے، ارے، موٹاپا تو خود ایک بیماری سے کم نہیں اور اب میں اسے ہر حال میں کم کر کے رہوں گی، میں ضرور اسارٹ ہو جاؤں

دس پندرہ دن کے فاقوں ٹریڈل کی واک نہار منہ گرم پانی اور نہ جانے کون کون سے ٹونکے آزمانے کے بعد بھی جب سائرہ کو مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوئے تو وہ شدید ڈپریشن ہو گئی، اچانک اسے خیال آیا کہ ایک دن اُس کی دھان پان زیرو فگر والی ماسی کبہ رہی تھی کہ ایک باباجی ہیں وہ ہر قسم کا مسئلہ حل کر دیتے ہیں۔ اُس نے فوراً بتول کو آواز لگائی۔

”بتول.....! ڈرا دھرو تو آؤ وہ..... ایک دن تم کیا بتا رہی تھیں تمہارے کوئی بابا ہیں جو ہر کام کر دیتے ہیں تمام مسئلوں کا حل ہوتا ہے اُن کے پاس؟“

”جی باباجی.....!“ بتول بولی۔ ”وہ تیلی والے بابا بہت پیچھے ہوئے بزرگ ہیں جی اللہ بخشے میری ساس کہا کرتی تھیں اُن کی بھلی بیٹی چھیمیاں کے یہاں چودہ سال سے بچہ نہ ہوا تھا۔ باباجی نے ایسا تعویذ اور چورن دیا کہ چوتھے ہی ماہ اُس کو خوشخبری مل گئی۔ شکورن کی بیٹی کو یرقان ہو گیا تھا جی وڈے وڈے ڈکڑوں نے جواب دے دیا تھا جی اُسے پر بابا جی کے پڑھے ہوئے پیر کے پتوں کا بار اور چورن استعمال کر کے وہ بھلی چٹلی ہو گئی اور تو اور باباجی وہ جو شکورن کی دیوار تھی نا وہ ایک دفعہ میری جگہ آپ کے پاس کام بھی کرنے آئی تھی تھوڑی جھینگی اور بہت موٹی سی تھی وہ تو جی.....!“ بتول سے ایک بات کر کے دیکھو وہ تو پوری داستان شروع کر دیتی تھی۔

”اچھا اچھا بس بھی کرو بتول!“ سائرہ نے اُس کی بات کا تے ہوئے کہا۔

”کیا تمہارے بابا جی کے پاس موٹا پاختم کرنے کا بھی کوئی علاج ہے؟“

”یہ کیا بات کر دی آپ نے بی بی جی اُن کے

پاس موت کے سوا ہر چیز کا علاج ہے۔ میری خال کی بیٹی کی شادی موٹا ہونے کی وجہ سے نہیں ہو رہی تھی بابا جی نے ایسا تعویذ اور چورن دیا کہ چھ ماہ کے اندر اندر ہی اس کے جسم کی ساری فالتو چربی گھل گئی اور آناٹا اُس کی شادی ہو گئی۔“

”بتول تمہاری خالہ کی وہی بیٹی ناں جو شادی کے نوں مہینے وفات پا گئی تھی؟“

”ہاں جی وہی مگر اُس کی موت کی وجہ تو زچگی میں ہوئی تھی باباجی ورنہ وزن تو اس کا اتنا ہوا تھا کہ جی، پھٹیلی پر اٹھلا پھول کی طرح نازک اور وہ جو باباجی ٹی وی پر چل رہا ہے نا ڈرامہ اُس کی جو ہیروئن ہے نا آپ کو یاد ہوگا وہ کتنی موٹی تھی جی وہ جی میں نے خود اُس کو باباجی کی کٹیا میں دیکھا تھا۔ آپ نے دیکھا اب اُس کو کتنی نازک اور سمارٹ ہو گئی ہے وہ یہ سب باباجی کے تعویذ اور چورن کا کمال ہے۔ سچ بتاؤں باباجی یہ جو مارٹنگ شو والی باباجیاں ہیں ناں سب کو تو نہیں پہچانتی مگر اُن میں سے کیوں کو میں نے باباجی کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے جی اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے سب کی سب کسی سمارٹ دھمتی ہیں نا باباجی نازک سی پریاں اور بولتی کیسا اچھا ہیں صبح صبح (صبح) دل کرتا ہے جی بس اُن کو سنتے ہی رہو ٹی وی کے آگے سے ہٹو ہی نہ پر کیا کریں غریب ہیں ناں جی پاپی پیٹ کا ایندھن بھرنے کے سوا تمیں کچھ سوچنا ہی ناں ہے جی!“

”اچھا اب بس بھی کر دو بتول بہت بولتی ہو تم۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم مجھے باباجی کے پاس لے چلو گی؟ میں بھی اپنے وزن کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔“

”ست بسم اللہ بی بی جی.....!“ بتول فوراً

بولی۔ ”میں آپ کو ضرور لے چلوں گی بس آپ ذرا یہ بات بھائی صاحب (بتول کے میاں) اور اماں (بتول کی ساس) کے کان میں نہ پڑنے دیں۔ آپ کو تو پتا ہے ناں جی اماں مجھے بھی اُس باباجی کے پاس جانے سے منع کرتی ہیں۔ آپ کو تو جی وہ ہرگز اجازت نہ دیں گی۔“

”ہاں ہاں مجھے معلوم ہے تم بے فکر رہو بتول میں کسی سے تذکرہ نہیں کروں گی۔“

مارٹنگ شو والی باباجیاں ہیروئنیں..... ہاں شاید میں نے بھی کہیں پڑھا تھا کہ بڑے بڑے سیاست دان اور فلم میکرو وغیرہ بھی اُن باباؤں وغیرہ کے پاس آتے جاتے ہیں اپنے کاموں اور مسئلوں کے سلسلے میں۔ سائرہ کے روشن خیال اور بڑھے لکھے دماغ میں یہ بات بیٹھتی چلی گئی کہ ان باتوں میں کوئی نہ کوئی سچائی ضرور ہوگی اور اگر میرا وزن کم ہو گیا تو ضرور رخصت اور بچے بھی خوش ہوں گے۔ وزن کم ہو جائے ایک باپھر میں حسن کو سب کچھ بتا دوں گی خود ہی میرا مقصد کوئی چھپانے کا تو ہرگز نہیں ہے بس سر پر اتر دوں گی حسن کو وہ کتنا خوش ہوں گے مجھے اسمارٹ دیکھ کر۔

سائرہ نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو بہت ساری دہلیوں سے مطمئن کر لیا کہ وہ کون سا نا جائز کام کرنے جا رہی ہے اور کون سا ایک دفعہ جاتے ہی میں اُس پر اندھا اعتقاد کر لوں گی میں تو اتنی براڈ مائنڈڈ اور ایجوکیٹڈ ہوں بس میں نے اپنا تھوڑا وزن ہی تو کم کرنا ہے۔ وہ صدمہ فیصلہ تو کر ہی چکی تھی کہ ہر حال میں وزن کم کرنا ہے لہذا اگلی صبح حسن کے آفس اور بچوں کے اسکول جانے کے بعد اُس نے اپنی ساس کو ناشتایا اور یہ کہتے ہوئے گھر سے نکل گئی کہ وہ پڑوس میں جا رہی ہے ابھی تھوڑی دیر میں آجائے گی۔ بتول اُس کے انتظار میں باہر کھڑی تھی

دونوں باباجی کی رہائش گاہ پچیسویں تو ایک لمحے کو سائرہ کے دل میں خیال آیا کہ یہ وہ کیا کرنے جا رہی ہے؟ مگر پھر اُس نے اپنے اندر کی آواز کو اگنور کر دیا اور اپنی تمام روشن خیالی اور تعلیم بالائے طاق رکھ دی کہ اُس کا مطمح نظر صرف اور صرف اپنا موٹا پاختم کرنا تھا۔

سائرہ نے سوچا وزن کی زیادتی حسن و خوبصورتی کے لیے دشمن ہے اور باباجی کے توسط سے میں یقیناً دوبارہ سے سلم اور اسمارٹ ہو جاؤں گی اور حسن کو سر پر اتر دوں گی۔ بتول کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے سائرہ باباجی کے حجرے میں داخل ہو گئی۔

عجیب قسم کا ماحول تھا قدرے اندھیرا اور دھواں دھواں سا تھا کسی قسم کی عجیب سی تیز شدید چھتی ہوئی سی بو بھی ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔ پتائیں کانور تھا یا زعفران یا کوئی اگر تکی۔ سائرہ نے اپنے دماغ میں اٹھتے سوالات کو سر جھٹک کر دور کیا اور بتول کے ساتھ باباجی کے سامنے بیٹھ گئی۔

”جی باباجی.....! آج میں نہیں آئی آپ کے پاس یہ میری باباجی آئی ہیں اپنا مسئلہ لے کر۔“

”ہمیں معلوم ہے تمہاری باباجی کا کام ہو جائے گا۔“ باباجی گرجدار آواز میں بولے۔ ”بس شرط یہ ہے کہ پکا اعتقاد ہونا چاہیے ہمارے چورن پر۔“ انہوں نے ایک ٹرانسپیرنٹ جار میں مٹی کے رنگ کا سفوف کاغذ کی تھیلی میں ڈالا اور سائرہ کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

”جی باباجی.....!“ سائرہ کے منہ سے صرف یہی الفاظ ادا ہوئے۔ ”کیا بد یہ ہوگا اس کا؟“

”کوئی بد نہیں ہے ہم سب کام فی سبیل اللہ کیا کرتے ہیں۔“ باباجی گرجدار آواز میں بولے۔ ”بس کونے میں جو ایک کپڑے سے ڈھکا باکس پڑا

ہے اس میں اپنی مرضی سے اللہ کے نام پر جو ہو سکے ڈال دو ہمیں دنیا داری کی چیزوں سے کوئی سروکار نہیں ہر شے فانی ہے۔ بس اللہ لافانی ہے۔ سارہ دل ہی دل میں متاثر ہو گئی کہ ایسے مزاروں اور حجروں میں بیٹھے بابا صاحبان تو آنے والوں کو خوب لومٹے ہیں اور پیسے لیتے ہیں مگر یہاں تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ بتول کے ٹھوکا دینے پر سارہ آگے بڑھی اور کونے میں رکھے کپڑے سے ڈھکے ڈبے کے منہ میں اس نے ہزار کا نوٹ ڈال دیا جو اس نے پہلے سے اپنے پرس سے نکال کر اپنی مٹھی میں دیا ہوا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہزار روپے میں اگر اس کا موٹا پانچ ختم ہو جائے اور وہ پہلے کی طرح اسماٹ، سلم اور فٹ ہو جائے تو سودا برا نہیں تھا۔ بہر حال وہ گھر واپس آگئی اور باباجی کی ہدایت کے مطابق صبح ناشتے سے پہلے اور رات سونے سے پہلے ایک ایک چھچھو چورن گرم پانی کے ساتھ استعمال کرنے لگی اور تعویذ بھی اپنے تکیے کے غلاف میں رکھ لیا۔ چورن کا سفوف بے ڈالنے تھا جس کا کوئی مضر اثر سامنے نہیں آیا۔ باباجی نے کہا تھا پندرہ دن کے بعد وزن کرنا انشاء اللہ تمہاری دلی مراد آئے گی۔ پندرہ دن کے متواتر چورن کے استعمال کے بعد اسے واقعی محسوس ہوا کہ اس کے وزن میں نمایاں کمی آئی ہے۔

وینگ اسکیل (weighing scale) پر وزن کرتے ہوئے تو وہ خوشی سے چھولے نہ سائی پورے پانچ پاؤنڈ وزن کم تھا اس کا اور سائیز انٹیکٹ (side effect) بھی کوئی نہیں۔ اگلے دن اس نے بتول کو ہزار کا نوٹ پکڑا دیا ہے کہ پندرہ دن کا چورن اور لے آئے اور باباجی کو میرا سلام بھی دینا۔

”اچھا بی بی جی.....!“ بتول جاتے جاتے بولی اور واقعی اگلے پندرہ دن کے چورن کے استعمال سے اس کا وزن مزید پانچ پاؤنڈ کم ہو چکا تھا۔

اس رات وہ واقعی بہت خوش تھی اپنا ایک قدرے پرانا فننگ والا ڈریس پہن کر حسن کو دکھاتے ہوئے بولی۔ ”حسن دیکھیں میرا وزن اور موٹاپا کچھ کم لگ رہا ہے نا؟“

”ہاں جان.....! تم تو ہمیشہ چاند کی طرح لگتی ہو؛ وزن زیادہ ہو یا کم اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ٹالتے ہوئے بولے۔

سارہ دل ہی دل میں خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ”یا ہوو.....! اگلے مہینے ضرور میں دس پاؤنڈ وزن مزید کم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی پھر اپنے گھر میں میلا اور قرآن خوانی کی تقریب رکھ لوں گی۔ ساسو ماں بھی صحت مند ہوگی تمہیں اور ٹھکانا رزلٹ بھی شاندار آیا تھا۔ میں سب دوستوں اور پڑوسنوں کو اپنی اسماٹ نیس دکھا کر متاثر کروں گی مگر باباجی کے متعلق کسی کو کچھ نہ بتاؤں گی ورنہ سارے مل کر میرا مذاق اڑائیں گے کہ اتنی بڑھی لکھی روشن خیال کن چکروں میں پھنس گئی؟“ وہ دل ہی دل میں کافی حد تک باباجی کی قائل ہو چکی تھی۔

ایک ہفتے بھی گزر گیا اور اب تو سارہ کے وزن میں نمایاں طور پر کمی محسوس ہونے لگی تھی۔ جسم سڈول اور اسماٹ ہونے کے ساتھ ساتھ پیٹ بھی امد ہو چکا تھا۔ سارہ بہت ہی مسرور تھی اس نے ساس کی صحت یابی کی خوشی میں گھر پر میلا اور قرآن خوانی کی تقریب رکھی جس میں اس نے اپنی تمام دوستوں اور پڑوسی خواتین کو دعوت دی۔ سب ہی نے اس کے وزن میں نمایاں کمی کو خوب سراہا مگر اسے لگا بیٹھے جلنے والے ابھی بھی اس سے کچھ چل رہے ہیں۔

ایک نے کہا۔ ”ہاں سارہ وزن میں کمی تو ہوئی ہے تم اسماٹ بھی لگ رہی ہو مگر یہی بات تو یہ ہے تم پہلے جیسی فریش نہیں لگ رہی ہو تمہاری آنکھوں کے گرد حلقے نمایاں ہو رہے ہیں۔“

دوسری بولی۔ ”مجھے تو گردن کی جلد بھی کچھ ڈھلکی ہوئی لگ رہی ہے۔“

تیسری نے طنز کیا۔ ”سارہ.....! مجھے تو تمہارے بال بھی بہت ہلکے لگ رہے ہیں جب تم موٹی تھیں تو تمہارے بال بھی کس قدر موٹے صحت مند سیاہ اور سلکی تھے۔ اب دیکھو تو کس قدر بے جان و بے رونق اور ہلکے لگ رہے ہیں۔“ سارہ نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا واقعی رشاد سچ کہہ رہی تھی۔ تین مہینوں میں پہلے بار سارہ کا دل ڈوبا۔

”کیا یہ باباجی کے چورن کا سائیز انٹیکٹ ہے؟ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا پھر اسے خیال آیا کہ پچھلے کچھ دنوں سے اس کی ماسی بتول شکایت کر رہی تھی کہ باجی آپ نے یہ کیا واش روم کے فرش پر بالوں کا ڈھیر لگایا ہوا ہے ساری نالیاں جب بند ہو جائیں گی تو آپ مجھ کو الزام دوں گی۔ اپنے گرتے ہوئے بالوں کو سنچالا کر دو لیے بھی سر کے گرے ہوئے بال پیروں میں آئیں تو سر میں درد ہوتا ہے جی.....!“

”بس کر دو بتول ہر وقت تو ہم پرستی کی باتیں کرتی رہتی ہو۔ جلدی جلدی ہاتھ چلاؤ کل میلا د کے برتن اور پھیلا دا ابھی سمیٹنا ہے ابھی۔“ دل ہی دل میں کل کی اپنی دوستوں کی باتوں کی وجہ سے پریشان تھی۔ سر میں درد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ آئینہ دیکھتی تو سوچتی واقعی میری ایک سانسے سے بہت زیادہ چوڑی ہو گئی ہے اور آج کل اٹھتے بیٹھتے کھٹنوں میں بھی درد محسوس ہو رہا ہے۔

سارہ بہت پریشان ہو گئی رات میں اس نے حسن کو ساری باتیں بتا دیں اور اپنے وزن کم ہونے کا راز بھی بتا دیا۔ حسن نے بہت ڈانٹا اور فوراً باتیں بچے ہوئے چورن کا چار لے جا کر باہر کوڑے دان میں پھینک دیا۔

”آئندہ اس قسم کی کوئی واہیات فضول دوا استعمال مت کرنا اور کسی ڈھونگی فراڈیے باباجی کے پاس جانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے پتا نہیں یہ لوگ چار پیسوں کے لیے کس طرح انسانی جان سے کھیلتے ہیں اور سارہ تم اس قدر بڑھی لکھی اور روشن خیال ہوتے ہوئے بھی ایسے جعلی پیروں فقیروں کے چنگل میں پھنس گئیں اور مجھے بتایا تک نہیں؟“

سارہ سہم گئی اس نے بھی حسن کو اس قدر غصے میں نہیں دیکھا تھا لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب وہ اللہ سے دعا کر رہی تھی کہ یا اللہ! اب کچھ براندہ ہو سب خیر رہے۔

حسن دباڑا۔ ”ہاں..... ہاں..... زہر نکھانک لو..... پھر مصلے پر بیٹھ کر دعائیں مانگو کہ یا اللہ! موت نہ آئے۔ سارہ.....! اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی کبھ دے کر اور کبھی لٹھ لے کر آزمانا ہے۔ موٹاپا اور اسماٹ نیس سب آتی جانی چیزیں ہیں۔ مجھے تمہاری صلاحیتوں اعتماد دوسروں کا خیال رکھنے کی عادت اور احساس ذمہ داری نے اپنا گرویدہ بنایا تھا نا کہ تمہاری جسمانی خوبصورتی نے مانا کہ تم اس وقت خوبصورت تھیں اسماٹ تھیں، موٹی بھی نہیں تھیں مگر سارہ تم یہ حقیقت بھول گئیں کہ وقت کے ساتھ تبدیلی ہی انسانی زندگی کا حسن ہے۔ تم خوبصورت اسماٹ رہتیں زیر و فکر کے ساتھ مگر تمہارے بچے نہ ہوتے یا پھر بچے بھی ہوتے، تم دلی سٹی بھی رہتیں مگر بیمار ہو تیں شوگر بلڈ پریشر یا کینسر جیسی کسی بیماری کا شکار ہو تیں تو کیا ہوتا سارہ، ہمیں ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ تم صحت مند تھیں خوش تھیں اگر وزن کم کرنا اتنا ہی ضروری تھا تو تھوڑی ڈانٹ کٹنول کر تیں واک وغیرہ کرتیں۔ تم ان جعلی پیروں فقیروں کی

الماس فاطمہ ارمان

عزیزت کا سو والا

رسا چغتائی کا خیال

ہنگامہ ہائے گرمی بازاری لے چلے
تہمت سی شے اٹھا کر خریدار لے چلے

زندگی کے بازار میں عزیزت کے ہاتھوں کیلے والی عزیزت کا قصہ عزیزت



چکر بازیوں میں آگئیں یہ تم نے کیا کیا سائرہ؟ وہ سر پکڑ کر بیٹھے تھے کہ اچانک سائرہ کو ابکا پتی محسوس ہوئی وہ واش روم کی طرف بھاگی حسن بھی پیچھے پیچھے آئے واش بیسن میں جا بجا خون کے دھبے نظر آ رہے تھے۔ سائرہ خوف زدہ ہو گئی اور حسن مزید پریشان..... ایک ہفتے کے اندر اندر ہی سائرہ کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے اس کا وزن مزید کم ہو گیا اور سر کے بال بھی تیزی سے جھڑنے لگے سر کے سامنے مانگ والے حصے پر تو سر کی جلد تک نظر آنے لگی تھی جو بال بچے تھے وہ فحشی بے رونق کمزور اور بے جان ہو گئے تھے۔ اسے ہر وقت متلی محسوس ہوتی تھی اور بے انتہا کمزوری بھی وہ وزن جسے وہ پہلے کم کرنا چاہتی تھی اب تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ وہ تو بس جیسے بڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ سانس جن کی کبھی وہ خدمت کیا کرتی تھی اب اس کی خدمت کر رہی تھیں۔ وہ عمر سیدہ اور فریہ ہونے کے باوجود صحت مند تھیں جبکہ وہ خود دائمی مریضہ معلوم ہوتی تھی جس کے سر پر برائے نام بال تھے بے رونق اور بے جان چہرے کے ساتھ زرد پیلی رنگت..... آسنے کے سامنے وہ اپنے آپ کو پہچان ہی نہیں پا رہی تھی۔ وہ رو رہی تھی اس کے آنسو چہرے کو بھگور رہے تھے۔

”اب کیا ہوگا حسن.....؟ اب کیا ہوگا میرے بچوں کا میرا کیا میں مر جاؤں گی؟“ وہ زار و قطار رو رہی تھی اپنے کنا ہوں کی معافی مانگ رہی تھی۔

”ہاں اور کھاؤ زہر پھر کبڑ میں مروں بھی نہیں حیاتِ ابدی کے مزے لوٹوں۔“ حسن کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ اس کا رونا مزید شدت اختیار کر گیا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔

وہ رو رہی تھی سسک رہی تھی۔ ”یا اللہ! مجھے معاف کر دے۔ آئندہ میں ان جعلی بیروں فقیروں

اور باباؤں کی باتوں میں نہیں آؤں گی بلکہ دوسروں کو بھی منع کروں گی۔ یا اللہ! اپنے رسول کے صدقے مجھے معاف کر دے۔ میرے بچوں کو میری ضرورت ہے مجھ گناہ گار کی ذمہ داری لے میرے اللہ! یا اللہ!“

”سائرہ کیا ہوا؟ کیوں بڑبڑا رہی ہو؟“ حسن نے نیند میں کروٹ بدلی اور اس کی طرف منہ کرتے ہوئے بولے۔ ”ارے تم تو پینے میں شرابور ہو رہی ہو کیا ہوا تم کو؟“ وہ پریشانی میں اٹھ کر بیٹھ گئے اور اس کے کندھے جھنجھوڑتے ہوئے بولے۔ ”کیا ہوا سائرہ کیا بات ہے؟ آنکھیں تو کھولو جان من کیوں بڑبڑا رہی ہو؟ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے؟“

وہ بڑبڑائے جاری تھی۔ ”یا اللہ! مجھے معاف کر دے میرے مولا!“ پسنے سے شرابور وجود کے ساتھ جو اس نے آنکھیں کھولیں تو سرتاپا پیار لٹائی آنکھوں کے ساتھ حسن اس کی نظروں کے سامنے موجود تھا اور اس کے قدرے فریبہ مگر صحت مند وجود کے ساتھ صحت مند چمک دار بال ماتھے اور چہرے کے اطراف پھیلے ہوئے تھے۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں دونوں ہاتھوں سے ملتے ہوئے سائرہ نے سوچا۔

”اوہ..... تو کیا وہ سب خواب تھا؟ ہاں یقیناً۔ اس نے دل میں سوچا۔ آج ہی تو مجھے بتول کے ساتھ باباجی کے پاس جانا تھا۔ نہیں..... نہیں..... مجھے کہیں نہیں جانا میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔“

”کیا کہہ رہی ہو جان حسن.....! تم کیسے ٹھیک ہو؟“ حسن نے مخمور نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور سائرہ نے مسکراتے ہوئے حسن کے شانوں میں اپنا منہ چھپالیا۔

.....☆☆.....

میں جو کہانی رقم کر رہی ہوں یہ ایک غریب لڑکی کی ہے۔ وہ چھ بہنوں میں سب سے بڑی بہن تھی۔ غربت کی پجلی میں پسی ہوئی یہ غریب لڑکی غریب آباد کی رہائشی تھی۔ میری ملاقات اس سے لیاری میں ہوئی تھی جہاں میں اپنی دوست کی بیٹی کی شادی میں گئی تھی۔ وہ میری برابر والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ مجھے پہل نظر میں وہ دکھی اور کھوئی کھوئی سی لگی۔ میں کافی دیر تک اس کے چہرے پر چھائی حسرت اور دکھ کو بخور دیکھتی رہی۔ آخر مجھ سے صبر نہ ہوا اور میں نے اس کے اندر کا دکھ جاننے کے لیے اس سے گفتگو کا آغاز کیا۔ سلام دو عا کے بعد اس نے اپنا نام سنبل بتایا۔ وہ اچھی خوش شکل تھی۔ چہرے کے نقش و نگار بتا رہے تھے کہ کبھی ہم پر بہا رہی۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد میں نے اسے بتایا کہ میں ایک معمولی سی رائٹر ہوں چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ لیتی ہوں۔ میری بات پر وہ کھوئی گئی۔ مومخ کی نزاکت دیکھتے ہوئے میں نے اس کو کرایا۔

”سنبل!.....! لگتا ہے تمہارے اندر بھی کوئی کہانی چھپی ہوئی ہے؟“

”ہاں! میری کہانی بہت درد بھری ہے۔ کیا تم مجھ پر ہنسی لکھو گی؟“

”آف کورس! اس طرح تمہارے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا۔“

پھر سنبل نے فون نمبرز کا تبادلہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں جلد ہی آپ کے گھر آؤں گی۔“ ایک مہینہ گزر گیا اس روز اس کا فون آیا۔

”الماس! آپ گھر پہ ہیں میں آ جاؤں؟“

”آ جاؤ۔“ میں نے کہا۔ دو پہر تک وہ میرے گھر پہ موجود سی۔ بچ کے بعد میں سنبل کو اپنے کمرے

میں لے آئی۔

”اب تم آرام سے مجھ سے اپنے دل کی تمام باتیں کہہ ڈالو۔“

وہ کچھ دیر تک خاموش رہی پھر پریشانی سے بولی۔ ”مجھے سمجھ نہیں آتا میں کہاں سے شروع کروں؟ کس زبان سے بتاؤں کہ نہیں کیا ہوں؟“

”تم ریلیکس ہو کر سکون سے سب بتا دو ٹھیک ہے؟“ میری بات سے اسے حوصلہ ملا اور اس نے کہنا شروع کیا۔

”میرے ابا لالو کھیت میں حلیم اور چاول کا ٹھیلہ لگاتے تھے۔ ان کی کمائی سے اماں نے ٹینی ڈال کر ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا تھا۔ اماں ابا کا برابر سے ساتھ دیتیں۔ اماں کی تلے اوپر سات بیٹیاں ہوئیں۔ ہر سال بیٹی کی آرزو میں سات بیٹیوں کی پیدائش کے بعد اماں جوڑوں کے مرض میں مبتلا ہو گئیں۔ وہ سارا دن ہائے ہائے کرتیں اور ہم بہنوں کو گالیوں اور کوسنوں سے نوازتی رہتیں۔ وقت تیزی سے گزرتا گیا ہم چار بہنیں جوان ہو گئیں تو مہنگائی اور غربت سے ابا کی کمر اور جھک گئی۔ ابا دن رات محنت کرنے سے بیمار رہنے لگے تھے۔ رمضان کے مہینے میں ابا کا ٹھیلہ بند رہتا تو وہ گلی گلی ٹھیلے پر سبزی فروخت کرتے۔

ان دنوں رمضان ہی تھے چند ہویں روزے کو ابا گھر سے نکلے تو ان کی طبیعت نامسا ز تھی۔ ان کے سینے میں ہلکا سا درد ہو رہا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا میں نے اور اماں نے انہیں کہا کہ مت جاؤ مگر وہ جانتے تھے شام کا چولہا بھی جلنا ہے اسی لیے وہ ٹھیلہ لے کر نکل گئے۔ شام پانچ بج گئے ابا نہیں آئے۔ ہم سب کا روزہ بھی تھا۔ وہ ٹھیلہ لے کر آتے تو ہمارے لیے پھل فروخت بھی ساتھ لے کر آتے پھر روزے کا

ہی نام ہو گیا۔ ہم نے جیسے تیسے روزہ کھولا پھر رات ہوئی۔ اماں پڑوس میں خالہ سلیمہ کے گھر گئیں کہ ابا کے بارے میں کچھ معلوم کر سکیں کیونکہ ان کے میاں بھی سبزی کا ٹھیلہ لگاتے تھے۔ رات بارہ بجے ایک گلی میں شور اٹھا تب ہمیں یہ روح فرسا خبر ملی کہ ابا کا ایک سیٹ ہو گیا تھا اور ان کا جنازہ آیا تھا۔ پورا محلہ اکٹھا ہو گیا۔ ہمارے گھر میں کھرام مچ گیا۔ سات بیٹیوں کا باپ دنیا چھوڑ کر اور اپنی بیٹیوں کو یتیم کر کے منوں مٹی تلے جا سوا تھا۔

کچھ روز تک محلے والوں نے ہماری مدد کی پھر گھر میں قاتلوں کی نوبت آنے لگی۔ میں سب سے بڑی تھی چنانچہ میں نے اماں سے کہا۔

”مجھے اور سونیا کو کسی فیکٹری میں کام کرنے دیں۔“ اماں کو بھلا کیا اعتراض ہوتا ان کی خاموشی ہارے لیے اجازت نامہ تھا۔ میں نے پڑوس میں سلیمہ خالہ سے کہا کہ مجھے اور سونیا کو بھی کسی فیکٹری میں کام دلادیں انہوں نے ہمیں فیکٹری میں لگوا دیا۔ وقت کا پریہ گھومتا رہا۔ ہم دونوں ہمیں محنت سے کام کرتے تھے۔ کچھ روز سے میں محسوس کر رہی تھی کہ فیکٹری کا سپروائزر مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ محلے اپنے کام سے کام رکھتی تھی مگر سپروائزر یوسف مجھ سے فریب ہونے کے بہانے ڈھونڈتا۔ ایک دن کھانے کے نام پر اس نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میں ڈرتے ہوئے گئی۔

یوسف نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”سنبل!.....! کیا تم کھانے میں کیا لانی ہو؟“

”سر.....! آلو پا لک کی ترکاری ہے۔“

”اچھا تم اپنا کھانا مجھے بھیج دو اور میرا کھانا جو اس سے منگایا ہے کھا لو۔ میں گھر کا کھانا کھانے کے لیے ترس گیا ہوں۔“ میں نے اپنا کھانا یوسف کو بھیج دیا۔ اس طرح یوسف سے راہ و رسم کا آغاز ہو گیا۔

یوسف ایک خوبصورت اور ایسا پرکشش لڑکا تھا جس کے لیے ہر لڑکی متلاشی ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ مجھے بھی یوسف سے لگاؤ ہو گیا۔ ایک دن میں اس کے کمرے میں کھانا دینے گئی اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

”سنبل!.....! تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو کیا تم تم کہیں باہر مل سکتے ہیں؟“

”یوسف!.....! تمہیں پتا ہے میرے ساتھ میری بہن سونیا بھی ہوتی ہے؟“

”ارے تم سونیا کی فکر مت کرو میرا دوست عاطف سونیا کو پسند کرتا ہے اور وہ دونوں بھی اکیلے میں باہر ملنا چاہتے ہیں۔“

عاطف ہمارا انچارج تھا۔ مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ سونیا کو پسند کرتا ہے۔ میں نے سونیا سے پوچھا۔

اس نے بتایا۔ ”بابی!.....! میں نے کبھی عاطف سے بات نہیں کی مگر وہ مجھے ہر روز پرچی تھا دیتا ہے جس پر یہی لکھا ہوتا ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں تم مجھ سے کہیں باہر ملو مگر بابی!.....! آپ کو کس نے بتایا؟“

مجھے یوسف نے بتایا ہے کیونکہ یوسف کا بھی میرے لیے یہی حال ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے ٹھیک ہے سونیا تم عاطف اور میں یوسف سے مل کر دیکھتی ہوں۔ سونیا خوشی سے سرشار تھی۔

دوسرے دن میں نے یوسف کو کہا کہ میں اور سونیا باہر جانے کے لیے تیار ہیں مگر کام کا کیا ہوگا؟

”وہ ہم سنبل لیں گے تم آس پاس کام کرنے والی عورتوں کو بتا دینا ہم کل نہیں آئیں گے۔“

ہم نے اسی طرح کیا، دوسرے دن ہم نہیں تیار ہو کر گھر سے نکلے۔ عاطف اور یوسف مخصوص جگہ پر ہمارے منتظر تھے۔ وہ ایک کار میں تھے۔ وہ گاڑی سے ایسے راستے سے لے کر جا رہے تھے کہ پتا نہیں چل سکا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ خاصی دیر بعد آبادی سے بہت دور سنسان جگہ پر ایک عمارت کے قریب انہوں نے گاڑی روکی اور پھر کچھ دیر بعد ہم اس عمارت کے ایک فلیٹ میں تھے۔ وہ تین کمروں کا ایک فلیٹ تھا۔ ایک کمرے میں سونیا اور عاطف تھے جبکہ دوسرے کمرے میں یوسف اور میں۔ فلیٹ میں ہر چیز موجود تھی۔ کچھ دیر بعد یوسف کو لٹڈرنک لے آیا جسے پی کر میں مدہوش ہو گئی۔ سونیا کے ساتھ بھی یہی ہوا اور پھر ہم دونوں یوسف اور عاطف کے ہاتھوں لٹ گئے۔ شام میں ہمیں ہوش آیا تو یوسف اور عاطف کے علاوہ دو آدمی اور تھے جن میں ایک فیکٹری کا منیجر اور دوسرا کوئی اجنبی تھا جسے میں نہیں جانتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کیمرہ تھا جس سے اس نے ہماری عزت پاہل ہونے کا تمام منظر فلم بند کر لیا تھا۔ جب ہم ہوش میں آئے تو غصے سے ہمارا برا حال تھا۔ ہم نے یوسف اور عاطف کو گریبان سے پکڑ لیا، مجھ سے زیادہ سونیا پاگل ہو رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ عاطف کو جان سے مار دیتی۔ ان دونوں نے ہمیں دھمکی دی کہ اگر تم نے کسی کو کچھ بتایا تو ہم یہ فلم سب کو دکھا دیں گے پھر تم کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہو گی۔ ہم بری طرح چھٹن چکے تھے۔

”ٹھیک ہے، ہم کسی کو نہیں بتائیں گے۔“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”اب تم بہنیں فیکٹری نہیں جاؤ گی بلکہ صبح تیار ہو کر ہمارے ساتھ اسی فلیٹ پر آؤ گی تم اپنا خلیہ ٹھیک کر لو۔ عاطف تمہیں گاڑی میں تمہارے گھر کے

پاس چھوڑ دے گا۔“ میں نے اور سونیا نے اپنا خلیہ درست کیا۔

یوسف نے مجھے اور سونیا کو دو دو ہزار روپے تھماتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو تم پورے مہینے بھی محنت کر کے اتنا نہیں کما سکتی ہو۔ ہمارے کہنے پر چلو گی تو تم اپنے گھر کی حالت بدل سکتی ہو۔“

اُس وقت سونیا اور میں ایک دوسرے سے نظریں نہیں ملا پا رہے تھے۔ گھر آ کر میں نے ہمت کر کے سونیا کو تسلی دی۔

”تم پریشان نہ ہو۔ میں ان کے لیے کام کروں گی۔ اگر ہم نے ان کے خلاف آواز اٹھائی تو ہمارے ساتھ ساتھ ہماری چھوٹی بہنوں کی زندگی اور عزت بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔“

”آپا.....! مجھے لگتا ہے یہ پورا گینگ ہے جو ہم جیسی ”محموم لڑکیوں“ کو پھاس کر یہ دھندہ کر رہا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو سونیا، مگر اب تم نہیں جاؤ گی۔ صرف میں ان کا ساتھ دوں گی۔“

”نہیں آپا.....! میں آپ کو اکیلا نہیں چھوڑوں گی چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ پھر میرے بہت منع کرنے کے باوجود وہ صبح مجھ سے پہلے تیار ہو کر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

ہم دونوں بہنیں یوسف کے بتائے ہوئے راستے پر کھڑے ہو گئے۔ ٹھیک گیارہ بجے عاطف گاڑی لے کر آ گیا۔ فلیٹ پر جانے کے بعد ہم دونوں الگ ہو گئے۔ آج فیکٹری کے منیجر کی جگہ دو لڑکے کمرے میں موجود تھے جو کسی امیر تیلی کے بیٹے ہوئے نوجوان تھے ان کے پاس شراب کی بوتل بھی تھی جسے وہ کو لٹڈرنک ملا کر پی رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں یوسف کے ساتھ ایک لڑکی سوار

ہوئی جس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔ اس نے آتے ہی مجھے کہا۔

”تم میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آؤ۔“

”نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

”اٹھ حرام زادی..... تجھے میں قتل نہیں کر رہی“ یوسف نے کہا ہے تجھے تیار کرنے کو آج تجھے بتاؤں گی روز تجھے تیار ہو کر کمرے میں آنا ہوگا۔“ اس نے میری کلائی پکڑی اور کھینچتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئی جہاں سونیا تیار ہو رہی تھی۔ سونیا پر میری نظر پڑی تو شرم کے مارے سردی میں بھی میرے سینے چھوٹ گئے سونیا کا لباس اتنا مختصر تھا جس کا پہننا نہ پہننا برابر تھا۔

”آپا.....! آپ بھی میری طرح خاموشی سے تیار ہو جائیے، کیا فائدہ شہلا آپ کو گالیوں سے نوازے۔“ شہلا اس لڑکی کا نام تھا جو مجھے پہلے ہی گالی سے نواز چکی تھی۔ سونیا میک اپ کے بعد اور بھی حسین لگ رہی تھی۔ جب میرے کپڑے آئے تو وہ بھی سونیا سے مختلف نہیں تھے۔ میں نے منع کیا تو شہلا نے قدرے پیار سے کہا۔

”دیکھو سنبل.....! میں بھی تمہاری طرح ان لوگوں کے ترغذ میں پھنسی ہوئی ایک غریب لڑکی ہوں۔ میری ماں ہسپتال میں زندگی اور موت سے لڑ رہی ہے اسے کیسر ہے جس کا علاج بہت مہنگا ہے۔ اسی لیے ذلت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔ عزت سے پیسا نہیں ملتا تو ہم جیسی لڑکیاں سینے جرم کا سودا کر کے گھر کو چلانے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اگر ہم نے یوسف کا کہنا نہ مانا تو وہ ہمارے ساتھ پر تیزاب پھینک کر ہمیں کہیں کا نہ چھوڑے گا۔“

”ماتے چار لڑکیوں کا انجام دیکھا ہے۔ باغی ہونے پر یوسف نے ان زندہ پر تیزاب ڈال کر

انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ آج تک کوئی یوسف جیسے درندے کو پکڑ نہ سکا۔ یوسف اس گینگ کا سربراہ ہے، بڑے بڑے لوگ اس کے پیچھے ہیں۔ اس فلیٹ کے علاوہ اور بھی فلیٹس ہیں جہاں لڑکیاں دھندہ کرتی ہیں۔“

یہ تمام باتیں سن کر میرے حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ شہلا نے میری حالت کو دیکھتے ہوئے پاس رکھے جگ سے مجھے پانی پلایا اور تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں میری جب ضرورت پڑے اس نمبر پر فون کر کے مجھ سے بات کر سکتی ہو۔ آہستہ آہستہ سب سمجھ جاؤ گی۔

سونیا الگ کمرے میں چلی گئی تھی اور میں تیار ہو کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ دونوں لڑکے نشے میں مدہوش لی وی پر فٹس فلم دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں عمر میں مجھ سے بھی چھوٹے تھے وہ مجھے دیکھتے ہی پاگلوں کی طرح مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ شام تک وہ مجھے نوپتے رہے۔ جب ان کا دل بھر گیا تو وہ چلے گئے اور میں اپنی بدبختی پر آنسو بہانے لگی۔ رورو رو کر خود کو سنبھالا۔ کچھ دیر بعد یوسف آ گیا اور ہم دونوں بہنوں کو دو دو ہزار روپے تمھادے۔

اب یہ ہمارا معمول بن گیا، ہم روز اسی طرح گھر سے نکلتے اور شام گئے لوٹتے۔ ماں نے کتنی دفعہ پوچھا کہ یہ کیسا کام ہے جو اتنی دیر میں آتی ہو؟ ہم نے ماں کو تسلی دی کہ ہم اور نام لگاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ پیسے کما کر گھر کے حالات بہتر بنا سکیں۔

عزت کے بدلے آنے والی رقم سے ہمارے گھر کے حالات اچھے ہونے لگے۔ وقت گزرتا رہا اور چھوٹی بہنیں بھی بڑی ہو گئیں۔ شہینہ اور نازو کے محلے میں سے رشتے آنے لگے۔ میں نے اماں سے کہا کہ ان کی شادی کر دو۔ میں نہیں

نسیم سحر

ایسی دیوانگی نہ دیکھی

طلعت اخلاق احمد کا خیال
آؤ ہم چاہتوں کی کاشت کریں
پت جھڑوں کے عذاب رہنے دو

شہر محبت میں شان سے جینے والوں کی ایک یادگار کہانی



سے پیار کرتی تھی۔ جب یوسف کو ہوش آیا تو میں ہی اس کے قریب تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔
”مجھے معاف کر دو سنبل.....! میں نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ میں تو معافی کے قابل بھی نہیں ہوں۔ خدا بھی شاید مجھے معاف نہ کرے مگر مجھے حالات نے ایسا بنا دیا۔ میں بھی اچھی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔“

میں چپ چاپ یوسف کی باتیں سن رہی تھی اس سے کیا کہنی کیونکہ عورت ایک بار کسی سے محبت کرتی ہے تو پھر ہمیشہ اس کے دل میں وہ محبت رہتی ہے۔ میں بھی یوسف سے اب بھی محبت کرتی تھی۔ ایک ہفتہ بعد یوسف بھی دنیا چھوڑ گیا۔ کچھ دن گزرنے پر میں نے فلیٹ فروخت کر دیا اور اماں سے کہا کہ غریب آباد کا گھر بیچ کر ہم کسی اور جگہ گھر لے لیتے ہیں۔ اس طرح ہم نے لیاری میں پلاٹ لیا اور اچھا سا گھر بنوایا۔ ایک فلور پر اماں کو ایک مدرسہ بنوایا۔ اب اماں تمام دن غریب بچوں کو قرآن کی مفت تعلیم دیتی ہیں اور اپنی دنیا میں من رہتی ہیں۔ چھوٹی بہن صفیہ دو سال بعد ڈاکٹر بن جائے گی۔ ہاں سونیا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ بس میں زندہ ہوں دیکھیے میری زندگی کا اختتام کب ہوتا ہے۔ بیٹے دنوں کو میں بھولنا چاہتی ہوں مگر بھلا نہیں پاتی۔ بس اللہ سے اپنے گناہوں کی توبہ کرتی اور دعا کرتی ہوں۔ خدا ہر غریب کی بیٹی کی عزت سلامت رکھے اور بیٹیوں کے نصیب اچھے کرے۔ اب میرا صرف ایک ہی خواب ہے کہ میرا رب میری بہن صفیہ کو جلدی سے ڈاکٹر بنا دے پھر میں سکون سے مر سکوں۔

☆☆☆

چاہتی تھی ان کا انجام ہماری طرح ہو۔ اس طرح میں نے اور سونیا نے لڑکوں کو پسند کر کے دونوں بہنوں کی شادی عزت کے ساتھ کر دی۔ ابھی تین بہنیں اور تھیں جن کی فکر مجھے اور سونیا کو تھی۔ اماں چاہتی تھیں پہلے ہماری شادی ہو جائے میرے اور سونیا کے بھی رشتے آئے مگر ہم دونوں نے اماں کو سمجھایا کہ اگر ہم شادی کر کے بیٹھ گئے تو گھر اور چھوٹی بہنوں کا کیا ہوگا؟ وقت کا یہیہ تیزی سے گھومتا گیا۔ اس دوران جانے کب سونیا کو انجکشن کے نشے کی لت لگ گئی شاید وہ اس طرح اپنا غم بھولنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانی اس کی صحت دن بدن گرنے لگی۔ بہر حال اسی طرح پانچ سال گزر گئے ہمارے گھر کے حالات روز بروز بہتر ہوتے چلے گئے۔ ہمارا گھر پہلے سے بہتر ہو گیا تھا۔ صائمہ اور رونی کی بھی شادی ہو گئی۔ چھوٹی بہن کو ڈاکٹر بننے کا شوق تھا لہذا اسے پڑھنے دیا گیا۔

ایک دن یوسف عاطف اور شہلا فلیٹ پر آئے تو کچھ پریشان سے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”سنبل.....! ہم کچھ دن کے لیے لاہور جا رہے ہیں۔ کچھ لڑکیاں خرید کر لانا ہیں۔ جب تک ہم نہیں آجاتے تم ہر چیز کا خیال رکھو گی۔ فلیٹ کی چابی سونیا کے پاس ہے اس کا بھی خیال کرو۔ وہ بہت زیادہ نشہ کرنے لگی ہے۔“ ان کے جانے کے تیسرے دن جناح اسپتال سے فون آیا کہ ان تینوں کارا سے میں ایک میٹ ہو گیا ہے اور وہ جناح ہسپتال میں ہیں۔ سونیا اور میں پچھتے تو پتا چلا کہ عاطف اور شہلا مر چکے تھے جبکہ یوسف ICU میں تھا۔

یوسف کی موت پر سونیا اتار دئی جیسے وہ اس کا سہاگ تھا۔ شاید وہ اب بھی عاطف

بہت دن ہو گئے تھے وقار بھائی ہمارے گھر نہیں آ رہے تھے۔ میں نے رضی بھائی سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وقار آج کل مصروف ہے اور پریشان بھی۔

وقار بھائی ہمارے محلے میں رہتے تھے اور ہمارے رضی بھائی کے بچپن کے دوست تھے۔ دونوں نے اسکول کالج ساتھ ہی پڑھا تھا۔ دونوں گھرانوں کے افراد ایک دوسرے کے گھر آنا جانا تھا۔ وقار بھائی کی کوئی بہن نہیں تھی ایک بھائی نادر تھا۔ وہ ہمیں اپنی سگی بہنوں کی طرح سمجھتے تھے۔ ہمارا اُن کے گھرانے سے تعلق رشتے داروں سے بڑھ کے تھا۔ وقار بھائی بہت سبکی ہوئی طبیعت کے نرم خُو انسان تھے۔ ہر ایک کی مدد کرنا لوگوں کے کام آتا اُن کی فطرت میں شامل تھا۔ جب وقار بھائی کالج میں تھے تو ہم نے سنا تھا کہ کوئی لڑکی اُن کو پسند کرنے لگی ہے۔ یہ بات رضی بھائی نے ہمیں بتائی تو ہم بہت حیران ہوئے تھے کیونکہ وقار بھائی ان چیزوں سے کوسوں دور تھے۔ اُس روز جب وقار بھائی گھر آئے تو میں نے اُن کو پوچھا۔

”وقار بھائی.....! کیا چکر ہے یہ ہم کیا سن رہے ہیں؟“

”کیا بات ہے؟ کیا سنا ہے؟“ انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

”اوہو اب بتیں نہیں سب پتا ہے مجھے۔“ میں نے رضی بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے رضی بھائی کی طرف دیکھا تو رضی بھائی نے آنکھوں آنکھوں میں انہیں اشارتاً کچھ کہا جس پر وقار بھائی شیشا گئے۔

”وہ..... وہ.....“ اُن کے منہ سے نکلا۔

”ارے بھی اب بتا بھی دیں آخر ہم ہی کام

آئیں گے۔ آخر خالہ کو کون منائے گا؟“ میں نے شرارت سے کہا۔

”ایسی کوئی بات نہیں جب ہوگی بتا دوں گا۔“ انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

دن گزرتے رہے رضی بھائی اور وقار بھائی دونوں نے تعلیم مکمل کی اور پھر عملی زندگی میں قدم رکھ دیا۔ ملازمت ملتے ہی امی نے رضی بھائی کے لیے لڑکیاں دیکھنا شروع کر دیں جلد ہی ایک لڑکی پسند آ گئی اور ہم نے شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنے دوست کی شادی میں وقار بھائی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور ہر کام آگے بڑھ بڑھ کر انجام دیا۔ پوری شادی کے دوران ہم انہیں چھیڑتے رہے کہ چاہیں تو آپ بھی کوئی لڑکی پسند کریں مگر ہماری چھیڑ چھاڑ پر وہ صرف مسکرانے پر اکتفا کرتے۔

ہمارے بھائی کی شادی کے بعد اب وقار بھائی کی امی یعنی خالہ بھی چاہتی تھیں کہ وہ اُن کی بھی شادی کر دیں۔ خالہ نے کہہ دیا تھا کہ اگر انہیں کوئی لڑکی پسند ہے تو بتائیں ورنہ پھر وہ اپنی پسند سے کر دیں گی۔ کچھ دنوں بعد ہم نے سنا کہ اس کالج والی لڑکی نے خود ہی وقار بھائی کو پوز کر دیا کیونکہ اُس نے ابھی تک اُن کا پچھا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ مسلسل فون کرتی تھی اور ملنے کا بھی اصرار کرتی۔ اس کا نام آنت تھا۔ خولصورت اور اچھے خاندان کی تھی۔ پڑھی لکھی تھی اور وقار بھائی کو دیوانگی کی حد تک پسند کرتی تھی۔ وہ جتنی جذباتی تھی وقار بھائی اتنے ہی ٹھہرے ہوئے مزاج کے تھے۔ کم گو اور سادہ طبیعت کے مالک حالانکہ کالج میں کئی لڑکیوں نے اُن کے قریب ہونے کی کوشش کی مگر اُن کی سرد مہری دیکھ کر پیچھے ہٹ گئی تھیں مگر آنت تو دیوانی تھی اُس نے کالج کے بعد بھی اُن سے رابطہ رکھا اور آخر ایک دن اُس نے

انہیں پوز کر دیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دے دی کہ اگر وہ شادی نہیں کریں گے تو وہ خود شادی کر لے گی۔ اس صورت حال میں وقار بھائی کا پریشان ہونا فطری تھا۔ انہوں نے ماں کو بتایا۔ ماں کو بھلا کیا اعتراض ہوتا وہ رشتہ لے کر گئیں۔ جب دونوں طرف پسندیدگی تھی تو پھر کیا مسئلہ جلد ہی دونوں کی شادی ہو گئی اور آنت بیاہ کر وقار بھائی کے گھر آ گئی۔ وہ اچھی بیوی اور گھڑ بھوات بھائی تھی۔ خالہ کو اُس سے کوئی شکایت نہ تھی اور وقار بھائی کی تو وہ دیوانی تھی وہ ایک منٹ بھی اُن کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ وقار بھائی آفس میں ہوتے تو وہ بہانے بہانے سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد فون کرتی۔ جب اُن کے گھر آنے کا ٹائم ہوتا تو تیار ہو کر دروازے پہنچ کر کھڑی ہو جاتی۔ اُن کی پسندنا پسند کا خیال رکھتی۔ غرض کہ بس خالہ حیران تھیں کہ وہ اُن کے بیٹے کو اتنا چاہتی ہے۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا اور اُن دونوں کی شادی کو تین سال ہو گئے۔ وقار بھائی کے کوئی اولاد نہیں ہوئی جبکہ اس عرصے میں رضی بھائی کے دو بچے ہو گئے تھے۔ جب گھر کا آئکن ٹونار ہا اور رشتے داروں میں بھی چہ بیگو بیاں شروع ہوئیں تو خالہ کو بھی احساس ہوا اُن کی بھی خواہش تھی کہ گھر میں پوتا پوتی کی رونق آئے۔ وقار بھائی کو بھی بیٹی کی خواہش تھی کیونکہ اُن کی کوئی بہن نہیں تھی۔ ایک روز خالہ نے باتوں باتوں میں آنت سے ہسپتال چلنے کا کہا تو وہ ہنس کر ٹال گئی۔ اس طرح مزید دو سال گزر گئے۔ آنت میڈیکل چیک اپ کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھی اور اس معاملے میں وہ اپنے محبوب شوہر وقار بھائی کا کہنا بھی نہیں مان رہی تھی۔

اُن دنوں وقار بھائی کو چند دنوں کے لیے

آفس کے کام سے شہر سے باہر جانا پڑا۔ آنت نے بھی اُن کے ساتھ چلی گئی۔ گھر میں خالہ اور نادرہ رہ گئے۔ خالہ کئی دنوں سے گھر کی صفائی کا سوچ رہی تھیں۔ اب اُن کے جانے کے بعد خالہ نے سوچا کہ کمرے خالی ہیں تو صفائی کر لی جائے۔ انہوں نے ماسی کے ساتھ کمروں وغیرہ کی صفائی شروع کر دی۔ پردے وغیرہ بدلوائے آنت کے کمرے میں ماسی سے بیڈ وغیرہ بھی صاف کرنے کا کہا۔ ماسی نے جھکنے کے لیے جیسے ہی بیڈ کا گدا اٹھایا تو اس میں سے ٹیلیٹس کے پتے گرے۔ خالہ نے جھک کر اٹھائے تو حیرت سے اُن دوا بیوں کو دیکھنے لگیں۔ شام میں وہ اُن گولیوں کو قریبی میڈیکل اسٹور پر لے گئیں تو اُن پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ یہ بالغ حمل گولیاں تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ اُن کی بہو آنت نے حرکت بھی کر سکتی ہے۔ اب وہ بے چینی سے بہو بیٹے کی واپسی کا انتظار کرنے لگیں۔ کچھ روز بعد جب وہ دونوں واپس آئے تو انہوں نے قدرے نرمی سے اُن دوا بیوں کے بارے میں پوچھا تھا۔

”میں اپنے اور وقار کے بیچ میں کسی کو بھی برداشت نہیں کر سکتی اسی لیے یہ دوائیاں استعمال کرتی ہوں۔“

”کیا.....؟“ وقار بھائی نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”مگر وہ ہماری اولاد ہوگی۔“

”کوئی بھی ہو۔“ آنت کا اطمینان قابل دید تھا۔

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا پانگل ہوگی ہو؟“ وقار نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

یہ بات جب آنت کے گھر والوں تک پہنچی تو انہوں نے بھی بیٹی کو سمجھانے کی کوشش کی مگر

جلدیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

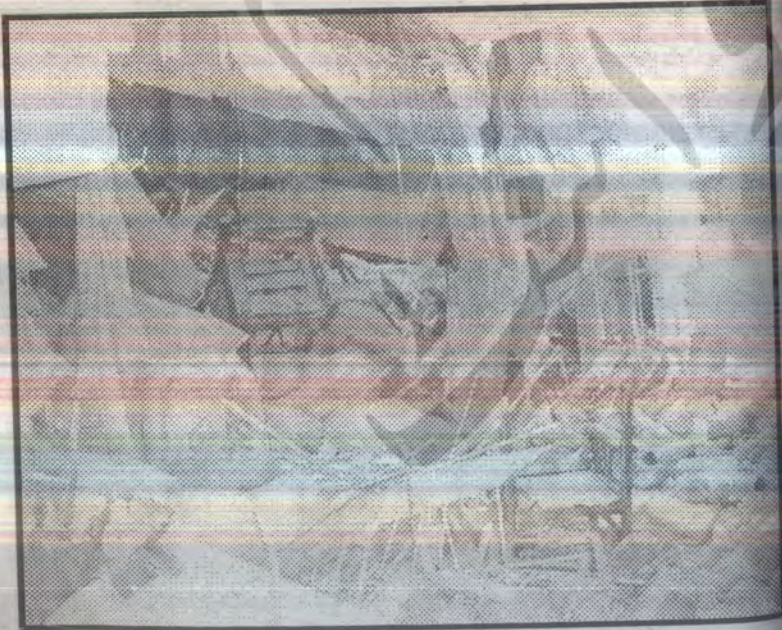
پروین حیدر

رزقِ آتش

پروین حیدر کا ہی خیال

کرب ملے ہیں ضبط سے بڑھ کے
لمحہ عمر ہے، عرصہ ماتم

ساتھ عباس ناؤن سے مربوط ایک غم آلود، زندہ کہانی



کیا کریں؟ جیسے جیسے ڈیوری کے دن قریب آ رہے تھے آمنہ پر گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی وہ روٹی جاتی تھی اور سب سے معافی مانگتی جاتی تھی۔ ڈاکٹر زیادہ پر امید نہیں تھے۔ خالہ اور آمنہ کی امی نمازیں پڑھ کر دعائیں کر رہی تھیں۔

ایک صبح آمنہ کی حالت بگڑنے لگی تو اس کو لیبر روم لے جایا گیا۔ اس وقت میکے اور سسرال کے سب لوگ جمع ہو گئے اور دعائیں کرنے لگے۔ تقریباً چار پانچ گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد تھکی تھکی سی ڈاکٹر باہر آئی تو سب ہی بے قراری سے اس کی جانب لپکے۔ ڈاکٹر نے خوشخبری سنائی کہ ماں اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔ اس خبر پر سب ہی نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ وقار بھائی کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ وہ اپنے مہربان رب کا شکر ادا کرنے لگے۔ واقعی اللہ کا کرم تھا کہ دونوں ماں بیٹی بچ گئی تھیں۔

آج وہ بچی ماشاء اللہ ایک سال کی ہے اور آمنہ اسے بے حد پیار کرتی ہے۔ پہلے اس نے متا کے جذبے کو محسوس ہی نہیں کیا تھا مگر جب وہ حمل سے ڈیوری تک کے مراحل سے گزری اس تکلیف نے اسے باور کرایا کہ دنیا میں محبت کی کئی قسمیں ہوتی ہیں صرف وہی محبت نہیں ہوتی جو وہ وقار سے کرتی تھی بلکہ متا کی محبت بھی خاص رتبہ رکھتی ہے۔ وقار کی محبت نے اسے یہ رتبہ دلایا تھا۔ وہ اب بھی وقار بھائی سے بہت محبت کرتی ہے مگر جذباتی انداز میں نہیں اور وقار بھائی بھی پہلے سے زیادہ اس کا خیال رکھتے ہیں اور وہ دونوں مل کر اپنی بیٹی کا۔ خالہ بھی بہت خوش ہیں کیونکہ وہ بھی اپنی پائل ہو کو بے حد چاہتی ہیں جو ان کے بیٹے کی دیوانی ہے۔

☆☆☆

وہ کسی کی بات ماننے کو تیار نہ تھی۔ آخر وقار بھائی نے اس سے بات چیت بند کر دی۔ آمنہ سے اپنے محبوب شوہر کی بے رخی برداشت نہ ہوئی لہذا اسے اولاد کے لیے راضی ہونا پڑا۔ آخر اللہ کے فضل و کرم سے چند ماہ بعد گھر میں یہ خوشی کی خبر گونجی کہ آمنہ امید سے ہے۔

وقار بھائی بے حد خوش تھے۔ خالہ کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ آمنہ کے گھر والے بھی خوش تھے، غرض سب ہی نہال تھے سوائے آمنہ کے، وہ خاموش سی ہو گئی تھی۔ سب نے وقتی غصہ سمجھ کر اس کی خاموشی پر خاص توجہ نہیں دی البتہ اس کا خیال رکھنے لگے مگر آمنہ دن بہ دن کمزور ہونے لگی چالانکہ ڈاکٹر اس کا مستقل چیک اپ کر رہی تھی اور اسے اچھی غذا فراہم کی جا رہی تھی۔ حمل کے پانچویں ماہ میں الٹرا سائونڈ کرنے پر معلوم ہوا کہ لڑکی ہے۔ وقار بھائی بہت خوش ہوئے۔ تھوڑے دن اور گزرے تو

آمنہ کی حالت خراب ہونے لگی اس سے کچھ کھایا پیا ہی نہیں جاتا تھا کمزوری انتہا کی ہو گئی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی خلاؤں میں گھورتی رہتی۔ سب ہی اس کی دلجوئی میں لگے رہتے۔ آٹھویں ماہ اس کی حالت مزید بگڑنے لگی تو اسے ہاسپٹل میں داخل کرانا پڑا تب پتا چلا کہ اس نے مسلسل کئی سال جو مانع حمل گولیاں کھائی تھیں ان ہی کی وجہ سے اندرونی پیچیدگی ہو گئی تھی۔ آمنہ روئے لگی تھی اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ بچے اور وقار کے ساتھ بھی بہت زیادتی کی تھی۔ ڈاکٹر کو خدشہ تھا کہ ہونے والی بچی ایب نارل ہو یا ماں اور بچے کی جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ سب ہی پریشان تھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

بیٹیوں سے بڑے تھے۔

جب تک ہمارے بچے چھوٹے تھے ہم مینے پندرہ دن میں ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے رہے مگر بچے جیسے بڑے ہوتے گئے ان کے کام پھیلنے گئے اور ہم لوگوں کی مصروفیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لیلیٰ اور میں دنیا داری سے زیادہ گھرداری کو ترجیح دیتے تھے سو ہم اب اکثر ٹیلی فون پر ایک دوسرے کی خیریت معلوم کر لیتے تھے کبھی اس کی بیٹیاں میری بیٹیوں سے ملنے آ جاتی تھیں تو کبھی میری بچیاں مسعود کے ساتھ لیلیٰ کے گھر چلی جاتیں مسعود کی عابد بھائی سے خوب بنتی تھی اس لیے وہ دونوں ایک دوسرے کو بڑی اچھی کہتی دیتے تھے۔

ہم لوگ ان دنوں اسکیم 33 میں رہائش پذیر تھے۔ بیس سال پہلے وہ جگہ شہر کے ہنگاموں سے دور اور بہت پرسکون تھی آبادی بھی اتنی گنجان نہیں تھی زیادہ تر بنگلے زیر تعمیر تھے۔ دس سال بعد جب آبادی غیر معمولی ہو گئی اور ہر قسم کے ٹریفک کی وجہ سے وہاں شور شرابہ بھی رہنے لگا تب ایک دن لیلیٰ نے بتایا کہ..... عابد بھائی اپنا یہ گھر سیل کر کے یہاں سے اور آگے جہاں چند ہی بنگلے آباد ہوئے ہیں جانا چاہتے ہیں۔ اسی دوران میں لیلیٰ نے مجھے پہلی بار یہ بتایا تھا کہ عابد بھائی جو بظاہر ٹھیک نظر آتے ہیں بچپن سے ہی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں اور کبھی کبھی ان پر ڈپریشن کا دورہ سا پڑتا ہے انہیں ہجوم شور اور گنجان جگہوں سے وحشت ہوتی ہے اسی لیے جیسے جیسے یہاں آبادی بڑھتی جا رہی ہے ویسے ویسے عابد کا یہ علاقہ چھوڑ کر کسی نئی جگہ میں چل کر رہنے کا اصرار زور پکڑتا جا رہا ہے۔

میں نے مسعود سے کہا تھا کہ آپ عابد بھائی کو سمجھائیں اس ایریا میں سب سے خوبصورت بنگلہ انہی لوگوں کا ہے۔ بچیوں کا اسکول اور کالج بھی زیادہ

دور نہیں ہے اتنے اچھے گھر کو چھوڑ کر کہیں اور آباد ہونا جبکہ شہر کے حالات بھی ٹھیک نہیں رہتے مناسب نہیں ہے..... مسعود نے انہیں کافی کنوینس کیا مگر اچھے اچھے کھوئے کھوئے سے عابد بھائی تو جانے کا پکا ارادہ کر چکے تھے۔

میں نے اور مسعود نے یہ بات محسوس کی تھی کہ ان کے ذہن میں کوئی نفسیاتی گرہ ہے جو انہیں بیٹھے بیٹھے گرد و پیش سے بھی بے گانہ کر دیتی ہے اور کبھی کبھی وہ غیر حاضر دماغ بھی ہو جاتے ہیں..... لیلیٰ نے ان کی جو داستان سنا لی وہ کچھ یوں تھی۔

عابد بھائی جب چار سال کے تھے تب ان کے والد روڈ ایکسڈنٹ میں انتقال کر گئے تھے۔ ان کی والدہ اُس وقت بالکل نوجوان تھیں یہی کوئی پچیس چھیس سال عمر تھی ان کی بیوہ ہونے کے کچھ عرصے بعد ہی ان کے سسرالی رشتے داروں نے انہیں منحوس اور جنم جلی جیسے خطابات سے تو ازنا شروع کر دیا تھا۔ عابد بھائی کی والدہ پہلی کبھی تھیں شوہر کے انتقال کے بعد انہوں نے بینک میں اپلائی کیا اور انہیں آسانی سے بینک میں جا ب مل گئی۔ سسرال میں ان کا گھر سے نکلتا یعنی جا ب کرنا (جبکہ ایک چھوٹے سے بچے کی کفالت بھی انہی کی ذمہ داری تھی۔) پسند نہیں کیا گیا اور انہیں تنگ کرنے کا ہر وہ حربہ استعمال کیا گیا جس سے گھبرا کر وہ سسرال سے چلی جائیں اور ایسا یہی ہوا وہ اپنے میکے چلی آئیں۔

لیکھ بھی کوئی اتنا پرسکون جائے امان ثابت نہیں ہوا۔ عابد بھائی کی نانی کا سلوک اپنے پر بچے کے ساتھ معاندانہ اور طنز بھرا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ان کے دس بچے ایک دوسرے سے بدظن تھے طعنہ شکن طنز بدزبانی یہ وہ رویے تھے جو ان کی نانی

سے ان کے تمام بیٹوں اور بیٹیوں میں منتقل ہوئے تھے یہاں ان کے بھائیوں بھاد جوں کے طنز بیوگی کے طعنے اور پھر نانی کی بدزبانی نے تین سال ان دونوں ماں بیٹیوں کو عذاب میں مبتلا رکھا تھا خصوصاً عابد بھائی کے ساتھ تمام گھر والوں نے اچھوتوں والا سلوک روا رکھا ہوا تھا۔ ان سے کوئی کھانا کھانے تک کے لیے کہنے کا روادار نہ تھا۔ ان کی والدہ بینک سے آ کر انہیں کھانا کھلاتیں ان کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پورا کرنا ان کی ماں نے اپنا ایمان بنا لیا تھا مگر برا ہوا اس بے حس معاشرے اور اس میں بسنے والے لوگوں کا کہ ایک یتیم بچے کی دلجوئی کرنے کے بجائے اُسے ہجوم نے اتنا تنہا کر دیا کہ وہ اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا اور پھر اسی دوران میں عابد بھائی کی والدہ نے اپنے بینک ہی کے ایک کو لیگ رضی احمد صاحب (جن کی بیوی تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو روتا بلکتا چھوڑ کر سفر آخرت پر جا چکی تھیں۔) کے پروپوزل کو اپنے بھائیوں کے سامنے رکھا تھا۔ بھائی بھاد جوں تو بے بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ اور ان کا بیٹا اپنا ٹھکانہ نہیں اور بنا لیں سو ایک دن وہ بہت سادگی کے ساتھ رضی صاحب سے نکاح کر کے ان کے گوشے عافیت میں آ گئی تھیں کہ یہ معاشرہ کسی جوان مصیبت زدہ اور تنہا عورت کو آزادی سے جینے اور سکون سے مرنے کی اجازت کہاں دیتا ہے!!

رضی صاحب نے ان دونوں کو اپنے تینوں بچوں سمیت ایک مضبوط سائبان بھی دیا اور بے پناہ محبت بھی مگر اس کے ساتھ ایک ایسے بھی ہوا کہ اپنی ماں کی محبت ان بچوں میں تقسیم ہوتے دیکھ کر عابد بھائی کچھ کچھ نفسیاتی ہو گئے۔ ماں کی اکائی کو ٹکڑوں میں بٹنے اور اس کی محبت کو تمام بچوں کے لیے ایک

انداز میں تقسیم ہوتے دیکھ کر انہیں پریشانی ہوتی تھی حالانکہ رضی صاحب اپنے بچوں سے زیادہ عابد بھائی پر توجہ دیتے تھے وہ اپنی گاڑی میں آگے عابد بھائی کو بٹھاتے تھے کہ میرا بڑا بیٹا آگے بیٹھے گا اور اُن کے بچے ہمیشہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ خریداری کرتے وقت بھی عابد بھائی کی پسند و ناپسند کو نویت دی جاتی تھی مگر لگتا تھا حالات کے جبر نے اُن کے اندر کی خود اعتمادی کو ختم کر دیا ہے اور انہیں اپنے اکیلے ہو جانے کا احساس ہر لمحہ خوف زدہ رکھتا ہے اور یوں بھی بچپن کا کوئی بھی ناخوشگوار واقعہ کبھی کبھی سوہان روح بن جاتا ہے۔

عابد بھائی کو اپنے والد کی موت کا منظر یاد تھا جو وہ ساری زندگی بھلا نہ پائے پھر والد کے بعد عدم تحفظ کے خوف نے اُن کی زندگی کو اجرن کیے رکھا۔ ماں نے ہر لمحہ انہیں سمیٹنے کی کوشش تو کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکیں کہ اُن پر رضی صاحب کے تین بچوں کی بھی ذمے داری تھی۔ بینک کی جاب چھوڑ کر انہوں نے گھر اور بچوں کو سنبھال لیا تھا دوسری طرف رضی صاحب نے ان تمام افراد کو بہت خوش دلی سے اپنا تو لیا تھا مگر وہ ذات کا خلفشار اور ذہنی اذیتیں جو اپنے والد کی وفات کے بعد ان ماں بیٹے نے سہی تھیں عابد بھائی کے ذہن پر ایسی نقش ہوئیں کہ پھر وہ کبھی کسی رشتے پر اعتبار نہ کر سکے اور سو تیلے بہن بھائیوں کے درمیان بھی وہ الگ تھلگ اور تنہا ہی رہے۔ اُس گھر میں اتنی آسودگی اور محبت ملنے کے باوجود انہیں ایک کمی کا احساس تھا۔ بہت بچپن میں اُن کے دل میں بچے گاڑ کر بیٹھ جانے والا تنہائی اور عدم تحفظ کا خوف اُن کے دل سے کبھی نکل ہی نہیں سکا۔ انہیں زیادہ لوگوں اور شور شرابے سے الجھن ہوتی تھی۔

لیلیٰ، عابد بھائی کی یونیورسٹی میں کلاس فیلو تھی

لڑکی دیکھنے رابعہ فلادور گئی تو بالکل اتنا تھا مجھے لیلیٰ اور عابد بھائی رابعہ فلادور کے گیٹ کے پاس ہی مل گئے تھے چہرے سے بہت بہتر نظر آ رہے تھے میری ملاقات برسوں بعد ہوئی تھی اس لیے اُن میں یہ تہذیبی مجھے اچھی لگی تھی۔

”تم یہاں کہاں لیلیٰ؟“ میں نے گلے ملتے ہوئے لیلیٰ سے دریافت کیا تھا۔

اُس نے بتایا تھا کہ ”بیٹیوں کی شادی کے بعد عابد کو سناٹے سے وحشت ہونے لگی تھی ہر وقت چہچہانے والی چیزوں کے اڑ جانے کے بعد گھر کی نموشی عابد کو پریشان کرتی تھی۔ ہم دو افراد کے لیے شاز بنگلوں بہت بڑے تھے سو اُس سناٹے کی جگہ کو چھوڑ کر ہم نے اثراء ٹی میں ایک چھوٹا فلیٹ اور ایک شاپ خرید لی ہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آب شاپ پر عابد کا دل بھی لگتا ہے اور یہاں آ کے یہ خوش بھی ہیں۔“

عابد بھائی کا کہنا تھا کہ..... ”ساری عمر بچوں میں رہ کر بھی میں تنہا رہا ہوں یہاں چہل پہل اور رونق ہے میرے اہل دل یہاں لگ گیا ہے اور پھر آب اس عمر میں نہیں چاہتا ہوں عمروں تو کم از کم میرا جنازہ تو پر بچوں ہو کہ پر بچوں جنازے نصیب والوں کے ہی ہوتے ہیں۔“

لیلیٰ نے اپنے فلیٹ چلنے کے لیے بہت اصرار کیا تھا مگر لڑکی والوں کو میں نے ٹائم دیا ہوا تھا اس لیے اس دن معذرت کر کے میں نے بہت جلد آنے کا وعدہ کیا تھا۔

عابد بھائی نے وہیں کھڑے کھڑے بالکل مین روڈ پر سے اپنے فلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”کھلا ہوا دار اور صاف تھرا فلیٹ جو دودھ کی دکان کے اوپر ہی ہے آنا تو نشانی یاد رکھنا۔“

میں کئی روز سے لیلیٰ کے گھر جانے کا پروگرام بنا رہی تھی کہ..... وہ قیامت گزری جو کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی دودھ کی دکان کے بالکل نزدیک ایک درندہ صفت کے رکھے ہوئے بم نے بلاسٹ ہو کر قیامت صغریٰ پھا کر دی تھی..... کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تھوڑی ہی دیر پہلے جہاں زندگی رواں دواں تھی وہ جگہ کچھ ہی لمحوں میں کھنڈر بن جائے گی اور پلک جھپکتے سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

قیامت کا وہ منظر میں کبھی بھول نہیں پاؤں گی جب تمام شہداء کے ساتھ عابد بھائی کو بھی اُن کی آخری آرام گاہ لے جایا جا رہا تھا۔ اتنے پر بچوں جنازے میں نے بہت ہی کم دیکھے ہیں لوگ ہی لوگ تھے جو چھڑ جانے والوں کو احترام کے ساتھ سسکیوں کے شور میں اپنے کان دھوں پر اٹھائے اُن کی حتیٰ اور یقینی منزل کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہے تھے۔

لیلیٰ اس حادثے میں شدید زخمی ہوئی تھی مگر زندگی باقی تھی کہ وہ بچ گئی تھی..... اسپتال میں اُس نے مجھ سے کہا تھا۔ ”ایک عابد کا دکھ ہو تو برداشت کر لوں یہ تو اُن گنت تباہ ہونے والے گھرانوں کا مشترکہ دکھ ہے ایک وحشی انسان کے مکروہ عمل کی وجہ سے انسانیت کے سینے میں ایک ایسا گھاؤ لگا ہے جسے بھرنے کے لیے صدیاں درکار ہیں میرا زخم تو بہت معمولی ہے کہ یہاں تو ایک ایک گھر کے کئی کئی لوگ اس مرگ ناگہانی کی بھینٹ چڑھ گئے ہیں۔ والی و وارث اور گھر کے چراغ تو گئے ہی مگر اُن کے خواب اُن کے گھر سب کے سب رزق آتش بن گئے.....!“

☆☆☆

احترام کریں۔ میں یہ بات جانتی ہوں کہ اگر اہل
اجازت نہیں دی تو وہ شادی نہیں کرے گا۔ آپ
لوگ کیا چاہتے ہیں کہ وہ ساری زندگی اسی طرح
گزارے!

میرے میاں کچھ دن تو اپنی بات پر جھے
رہے تھے لیکن پھر میرے بیٹے کی ایک نون کال
نے جس میں اُس نے کہا تھا۔ ”ابو.....! میں
آپ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرتا اور نہ ہی
آئندہ کبھی کروں گا۔“ اس بات نے ایک دم
اچانک ہی انہیں وہ محبت کرنے والا باپ بنا دیا
تھا جو اولاد کی خوشی کی خاطر سب کچھ نچھاور
کر دیتا ہے پھر یہ کہ شادی میرے بیٹے اور اُس
جاپانی لڑکی نے پاکستان میں آ کر کی تھی۔ لڑکی
کے والدین اور بہن بھائی بھی اس شادی میں
شریک ہوئے تھے۔ اگرچہ میری بہو ہماری
زبان نہیں سمجھتی تھی پھر بھی وہ ہمارے درمیان
بہت خوش تھی اور پھر شادی کے ایک ماہ بعد ان
دونوں کی جاپان واپسی ہو گئی تھی۔ جانے کے
بعد میرا اپنے بیٹے سے زیادہ بہو سے نیت اور
ٹیلی فونک رابطہ رہنے لگا تھا۔ ایک سال بعد
ہمارا بیٹا پڑھائی مکمل کر کے پاکستان واپس
آ گیا۔

میرا پیارا بیٹا اپنی ہائر اسٹڈی مکمل ہونے کے
بعد میری پیاری بہو کے ساتھ جاپان میں جاب کی
بہت اچھی آفر کے باوجود ہماری اور اپنے وطن کی
محبت میں پاکستان آ گیا تھا لیکن ابھی میرے بیٹے
کو یہاں آنے ہوئے دو سال بھی نہیں ہوئے تھے
کہ کراچی کے حالات اور زیادہ خراب ہونے لگے
تھے خاص طور پر ڈاکٹروں کے لیے حالات بالکل
سازگار نہ رہے تھے اور جب میرے بیٹے کے کئی
ساتھی ڈاکٹرز بے گناہ قتل کر دیئے گئے تو ہم بھی

بہت پریشان رہنے لگے۔ آغا خان ہسپتال جہاں
میرا بیٹا ڈیوٹی دے رہا تھا ہمارے گھر سے زیادہ
دور نہیں تھا۔ ہم کے ڈی اے میں رہتے تھے لیکن
جب تک بیٹا گھر نہیں آ جاتا تھا ہم گھر والے خصوصاً
ہم ساس بہو گھر کے گیٹ کے پاس ٹھہرتے اور اُس
کے خیریت کے ساتھ آنے کی دُعا میں مانتے
رہتے تھے۔

میرا بیٹا اپنے پروفیشن میں بہت ماہر اور
نامور تھا اور وہ یہی سوچ کر پاکستان آیا تھا کہ
اپنے ملک کے لوگوں کی خدمت کروں گا مگر
یہاں کراچی میں تو دہشت گردی کا نہ ختم ہونے
والا ایک عذاب تھا، غریب پرورش کراچی جس
نے ہمیشہ سب کو پناہ دی تھی روزگار دیا تھا، جہاں
ہر نسل اور ہر عقیدے کے لوگ مل جل کر رہتے
تھے یہاں نہ جانے کس نے آگ لگائی تھی کہ
سب کچھ جل گیا۔ پہلے شیعہ ڈاکٹروں کا قتل
شروع ہوا پھر ساتھ ہی ساتھ سنی ڈاکٹرز بھی
مارے جانے لگے۔ ہم لوگ بہت زیادہ خوف
زدہ رہنے لگے ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ کوئی
بری خبر نہ آ جائے، کہیں کوئی ظالم بے رحم میرے
بیٹے کی جان نہ لے لے۔ حالات کسی صورت
سدھرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے تو ہم سب
یہ سوچنے لگے کہ میرے بیٹے کو یہاں سے چلے
جانا چاہیے وہ جہاں بھی جائے مگر پاکستان سے
چلا جائے اسی میں ہم سب کی بہتری ہے۔ اُسے
اس ملک میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، ان
لوگوں کا علاج کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جن
کے ساتھ رہنے اور جینے والے بے گناہ انسانوں
کو قتل کر رہے ہیں۔ ویسے بھی اُس کی تعلیم
صلاحیتوں اور پروفیشنل اپروچ کے لحاظ سے
اُسے کچھ زیادہ نہیں مل رہا تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ پرانا کراچی کہیں کھو گیا ہے۔ ہم
پاکستان میں نہیں، کہیں اور آ گئے ہیں۔ کبھی ایسا لگتا
اور ہم سوچتے کہ حالات درست ہو جائیں گے
کراچی ہمیشہ ایسا نہیں رہے گا اس شہر میں بھی امن
وامان ہو جائے گا۔ آخر کو یہ ہمارا ملک ہے جسے ہم
نے قربانی دے کر بنایا ہے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور
پھر ہم سب نے متفقہ طور پر یہی فیصلہ کیا کہ میرے
بیٹے کو پاکستان سے چلے جانا چاہیے اور پھر آخر کار
وہ چلا ہی گیا تھا۔ ان دنوں اُس کا قیام آسٹریلیا میں
ہے اور وہ وہاں بہت خوش باش زندگی گزار رہا
ہے!!

میں آج اپنے بیٹے سے بہت دور ہوں
لیکن اُس کی سلامتی میرے لیے باعث
اطمینان اور خوشی ہے مگر وہ ماں کیا کرے، کہاں
جائے اور کس سے فریاد کرے جس کا بیٹا صبح گھر
سے زندہ جاتا ہے اور شام یا رات کو لاش آتی
ہے؟ آج کراچی میں نہ جانے کتنی ماںیں اور
کہیں ہیں جن کے بیٹوں اور بھائیوں کی نعشیں
انہیں اپنے ہوش سے بے گناہ کر دیتی ہوں گی۔
میں یہ سوچ رہی ہوں کہ جب یہ نعشیں آئیں
اور فریادیں آسمان کے پردوں کو چیرتے
ہوئے آسمان اور زمین کے مالک تک پہنچیں گی
تو پھر کیا ہوگا؟

کچھ عرصہ پہلے میں اپنے بیٹے کے پاس
آسٹریلیا گئی ہوئی تھی ایک دن میری بہو مجھے ایک
ایسی جگہ لے گئی جہاں زیادہ تر مقامی مرد اور
عورتیں مگر وہاں ہندوستان پاکستان، بنگلہ
دیش، سری لنکا وغیرہ کے لوگ بھی تھے۔ سب
بہت پیار و محبت سے مل رہے تھے یہاں کسی بھی قسم
کا کوئی لسانی یا مذہبی تعصب نہیں تھا، وہاں کسی

مسلمان کو اسلام خطرے میں محسوس نہیں ہو رہا تھا
جو ہمارے یہاں ہر دم محسوس ہوتا ہے بلکہ محسوس
کرایا جاتا ہے۔ خیر وہاں جب میری بہو نے میرا
تعارف کراتے ہوئے انہیں بتایا کہ میں پاکستان
سے آئی ہوں تو وہاں کی ایک مقامی خاتون نے
مجھے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ”وہ
پاکستان جہاں دہشت گرد ہوتے ہیں؟ جہاں
روز ہم پھٹتے ہیں؟ جہاں عورتوں کے ساتھ زیادتی
کی جاتی ہے؟ جہاں بچوں کو تادان کے لیے اغوا
کیا جاتا ہے اور روزانہ ٹارگٹ کلنگ میں لوگوں کو
مارا جاتا ہے؟“

کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ ہمارے ملک
کے لوگ کس قدر افلاس، بے روزگاری اور
بیماریوں میں جکڑے اور ناانصافیوں کے ستارے
ہوئے ہیں۔ جو ظالم ہیں وہ دوسروں کے پورے
پورے خاندان اپنی ذاتی جیلوں میں قید کر دیتے
ہیں۔ زمین جائیداد کو چھاننے کے لیے اپنی بیٹیوں
کی شادی قرآن سے کر دیتے ہیں۔ اپنی بیٹیوں کو
کاری قرار دے کر ہلاک کر دیتے ہیں جو عورتوں
کے تقدس کو پامال کر دیتے ہیں، چوری کرتے ہیں
اور ڈاکہ ڈالتے ہیں اور تادان کے لیے بچوں کو
اور مردوں کو اغوا کرتے ہیں اور کراتے ہیں۔ ان
ظالموں نے ہمارے ملک کو پوری دنیا میں کس
طرح رسوا کیا ہے، انہی کی وجہ سے ہمارا ملک
دہشت گردوں اور ڈاکوؤں کا ملک گردانا جاتا ہے
حالانکہ ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے
اور نجانے کیوں وہ یہ بات بھول جاتے ہیں
کہ..... انہیں ایک نہ ایک روز وہاں بھی جانا ہے
جہاں زندگی کا حساب اور جہنم کا حساب ان کا منتظر
ہے!!

☆☆☆

جیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

صدف آصف

نور ہدایت

سید معین اختر نقوی کا خیال
مجھ سے جو کچھ بھی تو کروا تا ہے کر دیتا ہوں
مرے اندر یہ کوئی اور نہیں ہے تو ہے

ایک دلجو جوان کی محبت اور معرفت سے کندھا قصہ خاص



نور نے فجر کی ادائیگی کے بعد ابھی تلاوت شروع ہی کی تھی کہ دروازے پر دستک ہونے لگی۔ اس نے قرآن شریف کو احترام کے ساتھ رہتی غلاف میں لپیٹا اور کیمپ کے اوپری خانے میں رکھ دیا..... اور جب دروازے پر جا کر دیکھا تو محمد احمد کو دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اس کا شوہر خلاف معمول مسجد سے جلد لوٹ آیا تھا۔

”نور.....! آج میرے ساتھ ناشتے پر چیکب آباد ایک مہمان بھی ہے، امید ہے کہ تمہیں برا محسوس نہیں ہوگا۔“ احمد نے اسی نرمی سے بیوی کو مخاطب کیا جو اس کے مزاج کا خاصہ تھی تاہم اس نے نور کی آنکھوں سے چھلکنے والے سوال..... کون اور کیوں آیا ہے سے نظریں چراہی تھیں۔ وہ شوہر کی مزاج آشنا تھی اس لیے چاہتے ہوئے بھی سوال نہ کر سکی۔ ”جی، اچھا۔“ بول کر چکن کی طرف روانہ ہو گئی..... دوسری طرف احمد نے بیوی کی سمجھداری کو دل میں سراہا کیونکہ وہ ابھی تفصیل بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

”موہن لال، آؤ ہاتھ منہ دھولو۔“ نور نے ناشتہ بناتے ہوئے احمد کی آواز سنی۔ ناشتہ تقریباً تیار تھا۔ اس نے خستہ بل والے برائوں کے ساتھ باریک پیاز اور ہری مرچ کتر کے آلیٹ بنایا تھا۔ رات کی بچھیا اور بیٹھا دہی بھی مہمان کی تواضع کے لیے رکھ دیا تھا..... نور نے سارے پاکستانی کھانے پڑوس میں رہنے والی زبیدہ خالہ سے پکانے سکھے تھے جنہوں نے احمد کو اپنا پیٹا بنایا تھا اور نور کو اس کی رشتے کی نسبت بہو پکار کر انھیں مگر بیٹیوں سے بڑھ کر چاہتی تھیں۔

موہن لال سے احمد کو اپنے باپ کے مرنے کی خبر ملی تھی اسی لیے وہ بہت افسردہ تھا مگر وہ اس کی آخری رسومات میں شریک نہیں ہو سکتا تھا اس لیے

افسردہ بیٹھا دوست سے اپنے باپ کا ذکر کرتا رہا تھا۔ اُس روز بہت دنوں بعد اُن کے معمولات زندگی میں فرق آیا تھا ورنہ فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد احمد کانی دیر مسجد میں گزارتا تھا پھر گھر آ کر نور کے ساتھ ناشتہ کرتا تھا۔ اس کے بعد دفتر روانہ ہوتا تھا۔ نور ٹیبل پر ناشتہ لگا کر احمد کو مطلع کر دیتی تھی، اگر وہ کسی کام میں الجھ جاتی تو اس کا شوہر خاموشی سے بیٹھا اس کی راہ نکلتا پھر بیٹھنے سے اس کو افس سے دیر ہو جانی مگر وہ نور کے بغیر ناشتہ نہیں کرتا تھا۔ نور کو اپنے شوہر کی اس ادا پر بہت پیار آتا تھا۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر پہلے احمد کے ساتھ ناشتہ کرتی تھی پھر کوئی دوسرا کام تاکہ وہ وقت پر اپنے کام پر روانہ ہو سکے۔

☆.....☆

احمد کے ساتھ نور کی شادی کو دو سال ہو گئے تھے مگر اسے کبھی بھی ایسا محسوس نہ ہوا تھا کہ وہ ایک ”نومسلم“ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ احمد کی شخصیت میں ایک توازن تھا۔ وہ ہر کام ترتیب اور نظم و ضبط سے کرنے کا عادی تھا، چاہے وہ دنیاوی معاملات ہوں یا دنیوی، یہ ہی وجہ تھی کہ اُن دونوں کی دو سالہ شادی شدہ زندگی میں کوئی بے سکونی نہیں تھی۔ نور کو پاکستان بہت اچھا لگتا تھا۔ اسے یہاں کہ لوگوں سے ایک انسیت اور محبت ہو گئی تھی اور اب تو ویسے بھی یہ ملک ہی اس کا گھر تھا ورنہ اس کی پیدائش ”ملائیشیا“ کی تھی۔

اُس دو پہر نور ابھی صفائی وغیرہ کر کے فارغ ہی ہوئی تھی کہ زبیدہ خالہ پیالے میں کڑھی لیے چلی آئی تھیں۔

”جی خالہ.....! کیا لائی ہیں؟“ نور نے اردو بولنا احمد سے ہی سیکھی تھی ورنہ اس سے قبل اسے ملائی

بھاشا اور انگریزی پر عبور حاصل تھا۔ شروع میں وہ احمد سے بات چیت کرنے کے لیے انگریزی زبان کا سہارا ہی لیتی تھی پھر اسے جلد ہی تھوڑی تھوڑی اردو بولنا آگئی تھی۔

”اے بیٹا.....! آج صبح سے کڑھی پکار رہی تھی اب جا کر پکی ہے تو میں نے سوچا کہ تمہیں دے آؤں۔“ انہوں نے محبت سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ نور اپنے وطن کی تہذیب کے مطابق ان سے مصافحہ کرنے کے بعد ان کے ہاتھ پر احتراماً بوسہ دے گی۔ ملائیشیا میں یہ رواج ہے کہ چھوٹے اپنی عمر سے بڑے افراد سے ہاتھ ملانے کے بعد ان کی ہاتھ کی پشت پر پیار کرتے ہیں۔

”بیٹھے نا خالہ.....! میں آپ کے لیے ٹھنڈا بناتی ہوں۔“ نور نے انہیں کرسی پر پیش کی۔

”ارے بیٹا.....! کیوں تکلیف کرتی ہو؟ چھوڑو، آکر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے تکلفاً منع کیا ورنہ اس شدید گرمی میں ان کا بھی حلق خشک ہو رہا تھا۔

”بس خالہ.....! ابھی آئی۔“ نور مسکراتے ہوئے بولی اور بچن میں جا کے گلاس میں تیز تیز شربت گھولنے لگی۔

”میرا بچہ ابھی آفس سے نہیں آیا؟“ خالہ نے احمد کے بارے میں پوچھا۔

”جی..... بس آتے ہی ہوں گے، ان کو آپ کے ہاتھ کی کڑھی بہت پسند ہے، بہت خوش ہو جائیں گے۔“ وہ ہنسی تو اس کے موتیوں جیسے دانت چمک اٹھے..... نور کارنگ سانولا تھا، وہ دبلی پتلے تھی، اس کا ناک نقشہ بھی عام ملائی لڑکیوں کی طرح تھوڑا پھیلا پھیلا سا ہی تھا پھر بھی وہ دیکھنے والی آنکھ کو بھا جاتی تھی، شاید نور کے اندر کا ابلجاپن اس کی شخصیت کی روشنی کو اجاگر کرتا تھا۔

”آج تو بڑی گرمی ہے۔“ زبیدہ خالہ نے شربت کا گلاس غماغٹ پینے کے بعد کہا تھا۔

”جی، آپ نے صحیح کہا، یہاں گرمی بہت پڑتی ہے، ہمارے ملائیشیا میں زیادہ بارشیں ہونے کی وجہ سے موسم میں گرمی کی حدت کچھ کم ہو جاتی ہے۔“ نور نے اپنے وطن کے موسم کو بے اختیار یاد کیا۔ خالہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

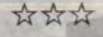
”یہ لیں خالہ.....! سارہ کو میری طرف سے آم دے دیجیے گا۔“ نور نے خالی برتن میں دو بڑے بڑے آم رکھ کر خالہ کی پوتی کے لیے دیئے۔

”ارے بیٹا.....! یہ کیا بات ہوئی، تم بھی خالی برتن واپس نہیں کرتی ہو، ہمیں یہاں چھانچیں لگتا۔“ خالہ نے نور کو پیار سے دیکھا۔

”بس خالہ! یہ ہمارے ملک کی روایت ہے کہ بڑے بیویوں کے برتن خالی واپس نہ بھیجوں۔ میری نانی تو کہتی تھیں کہ اگر دینے کے لیے کچھ نہیں ہے تو چاول ہی ڈال دو اس طرح محبتیں بڑھتی ہیں۔“ نور نے محبت سے ان کے ہاتھ چومے تو انہوں نے اسے گلے لگالیا۔

احمد بہت ہی نفیس شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اپنا گھر صاف تھرا دیکھنا چاہتا تھا مگر وہ کوئی کام کرنے کے لیے نور پر زور نہیں ڈالتا تھا۔ آفس سے گھر آنے کے بعد اپنے چھوٹے نمونے کام خود ہی کر لیتا تھا بلکہ گھر کے کاموں میں بھی بیوی کی تھوڑی بہت مدد کر دیتا تھا اس لیے احمد کے آنے سے قبل نور اچھے خاصے کام نمٹاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ مسکرائی ہوئی ڈسٹنگ کر رہی تھی اور سامنے سائیز میبل پر رہی احمد کی تصویر تھی۔ اس نے بغور تصویر کا جائزہ لیا احمد کارنگ قدرے دیتا ہوا تھا مگر وہ پرکشش شخصیت کا مالک تھا، خصوصاً اس کی حرانگیز آنکھیں جنہوں نے شادی کے پہلے دن سے نور پر جا دو کر دیا تھا، اسے کو پتا ہی نہیں

چلا کہ وہ کب اپنے کم گو، صابر اور محبت کرنے والے شوہر کے عشق میں گرفتار ہو گئی۔ نور اور احمد کی ملن کہانی کچھ اونٹنی سی تھی۔



نور ان کا خاندان ”جوہر بارو“ میں رہتا تھا۔ یہ ملائیشیا کا ایک سرحدی علاقہ تھا جو ایک طرف سے سنگاپور سے جاملتا ہے۔ اس کا باپ علی عابدین سنگاپور میں نوکری کرتا تھا اس لیے ان سب کو یہاں رہنے میں آسانی تھی کیوں کہ یہاں سے چلنے والی بس آدھے گھنٹے میں علی عابدین کو سنگاپور پہنچا دیتی تھی۔ نور کو اپنا علاقہ بہت پسند تھا کیوں کہ اکثر سنگاپور گھومنے والے سیاح یا وہاں کے رہائشی اس کے علاقے میں آجاتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی یہاں چیزیں سنگاپور کے مقابلے میں بہت سستی تھیں، کھانے پینے کی چیزیں، پھل فروٹ، یہاں تک کہ سگریٹ بھی ان کو کم دام میں مل جاتی تھی۔ کچھ لوگ تو صرف بال کٹوانے کے لیے ہی ان کے علاقے میں آتے تھے کیوں کہ ملائی روپیہ ”رنٹ“ سنگاپورین ڈالر کے مقابلے میں سستا تھا..... نور اپنے گھر والوں کی مدد کرنے کے لیے اپنی کالج کی چھٹیوں میں یہاں پھولوں کا انشال لگاتی تھی۔ اس طرح اس کا سیاحوں سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا جن سے بات چیت کے دوران اس کو اچھی انگلش بولنا آگئی تھی۔ نور بھی اپنے کالج ”نان بیگ“ جانے کے لیے بس کے ذریعے سنگاپور کا سفر کرتی تھی جہاں سے وہ ”پیپلز آف برنس ایڈمنسٹریشن“ کر رہی تھی۔ وہ کمپیوٹر کا بھی ایک سنجیکٹ پڑھ رہی تھی اس لیے اس کے والد نے گھر میں بھی اسے ایک کمپیوٹر لا دیا تھا۔

منیٹ پر چینیٹنگ کرنا نور کو زیادہ پسند نہ تھا مگر وہ کبھی کبھی آن لائن آکر امریکا میں مقیم اپنی کزن

سے بات چیت کر لیتی تھی۔ اسی طرح ایک دن ”اسلام“ کے ”نک“ سے چیٹ کرنے والے ایک لڑکے سے اس کی بات چیت شروع ہوئی۔ نور اس اس کی مختلف مذاہب کے حوالے سے معلومات اور دین اسلام کے بارے میں کیے جانے والے بعض سوالات پر چونک جاتی تھی۔ اکثر ان سوالات کا جواب دینے کے لیے اسے اپنا نانا سے رجوع کرنا پڑتا تھا جو اسلامک سینٹر سے منسلک تھے۔ اس طرح ان کی دوستی گہری ہوئی جلی گئی مگر ان دونوں نے بھی اپنی ذاتی باتیں ایک دوسرے سے ڈسکس نہیں کی تھیں۔

”اسلام“ کی نہ صرف مذہب اسلام بلکہ دوسرے عقائد کے بارے میں بھی معلومات غضب کی تھیں، خصوصاً ”ہندوازم“ کے بارے میں اکثر وہ کچھ نہ کچھ بتاتا رہتا تھا۔ ان لوگوں نے بعد میں وائس چیٹ کے ذریعے آپس میں انگلش میں گفتگو کا سلسلہ بڑھایا تھا۔

وہ بہت عمدہ گفتگو کرتا تھا۔ نور پہلی بار کسی مرد سے متاثر ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک ماہ چلا۔ آخر نور سے برداشت نہیں ہوا اور اس نے اسلام کا اصل نام جاننے کی کوشش کی جسے بتانے سے وہ اکثر کترا جاتا تھا۔

”میرا نام سنر لال ہے۔“ اس جواب کے بعد تو نور سکتے میں آگئی تھی۔ چار پانچ روز تک تو وہ کمپیوٹر کے آس پاس بھی نہ پھرتی کیوں کہ وہ پیداؤی مسلمان تھی اور اپنے مذہب سے اسے بہت لگاؤ تھا۔ تاہم اصل حقائق جاننے کے لیے اسے دوبارہ آن لائن ہونا پڑا۔ دوسری طرف وہ خود بھی بہت بے چین تھا اس لیے اس نے نور سے درخواست کی وہ پہلے پوری بات سن لے پھر چاہے تو اس سے قطع تعلق کر لے۔

غزل

جب ضرورت پڑی نہیں مانگی
بھیک ہم نے کبھی نہیں مانگی
کر لیے سب قبول ہم نے غم
زندگی سے خوشی نہیں مانگی
پیار ہم نے کیا اندھیرے سے
چاند سے روشنی نہیں مانگی
اس لیے در بدر بھٹکتا ہوں
عشق مانگا خودی نہیں مانگی
لطف آنے لگا جدائی میں
جب ملن کی گھڑی نہیں مانگی
کون آکر بنا گیا شاعر
ہم نے تو شاعری نہیں مانگی

حکیم خان حکیم

اپنے سے بھی چھپاتی تھی۔
”اگر میری پوری بات سنو گی تو شاید تمہاری
ناراضگی خوشی میں بدل جائے۔“
”ٹھیک ہے، بولو اب تمہارے پاس اپنی صفائی
میں کہنے کے لیے کیا ہے؟“ نور نے اسے ایک موقع
دینے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ اپنی داستانِ حیات سنانے لگا۔ ”میرا تعلق
پاکستان کے شہر جیکب آباد سے ہے۔ ہمارے دادا
پردادا شروع سے اس علاقے میں آباد تھے۔ میرا
تعلق ایک کٹر ہندو مذہبی گھرانے سے تھا۔ میرے
باپ کی شہر میں اچھی خاصی جائیداد تھی جسے انہوں
نے گرانے پر دیا ہوا تھا۔ وہ خود بھی کپڑے کے
بڑے بیوپاری تھے۔ خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ مجھے
بچپن سے ہی مسلمانوں سے لگاؤ سا تھا اسی لیے
اسکول میں آنے کے بعد میں نے زیادہ تر مسلمان
لڑکوں سے دوستی کی۔ اسکول میں میری سب سے
زیادہ ایک لڑکے مصطفیٰ سے بنتی تھی جس کے والد سید
عالم صاحب مجھے ٹیوشن پڑھاتے تھے۔ وہ ہمارے
اسکول کے ہیڈ سٹری تھے۔ ان کے گھر کا ماحول بہت
مذہبی تھا۔ میرا بچپن اس کے آگن میں کھیلنے کودنے
گزرنا۔ مصطفیٰ کی والدہ جب بھی خوش الحانی سے
قرآن شریف کی تلاوت کرتیں، میں ان کی آواز کے
سحر میں کھوسا جاتا اور پھر جب میں اکیس سال کا ہوا
تو میرا دل اپنے مذہب سے پھر گیا۔ مجھے پوجا پاٹ
کرنا بہت کھن لگنے لگا تھا۔ شاید میں بھی ان خوش
نصیبوں میں شامل ہونے جا رہا تھا جسے اللہ نے
ہدایت کے لیے چن لیا تھا۔“

نور خاموشی سے اس کی داستان سن رہی تھی۔ لمحہ
بھر رکنے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوا۔ ”میں جب بھی
اذان یا تلاوت سنتا، میری آنکھوں میں آنسو آجاتے
میرا رواں رواں کپکپا جاتا اور دل کی دھڑکن تیز ہو

”تم اسی لیے ناراض ہو نا کیوں کہ میرا
نام ”سندر لال“ ہے؟“ وہ افسردگی سے بول رہا تھا۔
وہ دونوں واٹس چیٹ کے ذریعے بات کر رہے تھے۔
”نہیں میں تمہاری منافقت پر ناراض ہوں، تم
نے مجھے ایک عام سی لڑکی سمجھا جو مردوں سے دوستی
کی شیدائی ہوتی ہیں، انہیں اس سے کوئی فرق نہیں
پڑتا کہ دوسری طرف کون ہے؟“ نور نے غصے سے
کہا۔

”نہیں نور! ایسی بات نہیں ہے۔ اگر میں
تمہیں صرف ایک لڑکی سمجھتا تو تم سے ”وڈو چیٹ“
کرنے پر اصرار کرتا۔ میں نے تو اب تک تم کو دیکھا
بھی نہیں ہے۔“ وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوا پھر دوبارہ
بولتا۔ ”کیا میں نے کبھی کوئی ایسی بات کی جس سے
تمہاری عزت اور احترام میں فرق اور حرف آیا ہو؟“
وہ پر جوش انداز میں بولتا چلا گیا۔ نور ادا ہی دل میں
اس کی تمام باتوں کی تائید کرتی چلی گئی۔

”مجھے پھر بھی تم سے یہ پوچھنے کا حق ہے کہ تم
نے ”اسلام“ کا نقاب اوڑھ کر مجھ سے دوستی کیوں
کی؟ میں بھی تمہاری باتوں کی عادی ہوتی چلی گئی۔“
نور نے آنسو کو ہتھیلیوں سے صاف کیا اور بھرائی ہوئی
آواز میں بولی۔

”دراصل میں آج کل جن حالات سے گزر رہا
ہوں، میرے سارے اپنے مجھ سے جدا ہو گئے
ہیں۔ میں سچ بول کر تم کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ اگر
تمہیں یہ پتا چلتا کہ میں مسلمان نہیں ہوں تو کیا
ہماری بات چیت قائم رہتی؟“ اس کا گلیسر لوجہ
اداسیوں کی پلیٹ میں تھا۔

”ہاں..... میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتی
تھی کہ میں ایک ہندو لڑکے سے محبت کر رہی ہوں۔
تمہاری باتوں سے تو میرے دین کی خوشبو آتی تھی۔“
نور نے جذبات میں آ کر وہ بات بھی بتادی جسے وہ

جیتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

کنول عمران خان

صبح کا بھولا

طاعت اخلاق احمد کا خیال
یہ میری زندگی کے سچے دُخم ہیں
کسی کی زلفِ خم کا خم نہیں ہے

اُس لڑکی کی کہانی جس کے شوہر کو اپنی نعلی کا احساس ہو گیا تھا



”تم نے تو..... مجھے ابھی دیکھا بھی نہیں ہے پھر اتنا بڑا فیصلہ اچانک کیوں کر لیا؟“
”میں نے تمہاری پاک روح کو دیکھا، باطن کی خوبصورتی دیکھی ہے، مجھے ظاہری حسن سے کیا لینا دینا۔“ نور زری سے بولی۔
”میرا رنگ کالا ہے؟“ احمد نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

”مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں بھی کوئی پری نہیں۔“ نور ہنستے ہوئے بولی۔

نور نے گھر میں سب سے پہلے اپنے والد سے احمد کی بات کرائی۔ انہوں نے وڈیو کال کے ذریعے ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھا۔ علی عابدین نور کی زبانی احمد کے حالات جان کر بہت متاثر ہوئے۔

اُس نے نور سے بات چیت کے بعد ہی باقاعدہ طور پر اسلام قبول کیا تھا۔ یہ جان کر علی عابدین کو اور بھی زیادہ خوشی ہوئی۔ احمد نے ملائیشیا جا کر اسلامک سینٹر میں نور سے نکاح پڑھوایا اور کاغذی کارروائی کے بعد کچھ ہی عرصے میں نور ہمیشہ کے لیے پاکستان آ گئی۔ اس سلسلے میں پیر عادل راشدی نے ان دونوں کی بہت مدد کی۔ نور رخصت ہو کر حقیقت میں ”پیادہیں سدھاری۔“

احمد کے گھر والوں نے اس کا کلی طور پر بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اس کے باپ نے اسے اپنی جائیداد سے بھی عاق کرنے کا اعلان اخبارات میں چھپوا دیا تھا مگر ان دونوں کو کوئی غم نہیں ہے۔ وہ اپنی دنیا میں خوش ہیں۔ کبھی کبھی بھولے بھٹکے جب احمد کو کوئی پرانا دوست ملنے آتا ہے تو احمد کو یاد آتا ہے کہ اُس کا ماضی کیا تھا ورنہ تو اُس کا حال بس اللہ کے احکامات، نبی کریم کے عشق اور نور کی محبت سے مشروط ہے!!

☆☆☆☆

مسلمان تھے مگر اسلام کی اصل روح ”انسانیت“ پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ ہمارے مذہب میں ذات پات کا کوئی فرق نہیں اور ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے عربی و عجمی کی ایک دوسرے پر نوبت ختم کر کے پرہیزگاری کو ایک مسلمان کے سپر سیر ہونے کی پہچان بتائی تھی مگر یہاں بھی کچھ ایسے نا عاقبت اندیش بھی ملے جو اسلام کے سچے پیروکار صرف انہیں ہی سمجھتے تھے جو پیدائشی مسلمان تھے۔ تم سن رہی ہونا میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ نور کی طرف سے خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا تو احمد نے اپنی کہانی کو سچ میں چھوڑا اور اس سے پوچھا۔

”ہاں میں سن رہی ہوں، تم بولتے رہو۔“ وہ دلچسپی سے سن رہی تھی۔

”خیر کچھ لوگوں نے مجھے ڈھونگنی تک قرار دے دیا مگر میں ہر اُس در پر جاتا جہاں سے مجھے اس سچے دین کے بارے میں علم کا خزانہ ملتا پھر ایک بڑی دین دار اور متمول شخصیت پیر عادل راشدی نے میرا ہاتھ تھاما، انہوں نے میری بھرپور مدد کی، مجھے نوکری دلانی اور رہنے کے لیے اپنے گھر کا گیسٹ روم دیا، یوں میری زندگی کی گاڑی سچ راہ پر چل پڑی۔ یہ سچی میری داستان حیات۔ اب تم سوچ لو کہ کیا میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے؟ میں اب تم سے کل بات کروں گا۔“ احمد یہ بات کر کے آف لائن ہو گیا۔ اس نے نور کو کچھ بولنے کا موقع بھی نہیں دیا۔

نور پوری رات سوچتی رہی، اسے احمد کی سچائی کے لیے کی جانے والی جدوجہد نے بہت متاثر کیا تھا اور پھر فجر کی نماز کی ادائیگی کے ساتھ ہی اس نے ایک بڑا فیصلہ کیا۔ اب اُس کا دل مطمئن تھا۔ اسے دوسرے دن کا بے چینی سے انتظار تھا۔

”مجھ سے نکاح کرو گے؟“ نور نے آن لائن آتے ہی اُس سے یہ سوال کیا۔ وہ ششدر رہ گیا۔

”ناجیہ یار! کبھی ڈھنگ کا سوٹ پہن لیا کرو ہر وقت ماسی بنی رہتی ہو۔ گھر میں کبھی کوئی آجاتا ہے۔ حالت تو دیکھو اپنی۔“ سارہ نے ناجیہ کے بکھرے بال اور دو رنگی شلوار قمیص کی طرف دیکھ کر بے زاری سے کہا۔

”یار میرے سے نہیں ہوتا بناؤ سنگھار میں گھر کے کام کروں یا خود کو سنواروں؟“ ناجیہ بے دلی سے بولی۔

”ناجیہ! کم سے کم کپڑے تو ٹھیک پہن لیا کرو اور بالوں کو گتے دنوں سے کبھی نہیں کی؟“ سارہ نے اُس کے گھونسلہ بنے بالوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کل دھوئے تھے تو اے ہی پچر لگا لیا تھا چل چھوڑنا مجھے تو بتانا کیا کھائے گی؟“ اُس نے ہمیشہ کی طرح بات ٹالی۔

”اپنا حلیہ تو دیکھ تیرے ہاتھوں سے بنا ہوا تو کچھ نہیں کھاؤں گی۔“ سارہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”چل کمیٹی.....“ اُس نے نشن اٹھا کر میری طرف کھینچ کے مارا۔ ”چل آ، کچھ بناتے ہیں۔“

”ایسے نہیں پہلے تو جا اپنا حلیہ ٹھیک کر پھر آنا کیجی میں۔“ سارہ نے اُسے اُس کے بیڈروم میں دھکیلا اور خود کچن میں چلی گئی۔

ناجیہ اور سارہ کی دوستی صرف ایک سال پرانی تھی دونوں کے گھر آنے سانے تھے۔ ناجیہ ایک سال پہلے ہی اس علاقے میں آئی تھی۔ یہ نئی ہاؤسنگ اسکیم تھی جہاں آبادی کم تھی۔ اُس پڑوس میں بہت کم گھر تھے جو تھوڑے بہت پڑوسی تھے وہ آنا جانا نہیں کرتے تھے۔ سارہ تمام دن بور ہو جاتی تھی مگر جب سانے والے گھر میں ناجیہ آئی تو وہ دوسرے ہی دن اس کے گھر چلی گئی۔ ناجیہ کے دو بیچے تھے احمر اور مہک اور اس کا میاں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھا پھر جلد ہی اُن دونوں میں گاڑھی چھنے لگی دونوں اکثر ایک دوسرے کے گھر آتے جاتے بالکل بے تکلفی

والا ماحول تھا۔ سارہ کا ایک بیٹا تھا۔ اس کے شوہر بینک میں منیجر تھے روپے پیسے کی دونوں گھروں میں کمی نہ تھی۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔

سارہ نے اپنے گھر کو بہت اچھے طریقے سے سجایا ہوا تھا۔ جو بھی آتا، تعریف کیے بغیر نہ رہتا مگر ناجیہ اس معاملے میں ذرا لاپرواہی اُس کے گھر میں ہر جگہ ابتری ہی پھیلی رہتی۔ بیچے بھی بہت شرارتی تھے ہر وقت اچھل کود اور اودھم مچائے رکھتے۔ وہ خود بھی بولانی بولانی پھرتی رہتی تھی۔ وہ سارہ کی طرف کم ہی آتی تھی جبکہ سارہ اکثر چلی جاتی تھی۔

سارہ کا بیٹا دو سال کا تھا اس لیے اسکول وغیرہ کا جھنجھٹ نہ تھا۔ وہ صبح جلدی اٹھ جانے کی عادی تھی سو اپنا کام صبح ہی صبح نمٹا لیتی تھی پھر میاں جی کو رخصت کرنے کے بعد کھانا تیار کرتی اور سب کام سے فارغ ہو کر ناجیہ کی طرف چلی جاتی تھی۔ وہاں وہ ایسے ہی بیٹھتی ہوئی ملتی۔ ٹیبل پر ناشتے کے برتن پڑے ہوتے، صوفوں پر بچوں کے کپڑے بکھرے پڑے ہیں اور وہ خود سر جھاڑ منہ پھاڑ کبھی ایک طرف جاتی کبھی دوسری طرف۔ سارہ اکثر اس کا ہاتھ بٹا دیا کرتی تھی۔

”تو ماسی کیوں نہیں رکھ لیتی؟“ سارہ نے اس کی حالت دیکھ کر کہا۔

”ماسی تو میں رکھ لوں مگر آج کل کسی پر اعتبار نہیں اور پھر یہاں اتنی دور ماسی کہاں سے آئے؟ یہاں تو کسی گھر میں ماسی آتے جاتے دیکھی ہی نہیں کہ بندہ اس سے بات کرے بس پار گزارا چل رہا ہے۔ اب سچ پوچھو تو میرا دل ہی نہیں کرتا کچھ کرنے کو۔“

”کیوں جی عشق ہو گیا ہے کیا؟“ سارہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”نہیں سارہ ہم سے کون کرے گا عشق.....“ اس کے لہجے سے اداسی صاف جھلک رہی تھی۔

”کیا بات ہے بتاؤ مجھے؟“ سارہ نے تکلفی

سے پوچھا۔ ”تمہیں کتنا ٹائم ہو گیا ہے ایک ساتھ مگر تم مجھ سے اپنے دل کی باتیں شیئر نہیں کرتیں۔ تم نے آج تک مجھے غیر ہی سمجھا نا؟“ سارہ نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

”میں جارہی ہوں پھر کبھی نہیں آؤں گی۔“ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہیں سارہ پلیز ایسا مت کہو مت جاؤ۔“

سارہ مجھے روکتے ہوئے بولی۔ ”ایک تم ہی تو ہوجسے میں اپنا سمجھتی ہوں تم بھی نہیں آؤ گی تو میں تو بالکل اکیلی ہو جاؤں گی۔“ اُس نے باقاعدہ روتے ہوئے کہا۔ اسے روتا دیکھ کر سارہ پریشان ہو گئی۔ اس کا جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا وہ تو اسے ڈرار ہی تھی۔ اس کے رونے سے ظاہر تھا کہ کوئی تو بات ہے جو اسے اندر ہی اندر کھار رہی ہے۔

”اوکے ڈیز نہیں جاتی میں بس تم رومت اور مجھے سب بتاؤ۔“ سارہ نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”سارہ! کی بار سوچا کہ تمہیں بتاؤں مگر پھر یہ سوچتی کہ اس میں اپنی ہی بند مانی ہوگی تو چپ ہو جاتی۔“

”وہ کچھ پتا نہ دکھانے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔“

”سارہ! دراصل سعد کی لڑکی میں انٹرنلڈ ہیں اور یہ سب کافی ٹائم سے چل رہا ہے۔“ اُس نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

”کیا..... کیا! کیا کہہ رہی ہو یار؟ سعد بھائی؟ نہیں مجھے یقین نہیں آ رہا۔“ سارہ نے حیرت سے کہا۔ ناجیہ کے شوہر سعد بہت ڈینٹ اور باوقار تھے اُن کی شخصیت واقعی ایسی تھی کہ صرف مخالف کو اپنی جانب متوجہ کر سکے۔ ”مجھے ایسے لگتے تو نہیں۔“ سارہ نے بے یقینی سے کہا۔

”وہ ایسے نہ تھے مگر اب ایسے ہو گئے ہیں۔ پتا نہیں اُس نے کیا جادو کر دیا ہے وہ ان کے اُس

میں ہوتی ہے۔ پہلے تو مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اب تو میری طرف دیکھتے بھی نہیں۔ شروع میں تو مجھے شک تھا پھر میں نے نوٹ کرنا شروع کیا، میرا شک یقین میں بدل گیا، بس تب سے ہی میرا دل ہر چیز سے اجاٹ ہو گیا ہے، پہلے میں ایسی نہ تھی۔“ وہ خیالوں میں گم ہو گئی

”ہم دونوں کی زندگی بہت پرسکون اور خوشگوار تھی۔ سعد بہت محبت کرتے تھے مجھ سے۔ میں بھی اُن پر جان چھڑکتی تھی اور اُن کی خواہش کے مطابق بنی سنوری رہتی تھی۔ ہم روز گھومنے جاتے اور باہر ڈنر کرتے تھے مگر پھر پتا نہیں کب اور کیسے ندا اُن کی زندگی میں آئی اور آتی ہی چلی گئی۔ میرا بیار میری چاہت سب کچھ ان کی نظروں سے اوجھل ہونے لگا، اُن میں واضح تبدیلی آ رہی تھی وہ مجھ سے اور بچوں سے دور ہوتے جارہے تھے۔ گھر سے جانے میں بہت جلدی کرتے اور اوبسی پراکٹریٹ ہو جاتے۔ پوچھنے پر کام کی زیادتی کا بہانہ بناتے۔ میں بھی کب تک چپ رہتی آخر ایک دن بول پڑی۔“

”سعد! آپ اتالیٹ کیوں آنے لگے ہیں؟“

”اُس کا کام ہوتا ہے۔“ انہوں نے بے پروائی سے کہا۔

”کام کی زیادتی ہے یا پھر کوئی اور وجہ ہے؟“ مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میری زبان سے نکل ہی گیا۔

”دیکھو ناجیہ میں اس طرح کی باتوں کا عادی نہیں بن لیا؟ اپنے کام سے کام رکھو تم۔“ انہوں نے غصے سے کہا اور چلے گئے۔

”میں تو سعد کا رپوٹ دیکھتی کی دیکھتی ہی رہ گئی ان کا ایسا روکھا اور سرد انداز تو میں نے پہلے ہی نہ دیکھا تھا۔ مجھے رونا آ گیا۔ اُس وقت مجھے اپنی بے عزتی اور بے وقفی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ بات کانٹے کی طرح میرے دل میں کھب کر رہ گئی اور پھر بہت

سی تلخیاں ہمارے درمیان آتی گئیں پھر وہ دن بھی آ گیا جب میرے شک کے تابوت میں یقین کی آخری کیل بھی لگ گئی۔

اُس روز حالات بہت خراب تھے شہر میں مار دھاڑا اور ہنگامے ہو رہے تھے۔ میں نے سعد کے آفس فون کر کے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ آفس میں ہی بند ہوں حالات ٹھیک ہوں گے تو آ جاؤں گا۔ اگر زیادہ حالات خراب ہوئے تو آفس میں سو جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ مجھے کچھ کلسی ہوئی۔ بچوں کو سلا کر میں ٹی وی کھول کر بیٹھ گئی پھر بار بار انہیں فون کرنے لگی تو وہ ریسیو نہیں کر رہے تھے۔ مجھے لگا، آفس میں ہی سو گئے ہوں گے سو میں نے دل میں اُن کی خیریت کی دُعا میں مانگیں اور پھر سو گئی۔ میرے دل میں اُس وقت شک کا کوئی شائبہ تک نہ تھا پھر صبح ہوتے ہی میں نے فون کیا تو کسی لڑکی نے فون اٹھایا۔

وہ غمناک لہجے میں بولی۔ ”کون؟“

”سعد کہاں ہیں؟ اور آپ کون؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں ندا ہوں اُن کی آفس کو لیک اور سعد میرے گھر پہ سو رہے ہیں۔ آپ کون؟“

”کیا.....!“ میں غصے سے کانپ رہی تھی۔

”میں واقف ہوں اس کی سعد کو فون دو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا گرا اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا کہ سعد سو رہے ہیں۔ میرا تو برا حال تھا میں اس آدمی کے لیے تمام رات پریشان رہی اور وہ مجھ سے جھوٹ بول کر وہاں عیاشیاں کر رہا تھا۔ اب مجھے اس سے سخت نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ سعد نے آج یہ کام بھی کر دکھایا؟ آخر مجھ میں کیا کمی تھی جو اسے باہر منہ مارنے کی ضرورت پڑی؟

دوپہر میں جب وہ آیا تو مجھ سے نظریں چرا رہا تھا۔ ظاہر ہے اسے سب پتا چل گیا ہوگا۔ جب میں

چپ رہی تو وہ خود ہی بولا۔ ”دیکھو نا جیہ.....! میں گھما پھرا کر بات کرنے کا عادی نہیں، ندا مجھے پسند ہے۔ میں تمہیں صاف صاف بتا رہا ہوں میں نا اُسے چھوڑوں گا نہ تمہیں۔“ وہ بہت سکون سے یہ سب کہہ رہا تھا۔ وہ کہتا گیا میں سنتی گئی۔ جیسے جیسے وہ بولتا گیا میرے اندر اس کے لیے موجود پیار، محبت، احساسات، جذبات سب ختم ہوتے چلے گئے۔ جب اُس نے فیصلہ کر ہی لیا تھا تو میں کیا کہتی؟

”تم بھی اپنی مرضی کی مالک ہو، تم کو یہاں رہنا ہے تو رہو جانا ہے تو جاؤ تم میں کون نہیں روکو گا۔“ اس نے یہ کہہ کر گویا مجھ پر احسان کیا تھا اور چلا گیا اور میں اسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ کہاں جانی میں؟ میری خاموشی سے سعد کو کھلی چھوٹ مل گئی اب ہم ایک ہی چھت تلے دو اجنبیوں کی طرح رہ رہے ہیں.....

”ہوں..... تو یہ بات ہے۔ اچھا اب تو دیکھنا میں کیا کرتی ہوں۔“ سارہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”کیا کرو گی تم؟ چھوڑ دو اُسے وہ نہیں سمجھے گا۔“

ناجیہ نے کہا۔ ”ندا اس کے سر پر سوار ہے۔“

”تم مجھے چھوڑ دو۔“ سارہ نے کہا۔ ”اگر عورت مرد کے پیچھے پیچھے بھاگتی ہے تو مرد دھمکتا ہے کہ وہ کوئی تیس مارخان ہے اور اگر عورت اسے انکور کرنا شروع کر دے تو وہ ذمہ لانا اس کے پیچھے آتا ہے۔“

”کیا مطلب میں سمجھی نہیں؟“ ناجیہ نے اسے الجھن آئیہ نظروں سے دیکھا۔

”تم تو بدحوہ ہو اور ہمیشہ رہنا میری بے وقوف دوست اس نے اپنا ہر جانی پن دکھایا تو تم بھی جب کر کے بیٹھ گئیں۔ تم ڈٹ جائیں مرنی یا مرنے کی خیر چھوڑ ڈاب ہم دوسری چال چلتے ہیں۔“ سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیا کرو گی تم؟ کیسی چال؟“ ناجیہ نے گہمرا تے ہوئے کہا۔

”تمہارا چکر چلاؤں گی، مطلب افیر.....“

”کیا.....! پاگل تو نہیں ہو گئی تم؟“ ناجیہ نے چلاتے ہوئے کہا۔

”ارے گھوٹو سنو، تم سعد پر ایسا ظاہر کرنا کہ کوئی ہے جو تمہیں چاہتا ہے تمہاری زندگی میں کوئی داخل ہو گیا ہے اور تم اس کے ساتھ بہت خوش ہو اور اسے ایسے اشارے دینا کہ وہ یہ سب سچ ماننے لگے۔ جب اسے یہ پتا چلے گا تو پھر تمنا شد دیکھنا کیونکہ وہ کچھ بھی کرنے تم کچھ نہیں کہتی تو وہ آزاد ہے اس نے تمہیں نظر انداز کرنا شروع کر دیا ہے۔ اب تمہاری پارٹی ہے انکور کرنے کی تم اسے عمل طور پر انکور کرو پھر دیکھو۔“

”مگر میں کس سے افیر چلاؤں؟“ ناجیہ نے بے چارگی سے پوچھا تب سارہ نے اسے تمام منصوبہ سمجھایا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلنے چلی گئی۔

اُس دن سعد گھر آیا تو گھر کی حالت ہی بدلی ہوئی تھی ہر چیز اپنی جگہ پر تھی بچے بھی معمول سے ہٹ کر خاموش تھے اور سب سے زیادہ جھنکا اسے

ناجیہ کو دیکھ کر لگا، وہ بہت مختلف لگ رہی تھی۔ آج اس نے بہت پیارا سوٹ پہنا ہوا تھا اور ہلکا میک اپ کیا ہوا تھا۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

”آج آپ جلدی آ گئے؟“ ناجیہ نے پوچھا تو وہ چونک پڑا۔

”ہاں..... ہاں..... وہ..... آج کام اتنا نہ تھا۔“ وہ نظریں چراتا کمرے میں چلا گیا۔ ناجیہ نے اس کا چونکنا دیکھ لیا تھا اور وہ مسکرا کر رہ گئی۔

پھر ناجیہ نے اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ سعد کے سامنے فون پر کسی سے بات کرنے کی ایکٹنگ کرتی، وہ اگر اس کی طرف دیکھتا تو چونک کر کہتی۔ ”میں پھر بعد میں بات کروں گی۔“ یہ کہہ کر فون بند کر دیتی۔

گھر کے کام کاج کے دوران مسکراتے رہنا، گلگانا اور خود بھی ہر وقت بنی سنوری رہنا۔ سعد یہ سب دیکھ رہا تھا، اس کے دل میں شک پیدا ہونا فطری تھا کہ کچھ تو گڑبڑ ہے۔

ایک روز سعد گھر آیا تو ناجیہ گھر پر موجود نہ تھی۔ وہ سخت تشویش میں تھا کہ وہ کہاں گئی ہوگی اور وہ بھی مجھے بتائے بغیر؟ لاکھ اختلاف ہی مگر وہ اسے ہر جگہ بتا کر جاتی تھی اور وہ منع بھی نہیں کرتا تھا مگر آج کیا ہو گیا؟ ایسی بھی کیا پریشانی ہے؟ وہ ان ہی سوچوں میں کم بچوں کے کمرے میں گیا۔

”بیٹا! اما کما کچھ بتا کر گئی ہیں کہ کہاں جا رہی ہیں؟“

”نہیں پاپا.....! بس کوئی فون آیا تھا تو ماما تیار ہو کر چلی گئیں۔ کہہ رہی تھیں جلدی آ جاؤں گی۔“

حزہ نے لا پرواہی سے جواب دیا اور اپنا ہوم ورک کرنے میں مصروف ہو گیا۔

سعد کا دماغ پک رہا تھا یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ وہ یہ سوچتا ہوا بچے کی طرف آ رہا تھا کہ نا جیہ گھر میں داخل ہوئی تھی، آج وہ بہت حسین لگ رہی تھی اور کافی خوش نظر آ رہی تھی، سعد پر نظر پڑے ہی وہ ٹھنک گئی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

”کہاں گئی تھیں تم اتنا تیار ہو کر؟“ سعد نے غصے سے اس کے سراپے پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”اپنی دوست سے ملنے گئی تھی۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

”یہ کون سی دوست ہے یا کون سا دوست ہے جس سے تم اتنی رات میں ملنے گئی تھیں؟“ سعد کے لہجے میں شک ہی شک تھا۔

’جو تم سمجھ لو اور پلیز سعد میں بہت تھک گئی ہوں مجھے سونے دو، نیند آرہی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور سعد بیچ و تاب کھاتا رہ گیا۔

ناجیہ سیدھی اپنے بیڈ پر جا کر لیٹ گئی اور سو پنے لگی۔

سعد احمد میں بھی اسی طرح پریشان ہوتی تھی مگر تمہیں کہاں پروا تھی کیونکہ تم مرد ہو تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ آج ہمیں فکر ہو رہی ہے کہ میں کہاں جا رہی ہوں کس سے مل رہی ہوں؟ کیوں؟ جب میں تم سے سوال کرتی تھی تب تو تم مجھے دیکھتے بھی نہیں تھے پھر آج کیوں مجھ سے سوال کیے؟ تمہاری پریشانی تمہارا شک یہ سب مجھے مضبوط بنا رہا ہے میں اپنا آپ منوا کر رہوں گی سعد احمد میں اپنا گھر برباد نہیں ہونے دوں گی..... کبھی نہیں۔

دوسری طرف سعد بھی کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ ناچہ سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کہاں سے بات شروع کرے کیونکہ چوراس کے دل میں بھی تھا۔ کہیں ناچہ کسی اور میں تو..... نہیں رہیں ہو سکتا۔ وہ بے چینی سے اٹھ بیٹھا۔ اگلی صبح ناچہ نے سارہ کو فون پر تمام حالات سے آگاہ کیا۔

”ہا ہا ہا..... دیکھا میری جان میں نہ کہتی تھی مرد خود جتنا بھی اڈھرا اڈھرا منہ مارے مگر یہ بھی برداشت نہیں کرتا کہ اس کی بیوی کا کسی سے فیئر ہو، بس تم دیکھو اب آگے کیا ہوتا ہے؟“ سارہ نے کہا۔

اڈھر سعد کی بے چینی میں ہرگز رتے دن کے ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے اس کا کام بھی متاثر ہو رہا تھا اور اس کی مجبوری بڑھ رہی تھی۔ وہ اس کی پریشانی نوٹ کر رہی تھی۔

”کیا بات ہے سعد آج کل بہت پریشان پریشان سے لگ رہے ہو؟“ ایک دن ندانے پوچھ ہی لیا۔

”کچھ نہیں، بس ذرا کام کی پریشانی ہے۔“ سعد نے ٹالنے والے انداز میں کہا کیونکہ سچ بتانے میں اپنی ہی بے عزتی تھی۔

”چلو آج لہجہ باہر کرتے ہیں۔ میرا بھی دل نہیں ہے کام کرنے کو تھکاؤ ہو رہی ہے وہاں سے گھر

چلے جائیں گے۔“ ندانے ایک ادا سے کہا۔

”نہیں آج نہیں پھر کبھی۔“ وہ کہہ کر اٹھا اور باہر نکل گیا۔ ندانے اسے دیکھتی رہ گئی۔

”کچھ تو ہے ورنہ تم اس طرح مجھے کبھی انکار نہیں کرتے۔“ ندانے سوچتے ہوئے خود سے کہا۔

”پاپا.....! ہمیں نہیں گھمانے لے جائیں ہم کتنے دنوں سے باہر نہیں گئے۔“ دونوں بچے باہر جانے کی ضد کرنے لگے۔

”او کے بیٹا آپ تیار ہو جاؤ، ڈنر بھی باہر ہی کریں گے۔“

”ہرے.....!“ دونوں بچوں نے خوشی سے نعرہ لگایا اور تیار ہونے چلے گئے۔ سعد کا موڈ نہیں تھا مگر وہ بچوں کی وجہ سے راضی ہو گیا۔ سی ویو پر بچوں نے خوب موم مستی کی، گھر سواری، اوٹ کی سواری اور پانی میں نہانا۔ بچے بہت خوش تھے سعد بھی بچوں کو خوش دیکھ کر خوش تھا، ناچہ بھی ساتھ تھی مگر اس کا دھیان میٹیر پر زیادہ تھا۔ اس کی یہ حرکت سعد کی نظروں سے اوجھل نہ تھی۔ وہ جہز ہو رہا تھا مگر پبلک پلیس پر متاثر بنانا نہیں چاہتا تھا اس لیے خاموش رہا۔

میٹج پڑھتے ہوئے ناچہ کے چہرے پر آنے والی رونق کو دیکھ کر اس کا شک یقین میں بدل گیا کہ کوئی تو ہے۔ خیر، جیسے تیسے ڈنر کیا اور گھر واپس آئے۔ اس رات بھی طرح طرح کی سوچوں نے سعد کو سونے نہیں دیا، اس نے ناچہ کے چہرے پر نظر ڈالی تو اس کے چہرے کا سکون اس کی نیند اڑا رہا تھا۔ وہ سوچتا گیا۔ اس لمحے اسے اندر سے آواز آنے لگی جو شاید اس کے ضمیر کی آواز تھی۔

”سعد احمد.....! قدرت تمہیں آئینہ دکھا رہی ہے۔ تمہاری بیوی نے کب تم سے بے وفائی کی تھی کب تمہاری کسی بات سے پیچھے ہٹی؟ مگر تم نے اس کی قدر نہ کی اس کی چاہت محبت کو ٹھکرا دیا یہاں

تک کہ تم نے تو اس سے بات تک کرنا بھی چھوڑ دی اور اب اگر وہ کسی بھی وجہ سے خوش ہے تو تمہیں کیوں پریشانی ہے؟ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ جان چھوٹی کیونکہ تم تو اب ندانے سے شادی کرنے والے ہو۔“ ضمیر نے اسے جھنجھوڑا تو وہ مزید بے چین ہو گیا اور ان ہی سوچوں میں گم جانے لگا۔

”کیوں نہیں آؤں گی تم بلاؤ اور میں نہ آؤں۔“ ناچہ نے مسکراتے ہوئے فون پر کہا۔ یہ آواز سعد نے سن لی۔ وہ اس کے پاس ہی آ رہا تھا۔ وہ فوراً دروازے کی اوٹ میں ہو گیا اور ناچہ کی باتیں سننے لگا۔

”یار کیا کروں میں بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی نہ جانے کیا جاؤ کر دیا ہے تم نے مجھ پر کہ کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔“ ناچہ کے لہجے میں پیار ہی پیار تھا پھر دوسری طرف سے ملنے کا وقت اور جگہ کا تعین کیا گیا۔

”او کے اسی جگہ نا جہاں ہم پہلے ملے تھے؟“ ناچہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں آ جاؤں گی۔ اچھا“

عطا حافظ! ناچہ نے مسکراتے ہوئے فون بند کر دیا۔ یہ سب سن کر سعد کا خون کھول رہا تھا اس کا بس دماغ چل رہا تھا کہ وہ ناچہ کا گلہ یادے مگر ابھی وہ ایسا نہیں سمجھتا تھا وہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا اس لیے وہ مضطرب رہا اور اس کے لیے نکل پڑا۔

دست بھر وہ سوچتا آیا کہ آج یہ قصہ ختم کر دوں یا یا یا ایک فیصلہ کرنا ہو گا ناچہ کو نہیں مزید اس سے مل سکتا۔ وہ آفس میں بھی سارا وقت گزار دیتا تھا۔ اس کی بے چینی کو سب نوٹ کر رہے تھے۔

”کیا بات ہے ڈیر! تم بتاتے کیوں نہیں کیا“

”سعد احمد.....! قدرت تمہیں آئینہ دکھا رہی ہے۔ تمہاری بیوی نے کب تم سے بے وفائی کی تھی کب تمہاری کسی بات سے پیچھے ہٹی؟ مگر تم نے اس کی قدر نہ کی اس کی چاہت محبت کو ٹھکرا دیا یہاں

”ہاں..... اور کان کھول کر سن لو کہ وہ دفع ہو جاؤ یہاں سے..... گیٹ آؤٹ.....“ وہ غصے سے بولا۔

”واہ.....؟ تم نے مجھے گیٹ آؤٹ کہا؟“

نداعصہ سے کانپ رہی تھی۔

”ہاں تمہیں ہی کہنا ہے اب شکل گم کرو.....“ وہ دھڑام سے دروازہ بند کر کے باہر چلی گئی۔

سعد کرسی پر گر سا گیا اس کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا اس نے گھڑی میں وقت دیکھا، اس وقت تین بجے تھے۔ وہ فوراً آفس سے باہر آیا، گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ بہت رف ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ کئی بار اس کا ایکسڈنٹ ہوتے ہوتے بچا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی جہاں کسی کی اس پر نظر نہ پڑ سکے۔ وہ ناچہ کا پیچھا کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ جانی کہاں ہے؟ اور کس سے ملتی ہے؟ آج وہ سب جاننا چاہتا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھا اس کے گھر سے نکلنے کا انتظار کرنے لگا مگر نام تھا کہ گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ خاصے انتظار کے بعد اسے ناچہ کا چہرہ نظر آ گیا۔ وہ تیار ہو کر پیشہ گیا۔ ناچہ آج بہت اہتمام سے تیار ہوئی تھی لائٹ پینک ساڑھی میں وہ بہت فریش لگ رہی تھی اور اس کا چہرہ بھی گلابی ہو رہا تھا۔ وہ سب رفتاری سے چلتی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تو سعد نے بھی انکیشن میں چابی گھمائی اور خاص فاصلے پر گاڑی رکھ کر اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ آخر چندر منٹ کی ڈرائیونگی کے بعد گاڑی سی ویو کے قریب ایک ریسٹورنٹ کے باہر رک گئی۔ سعد نے بھی ایک طرف کر کے گاڑی پارک کی اور دونوں ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلے پر اندر داخل ہو گئے۔ ناچہ ایک ٹیبل کی طرف بیٹھی۔ سعد بھی ایک ایسی ٹیبل پر بیٹھ گیا جہاں سے وہ ناچہ کی ٹیبل پر نظر رکھ سکے اور ان کی گفتگو سن سکے۔ اس نے

حیاتی جاگتی تحریریں ☆ زندگی کی ہفت رنگ تصویریں

بابر نایاب

احساس نہیں مرتا

شفیق احمد ندیم کا خیال
علم کو تھام کے جو جو جستجو ہوگا
وہی تو ہوگا، جو ہر بار سُرخ رو ہوگا

داد اور پوتے کی علم اور محبت سے مربوط ایک حیاتی جاگتی کہانی



”سعد! میں نے یہ سب اپنا گھر بچانے کے لیے کیا؟“ ناچیہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔
”سعد بھائی!.....“ سارہ نے ناچیہ کو اشارے سے چپ رہنے کو کہا۔ ”آپ کو ٹھیک راستے پر لانے کے لیے یہ میرا آئیڈیا تھا کیونکہ آپ کی بے وفائی کی وجہ سے ناچیہ نے خود کو بالکل فراموش کر دیا تھا۔ اگر میں یہ سب نہ کرتی تو ایک دن آپ کا گھر تباہ ہو جاتا۔ سعد بھائی!.....! عورت اپنے گھر اور سہاگ کی سلامتی کے لیے سب کچھ کر سکتی ہے جیسا کہ ناچیہ نے کیا۔ اس نے اپنی سچرے سے ہٹ کر ایک ڈرامہ کیا صرف اور صرف آپ کے لیے آپ کا پیار پانے کے لیے تو اس میں کیا غلط ہے؟ عورت سب برداشت کر سکتی ہے مگر اپنے شوہر کے ساتھ کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتی بس سعد بھائی!..... مجھے اور کچھ نہیں کہنا میں جا رہی ہوں ناچیہ!..... اللہ تمہارا سہاگ سلامت رکھے۔“ وہ یہ کہتے ہوئے چلی گئی۔
”رکو سارہ!.....!“ سعد نے اُسے آواز دی۔
سارہ رک گئی۔
”تھینک یو.....! تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں اپنی جنت کو باہر تلاش کرنے نکلا تھا مگر وہ تو میرے گھر میں ہی تھی۔ تھینک یو ویری مچ۔“ سعد نے تشکر بھری نظروں سے سارہ کو دیکھا۔ وہ مسکرائی ہوئی چلی گئی۔

”سورہ ناچیہ میں جھٹک گیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔“ سعد نے ناچیہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ناچیہ کے لیے یہی بہت تھا کہ اس کے شوہر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ سعد کا ہاتھ تھام کر مسکرائی گئی اور پھر دونوں ایک ساتھ باہر نکل پڑے ایک نئی زندگی کی شروعات کے لیے جہاں صرف خوشیاں ہی خوشیاں اُن کی منتظر تھیں۔

☆☆☆

اپنے لیے جانے کا آرڈر دیا، گو اس کا کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا مگر وہ ایسے تو بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ ایک ایک پل اس پر بھاری گزر رہا تھا اس کی نظریں جیسے ناچیہ پر چپک ہی گئی تھیں، وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔

”اب آ بھی جاؤ میں کب تک ویٹ کروں؟“ اس کے لہجے میں مصنوعی ناراضگی تھی۔ ”اوکے.....“ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور گیٹ کی طرف دیکھنے لگی۔ سعد کی نظریں بھی گیٹ پر جا رہیں، اس کا غصہ عروج پر تھا، وہ بہت ضبط کیے بیٹھا تھا کہ اچانک گیٹ پر سارہ نمودار ہوئی۔ وہ اندر آ کر پہلے ارد گرد کا جائزہ لینے لگی اور پھر ناچیہ کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھی۔ وہ دونوں بہت گرم جوش سے ملے۔

”یار! تو بھی نا، اب بس کر۔“ ناچیہ نے سارہ سے کہا۔
”کیا بس کروں؟“ سارہ بولی۔

”یار! سعد بہت پریشان رہنے لگا ہے، کہیں کچھ ایسا ویسا نہ کر بیٹھے.....“
”بس یہی خرابی ہے تیرے اندر دل بڑا نازک ہے تیرا۔“ سارہ مصنوعی خشکی سے بولی۔
”ہاں یار کیونکہ میں واقعی اس سے محبت کرتی ہوں میں نے بھی دیکھا ہے کہ وہ میری وجہ سے میرے لیے بہت پریشان ہے بس میں اسے مزید پریشان نہیں کر سکتی۔“ ناچیہ بولی۔

سعد یہ سب سن رہا تھا اور اندر ہی اندر شرمندہ ہو رہا تھا۔ وہ اٹھا اور ان کی ٹیبل کی طرف بڑھا۔ سعد کو دیکھتے ہی دونوں کھڑی ہو گئیں۔

”آپ یہاں؟“ ناچیہ کے منہ سے نکلا۔
”تو یہ ہے تمہارا نیا دوست؟“ سعد نے سارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”دادا ابو! آج میں بھی آپ کے ساتھ زمینوں پر جاؤں گا۔“ ننھے سلطان نے اپنے دادا نواز حسین سے ضد کرنے والے انداز میں کہا تھا۔

”پتر! تو ابھی بہت چھوٹا ہے اور ہماری زمینیں بہت دور ہیں تو تھک جائے گا۔“

”ہنہیں! میں نہیں تھکوں گا، میں لازمی جاؤں گا۔ وہ شرفورز اپنے ابا کے ساتھ زمینوں پر جاتا ہے اور میرے ابا ہوتے تو وہ بھی مجھے لے جاتے۔“

سلطان کی اس بات نے نواز حسین کے دل پر جیسے چھریاں چلا دی تھیں۔ ”نہ پتر! آئندہ کبھی ایسا مت کہنا! تیرا دادا تجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ شرفو تو (لٹ) آوارہ ہے پرتو بڑا اچھا بچہ ہے نا! چل! آجا تو بھی میرے ساتھ چل۔“

گاؤں کی چچی گلیوں میں سے ہوتے ہوئے نواز حسین اپنے پوتے کے ساتھ اپنی آبائی زمینوں کی طرف جا رہا تھا۔ گلیوں میں ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ سلطان کا بڑا دل چاہتا تھا وہ بھی ان بچوں کے ساتھ کھیلے مگر اُس کا دادا اُسے کھیلنے نہیں دیتا تھا۔ اُس کے دادا نے اُسے کھیلنے کے لیے شہر سے بڑے اچھے اچھے کھلونے لاکر دیے تھے جو گاؤں کے کسی بچے کے پاس بھی نہیں تھے۔ اب گلیاں ختم ہو گئی تھیں اور چچی سڑک شروع ہو گئی تھی اور اس چچی سڑک کے آس پاس ہرے بھرے لہلہاتے کھیت نظر آ رہے تھے۔ سلطان بڑی محویت کے ساتھ ان کھیتوں اور کھیتوں میں کام کرتے کسانوں کو دیکھ رہا تھا۔

کسان اس دھرتی کا سینہ چیر کھل اُگاتا ہے اور اس فصل کے لیے اُسے بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔ اتنا ج کے ہر دانے میں کسان کا صرف پسینہ ہی شامل نہیں ہوتا بلکہ اُس کا خون شامل ہوتا ہے یہ نوالہ کھانے والا نہیں جانتا۔ سلطان کے دادا کے ایک ہاتھ میں مکئی کی روٹی

تھی اور دوسرے ہاتھ میں اپنے پوتے کا ہاتھ تھا ماہوا تھا۔ راستے میں چودھری فلک شیر کے کھیت تھے جہاں وہ اپنے ننھی نشی شیر کے ساتھ اکڑ کر کھڑا ہوا تھا۔

”سلام چودھری صاحب!“ نواز حسین نے سر پر ہاتھ رکھ کر بڑے ادب سے چودھری کو سلام کیا۔ ”وعلیکم السلام ابا! مجھے نواز حسین، کیا حال ہے اور کیا سوچا ہے تو نے اپنی زمینوں کا؟“ چودھری نے نواز حسین سے پوچھا۔

”چودھری صاحب! یہ زمینیں ہماری زندگی کی کل جمع پونجی ہیں، ہم انہیں نہیں بیچ سکتے، بس اللہ خیر سکھ رکھے یہ زمین ایسے ہی اچھی فصل دیتی رہے اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔“ نواز حسین نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے جو تیری مرضی ورنہ جتنی قیمت میں نے تیری زمین کی لگائی ہے اتنی کوئی اور نہیں لگا سکتا۔“

نواز حسین سنی اُن کی کر کے چپ چاپ اپنے پوتے کے ساتھ آگے کی طرف بڑھ گیا تھا تو چودھری نے اپنی گھنی مونچھوں کو مروڑ کر بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا۔ ”جب میرا داؤ لگ گیا تو تجھ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

”دادا ابو! آپ نے یہ چودھری کو جھک کر سلام کیوں کیا؟“ سلطان نے بڑی معصومیت کے ساتھ اپنے دادا سے پوچھا تو نواز حسین اپنے پوتے کے سوال کو سن کر دنگ رہ گیا۔

”پتر! اس لیے اُسے جھک کر سلام کیا۔“ نواز حسین نے جواب دیا۔ ”پر دادا ابو! تو آپ سے عمر میں بہت چھوٹا تھا اُس کا کوئی بھی بال سفید نہیں اور آپ کے سارے بال سفید ہیں۔“ ننھے سلطان کا یہ سوال سن کر نواز حسین لا جواب ہو گیا اُس کا کوئی بھی جواب نواز حسین کے پاس نہیں تھا۔ ”بس! بس! زیادہ باتیں نہ کرو دیکھو ہمارے کھیت گئے۔“ اُس نے اپنے پوتے کی توجہ کھیتوں کی طرف

مزدول کر دائی..... ابھی نواز حسین کی فصل پک رہی تھی۔ سلطان بھاگتا ہوا کھیتوں میں گھس گیا۔

نواز حسین کا یہ ایک ہی پوتا تھا اور اُس کی جان اپنے پوتے میں پوشیدہ تھی۔ نواز حسین کے دو بیٹے تھے ایک بیٹا بہرام جو سلطان کا ابا تھا، وہ ایک سیڈنٹ میں جاں بحق ہو گیا تھا اور دوسرا بیٹا اکرم جو شہر میں سرکاری ملازم تھا۔ جوان بیٹے کی موت نے نواز حسین کو بہت دلیراشتہ کر دیا تھا اور اگر جیسے کی اُننگ پیدا ہو گئی تو اسی پوتے کی وجہ سے جبکہ سلطان کی ماں منع کی تو زندگی ہی اجڑ گئی مگر وقت بہت بڑے بڑے زخموں کو مندمل کر دیتا ہے، شمع کے بھی زخم مندمل ہو گئے تھے مگر سلطان کے ابا کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کو یاد کر کے وہ کبھی کبھی تنہائی میں روتی رہتی تھی۔

نواز حسین کی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری خواہش یہی تھی کہ سلطان پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے اسی وجہ سے وہ اپنے پوتے کو اچھا ماحول دینا چاہتا تھا۔ سلطان ابھی چھوٹا تھا مگر نواز حسین اُسے ایسی باتیں سمجھایا کرتا تھا جو کہ پوتے کے ننھے دماغ میں نہیں سمائی تھی مگر نواز حسین کو یقین تھا کہ ایک دن یہ سبھی باتیں سلطان اپنی زندگی میں عملی طور پر اپنائے گا۔

نواز حسین سلطان کو بتایا کرتا تھا کہ..... ”پتر! میں نے پاکستان بناتا ہوا اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، تیرے جیسے کئی ماؤں کے لال میں نے ہندوؤں اور مکھوں کے ہاتھوں کھتے ہوئے دیکھے ہیں، یہ پاکستان ایسے نہیں بن گیا اس کے لیے ہم نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔“ نواز حسین جب قائد اعظم کے بارے میں بات کرتا تو سلطان اپنے دادا کے کبھ میں ایک عجیب سی سرشاری محسوس کرتا عقیدت اور فرط جذبات سے سلطان کے دادا کی آنکھیں بھیگ جاتیں اور کہتا۔ ”پتر! وہ انسان نہیں فرشتہ تھا۔ اُس کا لباس تو فرنگیوں جیسا تھا، پر اس کا دل ہم مسلمانوں کے لیے دھڑکتا تھا۔“

میں با نچو بی جماعت میں تھا جب میں نے قائد اعظم کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اُس کے لہجے میں بلا کا اعتماد ہوتا تھا، وہ بات کرتا تو لگتا جیسے اُس کا لفظ لفظ سچائی سے بھر پور ہو، اُس نے پاکستان لڑے بھگڑے بغیر اپنے علم اور قانون کے ذریعے حاصل کیا تھا۔“

سلطان جو اپنے دادا کی باتیں بہت غور سے سنتا رہتا تھا، وہ چھوٹی سی عمر میں اپنی عمر سے بڑی باتیں کرنے لگا اور پھر ایک روز نواز حسین نے سلطان کو پڑھنے کے لیے اُس کے چاچا کے پاس شہر بھیج دیا اور جاتے ہوئے کہا..... ”پتر! جب واپس آنا تو کچھ بن کر آنا اور یاد رکھنا، منزل قریب ہو جائے تو میرے بلاوے پر بھی مت آنا، میں تجھے تیری منزل پر دیکھنا چاہتا ہوں اور یاد رکھنا، شہر کی رنگینیوں میں حکومت جانا، وہاں زندگی دوڑ رہی ہے، ہر کوئی بھاگ رہا ہے یہاں اپنے (پنڈ) گاؤں میں کوئی بیمار ہو جائے تو اسے پورا گاؤں پوچھنے والا ہوتا ہے، وہاں کسی کو اپنے ہمسایوں کا بھی نہیں پتا ہوتا۔ پتر! میں اپنے سوچنے رتب سے تیری کامیابی کے لیے دعا کرتا رہوں گا.....“ سلطان اپنے دل میں سوچتا کہ..... کون کہتا ہے میرا دادا اپنے دور کی پانچ جماعتیں پاس ہے!

وقت کبھی ٹھہرتا نہیں، سو اپنی رفتار سے تیز موجوں کی طرح بہتا گیا اور سلطان اپنی زندگی اور جوانی کی خواہشوں کو کتابوں میں گھول کر پڑھتا اور آگے بڑھتا گیا۔ نواز حسین اپنے پوتے کو خط لکھتا رہتا اور ہر خط میں اُسے پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بننے کی نصیحت کرتا رہتا..... اور پھر ایک دن ایسا آیا جب سلطان کو اُس کی منزل بالکل قریب نظر آ رہی تھی۔ اُس روز سلطان کا سی ایس ایس کا امتحان تھا اور وہ اس سلسلے میں گھر سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ..... اچانک اُس کا چاچا تیز بھاگتا ہوا آیا تھا، اُس کا سانس پھولا ہوا تھا اور بہت بدحواس نظر آ رہا تھا۔

”چاچا“ کیا ہوا، خیریت تو ہے نا؟“ سلطان نے اپنے چاچا سے پوچھا۔
 ”پتر“ ابھی ابھی فون پر تیری ماں نے بتایا ہے کہ تیرا دادا اس دنیا میں نہیں رہا۔“ یہ کہتے ہوئے سلطان کا چاچا سلطان کو گلے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ سلطان کو لگا جیسے اُس کی جان نکل گئی ہو، وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا، اُس کی دنیا اندھیر ہو گئی تھی، جس کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا، جس کی رہنمائی سلطان کو علم کی روشنی کی سمت لائی، اب وہ ہستی دنیا سے چلی گئی تھی۔

جانا تو سبھی کو ہے مگر سلطان تو اپنے دادا کو کچھ بن کر دکھانا چاہتا تھا مگر وہ اتنا بھی انتظار نہ کر سکا۔ سلطان اپنے دادا کا آخری دیدار کرنا چاہتا تھا مگر اُس روز سلطان کا وہ امتحان بھی تھا جس کے لیے وہ شب روز رخصت کرتا رہا تھا۔

چاچا اپنے ساتھ سلطان کو گاؤں لے جانے لگا مگر سلطان نے اپنے چاچا کو کہا..... ”چاچا تجھے اکیلا ہی گاؤں جانا پڑے گا مجھے دادا نے کہا تھا کہ جب منزل قریب ہو تو میرے بلاوے پر بھی مت آنا، بس تم میری طرف سے اُن کی پیشانی پر بوسہ دے دینا.....“ یہ کہہ کر وہ اپنے اندر جذبات کا سمندر چھپائے امتحان دینے چلا گیا تھا۔

☆.....☆

سلطان نے مقابلے کے امتحان میں امتیازی پوزیشن حاصل کی تھی اور پھر جلد ہی مختلف مراحل سے گزرتا وہ اعلیٰ پولیس آفیسر بھی بن گیا تھا..... اُسے اپنی منزل تو مل گئی تھی مگر منزل پر لے جانے والا بیچ راہ میں چھوڑ گیا تھا..... اور اب وہ ایک اعلیٰ پولیس آفیسر کے روپ میں اپنے گاؤں کو لوٹ رہا تھا۔ اُس کے دل و دماغ پر اپنے دادا کے ساتھ بتائے ہوئے لمحات کسی فلم کی صورت چل رہے تھے۔

جب سلطان کی جیب گاؤں میں داخل ہوئی تو وہاں کھلبلی مچ گئی، ہر کوئی سلطان کی طرف اشارہ کر کے کہ رہا تھا..... ”وہ دیکھو نواز حسین کا پوتا جا رہا ہے۔“ پورے گاؤں میں سلطان کی بے بے ہو گئی تھی، علاقے کا تھاندار نے گاؤں والے زمین کا خدا سمجھتے تھے وہ سلطان کے پیچھے باڈی گارڈ کی طرح چل رہا تھا..... جب سلطان اپنے گھر میں داخل ہونے لگا تو اُسے شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ کاش آج اُس کا دادا استقبال کرتا تو کیا بات ہوتی!..... ایک آہ سلطان کے سینے سے نکلی اور پھر جب گھر کے دروازے پر سلطان کی ماں نے اُسے اپنے سینے سے لگایا تو وہ اپنی ماں کا لمس محسوس کر کے دیوانہ وار روتے ہوئے بولا..... ”اماں! دادا کو تو نے روکا کیوں نہیں، کچھ دن کے لیے تو روک لیتی کہ وہ میری کامیابی دیکھ لیتا۔“

”پتر.....! صبر کر، تو نے اپنے دادا کی لا لائ رکھی“ آج تو اُن کے خوابوں کی تعبیر بن گیا ہے۔ اگر تو روئے گا تو اُن کی روح کو دکھ ہوگا۔“ سلطان نے بمشکل اپنے آنسوؤں کو ضبط کیا تھا۔

اُس روز دور دور سے رشتے دار اور برادری والے سلطان کے گھر آ رہے تھے کہ سلطان کے اتا بڑا افسر بن جانے کی خوشی جو تھی۔ علاقے کا ایم این اے اور چودھری فلک شیر بھی خود چل کر سلطان کے گھر مبارک باد دینے آئے تھے۔ ایم این اے سے جاتے ہوئے سلطان کو کہا تھا..... ”مجھے خدمت کا موقع ضرور دیتے گا۔“

”بس آپ مہربانی کر کے یہاں اسکول بنا دیں، یہ میری خدمت سے بڑھ کر گاؤں والوں کی خدمت ہوگی۔“ ایم این اے نے سلطان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور اسکول بنوائے گا۔ چودھری فلک شیر سلطان کو جھک کر سلام کرنے

ہوئے بولا تھا۔ ”پتر مبارک ہو آج تیرا دادا ہوتا تو کتنا خوش ہوتا.....“ سلطان کے ذہن میں فوراً ماضی کی وہ فلم چلنے لگی تھی جب سلطان کا دادا اس چودھری کو جھک کر سلام کرتا تھا، آج وہی چودھری، نواز حسین کے پوتے کو جھک کر سلام کر رہا تھا۔ قدرت اپنے مکافات عمل ضرور دکھاتی ہے مگر اُن کے لیے جو سمجھ رکھتے ہوں۔

سلطان نے چودھری کو کہا تھا۔ ”چاچا خدارا! مجھے جھک کر سلام مت کرو، میں آپ سے بہت چھوٹا ہوں اور میری تعلیم و تربیت اور میرا مذہب مجھے یہ نہیں سکھاتا کہ میرے بڑے میرے آگے جھکیں۔“ یہ بات سن کر چودھری کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات پھیل گئے تھے۔ واقعی تعلیم انسان کو نکھار دیتی ہے، سچ ہے جو چیز علم سے جیتی جا سکتی ہے وہ طاقت سے حاصل نہیں ہوتی۔

علم کتنا اچالا پھیلا دیتا ہے، یہ اُس روز سب گاؤں والوں کو پتا چل گیا تھا۔ گاؤں کا ہر باسی ہر مکین سلطان کے دادا کی تعریف کے ساتھ یہ کہہ رہا تھا کہ..... نواز حسین، ہم سب پر بازی لے گیا۔ ہم نے اپنے وارثوں کو زمینوں کے لیے لڑنا بجھڑنا سکھایا ہے مگر اُس نے علم سکھایا۔

سلطان ان سب لوگوں سے فارغ ہو کر اپنے دادا کی قبر پر گیا تھا۔ دادا کی قبر سے اگر تینوں کی بھینٹی بھینٹی سی خوشبو اٹھ رہی تھی..... سلطان نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تھے تو نا جانے کتنے آنسو اُس کی آنکھوں میں آگئے تھے اور شدت جذبات سے آواز بھر گئی تھی..... سلطان کو اپنے دادا کی پوز بھی سانس نہیں اپنے بالکل قریب محسوس ہونے لگی تھیں۔ اُسے ایسا لگا تھا کہ جیسے دادا ابونے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ہو کہ..... ”پتر.....! جسم ضرور دُفن ہوا جاتا ہے مگر محبت کا خوبصورت احساس کبھی دُفن نہیں ہوتا، احساس تو ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔“

☆.....☆

عزل

اگر کسی کو بشارتوں کی نہیں ضرورت گناہ کر کے ندامتوں کی نہیں ضرورت میرے حوالے سے جانتا ہے وہ سب حقائق اسی لیے تو وضاحتوں کی نہیں ضرورت جو سچ کے بدلے میں کھوپکا ہوتا مگر رشتے اسے کسی کی حقارتوں کی نہیں ضرورت ملی ہیں اینوں سے نفرتیں بے شمار مجھ کو کہ اب تو غیروں سے نفرتوں کی نہیں ضرورت میں دشمنی کا نہیں ہوں قائل اُسے پتا ہے عدو کو مجھ سے عداوتوں کی نہیں ضرورت احسان جتا کے جو کر دیا ہے مڑھاں تم نے مجھے تو ایسی محبتوں کی نہیں ضرورت میری غریبی ہے میرا سب سے بڑا محافظ تو راہزموں سے مزاحمتوں کی نہیں ضرورت لا تعلق سا ہو گیا ہے ندیم سب سے کہ جیسے اس کو مسرتوں کی نہیں ضرورت

شفیق احمد ندیم

رانا محمد شاہد

گناہ کا بوجھ

حامد علی سید کا خیال
یہی سچائی ہے اب زندگی میں
تماشا ہی تماشا رہ گیا ہے

دیوار اور بھائی کے رشتے کے درمیان سانس لیتی ایک عبرت انگیز کہانی



میں انہیں ہمیشہ بھابھی کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ ہمارے گھر کے قریب ہی رہتی تھیں اور مجھے چھوٹا بھائی سمجھتی تھیں۔ میں اُن کی ہر مالی ضرورت پوری کر دیتا تھا۔ بچوں کے تعلیمی اخراجات ہوں یا گھر کی ضرورت کی کوئی چیز سب میری ذمہ داری تھی۔ بھابھی کو بیوگی کی زندگی گزارتے ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ اُن کے تین بچے تھے۔ گزرتے وقت کے ساتھ میں نے محسوس کیا کہ بھابھی اکثر اداس و غمگین رہتی ہیں۔ میں نے بارہا اُن سے اس اداسی کی وجہ دریافت کرنا چاہی لیکن انہوں نے ہمیشہ ہنس کر ٹال دیا، تاہم مجھے اندازہ تھا کہ کوئی غم اندر ہی اندر انہیں کھائے جا رہا ہے اور پھر آخر ایک دن انہوں نے میرے بے حد اصرار پر وہ سب کچھ کہہ ڈالا جسے وہ ایک عرصے سے اپنے اندر چھپائے بیٹھی تھیں، شاید اس طرح انہوں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر ڈالا۔ انہوں نے اپنی زندگی کی کہانی کچھ اس طرح بیان کی تھی۔

”شہاب بہت اچھے شوہر تھے بہت زیادہ محبت کرنے والے اور میری ہر ضرورت کا خیال رکھنے والے۔ شمس میرا دیور تھا، بی اے کا طالب علم اور خور و نو جوان تھا۔ وہ مجھے بھابھی سے زیادہ اپنی بڑی بہنوں کی طرح سمجھتا تھا اور میں بھی اسے چھوٹے بھائی کا درجہ دیتی تھی چونکہ اُس کی کوئی بہن نہ تھی میری نندہ تھی اس لیے وہ ہر بات مجھ ہی سے شیئر کرتا تھا۔ وہ مجھ سے بے تحاشہ باتیں کرتا، یونیورسٹی کی باتیں سنانا اور اپنی اُس یونیورسٹی فیلو کے متعلق بتانا جسے وہ بہت چاہتا تھا۔ وہ اکثر کہتا: ”بھابھی.....! شمیمہ کے والدین سے بات کرنے کے لیے آپ کو بھیجوں گا۔“ تو میں دھیرے سے مسکراتی۔

میری اور شہاب کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے۔ ہمارے دو بچے تھے ایک بیٹا، ایک بیٹی۔ ہم اپنی زندگی میں بہت خوش تھے پھر وقت نے اپنا رنگ بدلا اور وہ کچھ ہو گیا جس کا کسی کو تصور بھی نہ تھا۔ میرے شوہر کا ایکسڈنٹ ہو گیا اور وہ اپنی زندگی بار گئے۔

ہمارے اور شہاب کے خاندان میں یہ روایت چلی آ رہی تھی کہ جب کسی عورت کا شوہر فوت ہو جائے اور اُس کا کوئی دیور کنوارا ہو تو پھر اُس سے اُس کا نکاح پڑھادیا جاتا تھا۔ شمس مجھے اپنی بڑی بہن کی طرح سمجھتا تھا پھر وہ یونیورسٹی کی ایک لڑکی سے محبت بھی کرتا تھا جس کا علم گھر میں صرف مجھے تھا کیونکہ وہ اپنی ہر بات مجھے ہی بتاتا تھا۔ میں جوان تھی اس لیے میرے ساس سسر نے شمس پر زور ڈالا کہ بیٹا.....! اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے کہ جیلہ سے تمہاری شادی کر دی جائے اور پھر ہمارے خاندان کی روایت بھی یہی ہے۔

”ساں جی! میں کیسے جیلہ بھابھی سے شادی کر سکتا ہوں۔ وہ جسے میں ہمیشہ اپنی بڑی بہن سمجھتا رہا، اُھ کیسے بیوی کے روپ میں قبول کر سکتا ہوں؟“ اُس نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا۔

میری عدت کے دن پورے ہو چکے تھے اور اب میرے ساس سسر کا اصرار بھی بڑھتا جا رہا تھا کہ وہ شمس پر زور دے رہے تھے کہ بیٹا! جیلہ سے شادی کر لو ورنہ ہمارے بیٹے کی عزت زمانے کی ٹھوکروں میں ہوگی۔ ایک دن اُس کے والد نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”بیٹا! ہم بھی چاہتے تھے کہ تمہاری شادی تمہاری مرضی سے ہو، شہنائیاں ہمیں تمہارے

ماتھے پہ بھی سہرا سجے لیکن حالات اب اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ جیلہ سے تمہارا نکاح کر دیا جائے۔“

”خدارا.....! مجھے اس امتحان میں مت ڈالیں۔“ شمس نے تقریباً رو ہانسی آواز میں کہا پھر جب اُسے یقین ہو گیا کہ اُس کی جان چھوٹنے والی نہیں تو ایک دن اُس نے کہہ دیا۔

”میں جیلہ بھائی اور اُن کے بچوں کی خاطر شادی نہیں کروں گا اور تمام عمر اُن کی کنالٹ کی ذمہ داری اٹھاؤں گا لیکن خدا کے لیے مجھے شادی کا مت کہیں۔“ یہ کہتے ہوئے شدت جذبات سے شمس کا چہرہ سرخ تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اُس کے جذبات و احساسات کی داد دی اور اُس کی اتنی بڑی قربانی پر میری آنکھیں بھگ گئیں۔ میرے ساس سر بہی کہہ رہے تھے کہ بیٹا! تو جیلہ سے شادی کر لے ورنہ لوگ طرح طرح کی باتیں بنائیں گے اور ہمارے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ والدین کے علاوہ جب اُس کے رشتے داروں نے بھی زور دیا تو وہ مجبور ہو گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ نکاح کیے بنا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ وہ نکاح کے لیے مان گیا مگر کوئی نہیں جانتا تھا کہ اُس نے کیا سوچ رکھا ہے پھر میرا شمس کے ساتھ نکاح ہو گیا۔

پہلی رات کو شمس نے مجھ سے کہا۔ ”گوکہ قانونی اور شرعی اعتبار سے آپ میری بیوی ہو لیکن آپ اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے آپ کو ہمیشہ اپنی بڑی بہن سمجھا ہے لہذا آپ کو بیوی کے روپ میں کیسے قبول کر سکتا ہوں؟ اس لیے آج سے ہم دنیا کے لیے تو میاں بیوی ہوں گے مگر غلطی میں ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا اور مجھے امید ہے آپ میرا

ساتھ دوگی۔“

”میں تمہارے جذبات کی قدر کرتی ہوں شمس، اس قربانی میں میں تمہارا پورا پورا ساتھ دوں گی۔“ میں نے جواب دیا۔

اس طرح ہماری شادی شدہ زندگی کا آغاز ہو گیا۔ ہم دنیا کے لیے تو میاں بیوی تھے مگر حقیقتاً ہمارے درمیان ایسا رشتہ تھا جو بہن بھائی کے درمیان ہوتا ہے۔ شمس کو ایک اچھی کمپنی میں جاب مل گئی تھی۔ اب چونکہ وہ بظاہر میرا شوہر تھا اس لیے سب کے سامنے میں اس سے ادب و احترام سے بات کرتی۔ ہماری شادی کو ایک سال گزر گیا اور بچے کی کوئی امید نظر نہ آئی تو ساس، سر کو تشویش ہونے لگی۔ سر نے ڈھکے چھپے الفاظ میں شمس کو اپنا چیک اپ کروانے کو کہا۔ اس معاملے میں مجھے تو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا تھا کہ میں ہانچھ نہیں تھی کیونکہ شہاب سے میرے دو بچے تھے لیکن کسی کو کوئی کیا بتاتا کہ شمس نے کتنی بڑی قربانی دی تھی۔ اپنی محبت کی قربانی اپنے نفس کی قربانی، اپنی خواہشات کی قربانی اور اپنے جذبات و احساسات کی قربانی۔

وقت گزرتا رہا اور ہمارے ہاں اولاد نہ ہوئی اور ہوتی بھی کیسے جب فطری تقاضہ پورا نہیں ہو رہا تھا۔ میری ساس روایتی طریقے اختیار کرتے ہوئے اولاد کی خاطر اپنے بیٹے کے لیے تعویذ وغیرہ لاتیں لیکن ہم دونوں جانتے تھے یہ سب بے سود تھا۔

وہ میری زندگی کا بدترین دن تھا جب میں اپنے والدین کے گھر دوسرے شہر آئی ہوئی تھی۔ میری ایک پڑوسن کا فون آیا کہ تمہارے شوہر شمس نے خودکشی کر لی ہے..... یہ خبر سن کر میں دم بخود تھی، مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنا مضبوط شخص

جس نے اپنے اندر کے نفس کو مار دیا، خودکشی بھی کر سکتا ہے؟ میں نے فوراً بچوں کو ساتھ لیا اور گھر آ گئی۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ میرے ساس، سر جن کے ایک بیٹے کا ایکسڈنٹ میں انتقال ہو گیا تھا اور دوسرے نے خودکشی کر لی تھی شدت غم سے مڈھال تھے۔ میری ساس بے ہوش ہو چکی تھی۔ سر بھی جوان بیٹے کی موت پر نوہ کنال تھے۔

شمس کی تدفین کے چند روز بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ شمس کے متعلق سوچ رہی تھی کہ اپنی بیٹی کے ہاتھ میں اپنی ڈائری دیکھی تو فوراً اُلے لی۔ اُس ڈائری میں میرے شب و روز دفن تھے۔ میں نے ڈائری کھولی اور اپنا ماضی پڑھنے لگی۔ اچانک میں ٹھٹھک کر رہ گئی اور ارق کے درمیان شمس کا لکھا ہوا کاغذ پڑا تھا۔ رائٹنگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے جلدی میں کچھ لکھا ہے۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔

”جیلہ! انسان خواہ کتنا ہی اپنے جذبات و احساسات اور خواہشات کا گلا گھونٹ دے مگر کہیں نہ کہیں وہ ہار جاتا ہے۔ میں نے اپنے جذبات کی قربانی دے ڈالی لیکن دکھ کی بات ہے کہ تم نے ہمارے رشتے کو پامال کر دیا۔ تم اپنے جذبات کی قربانی نہ دے سکیں۔ گندگی کو جتنا مرضی چھپاؤ مگر اس کی بدبو اپنی موجودگی کا احساس دلا دیتی ہے۔ گناہ کی دلدل میں دھنسنے سے پہلے میرا نہیں تو اپنے بچوں کا ہی خیال کیا ہوتا۔ میں نے اپنی خواہشات کی قربانی اس لیے نہیں دی تھی کہ تم مجھے زمانے کی نظروں میں رسوا کر ڈالو۔ تم نے تو مجھ سے عہد کیا تھا کہ تم میرا ساتھ دو گی۔ آج اگر میں زندہ ہوتا تو مجھے دوشل کرنا پڑتے ایک تمہارا اور دوسرا اس آشنا

کا اور اس طرح میں تو جیل جاتا ہی میرے خاندان کی عزت بھی خاک میں مل جاتی اسی لیے میں خودکشی کر رہا ہوں۔ افسوس! تم میری محبت کی قدر نہیں کر سکیں۔“ خط پڑھتے ہی میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی بندھ گئی۔ میری بچی مجھ سے لپٹ گئی۔

”مما.....! آپ کیوں رو رہی ہیں؟“ میں اسے کیا بتاتی کہ میں ہی شمس کی قاتل تھی۔ پتا نہیں شمس کو میرے گناہ کا علم کیسے ہو گیا؟ کاش! میں بھی شمس کی طرح قربانی دے سکتی کاش! میں جذبات کے بہاؤ میں نہ بہتی اور اپنے کزن کی طرف نہ بوہتی۔ میں شمس کی قبر پر بیٹھی رو رہی تھی کہ ایک خیال نے میرا دماغ مفلوج کر کے رکھ دیا۔ میرے اندر پرورش پانے والا گناہ کا بیج جب اس دنیا میں آئے گا تو اس کا باپ شمس کہلائے گا۔ کیا شمس کی روح یہ برداشت کر سکے گی؟ میں نے اس گناہ کی نشانی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر ڈالا۔ آج سوچتی ہوں میں نے اُس کی قربانی کا کیا صلہ دیا؟“ یہ کہتے کہتے جیلہ بھائی کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ ”گوکہ میرے اس گناہ کا آج تک کسی کو پتا نہ چلا مگر میرا ضمیر ہر لمحے مجھے بچو کے لگاتا ہے۔ اپنے اس گناہ کا اعتراف آج نہ کرتی تو شاید میرا دماغ پھٹ جاتا۔ میری یہی التجا ہے کہ خدارا! نفس کے بہاؤ میں آ کر اپنے خوبصورت رشتوں کو پامال مت کریں ورنہ ساری زندگی میری طرح اذیت میں گزرے گی۔ میں نے بھی کب کی خودکشی کر لی ہوئی اگر میرے بچے نہ ہوتے۔ اب تو صرف اپنے بچوں کی خاطر اب مجھے گناہ کے اس بوجھ کو اٹھائے ہوئے اپنی زیست کا سفر تمام کرنا ہے۔“

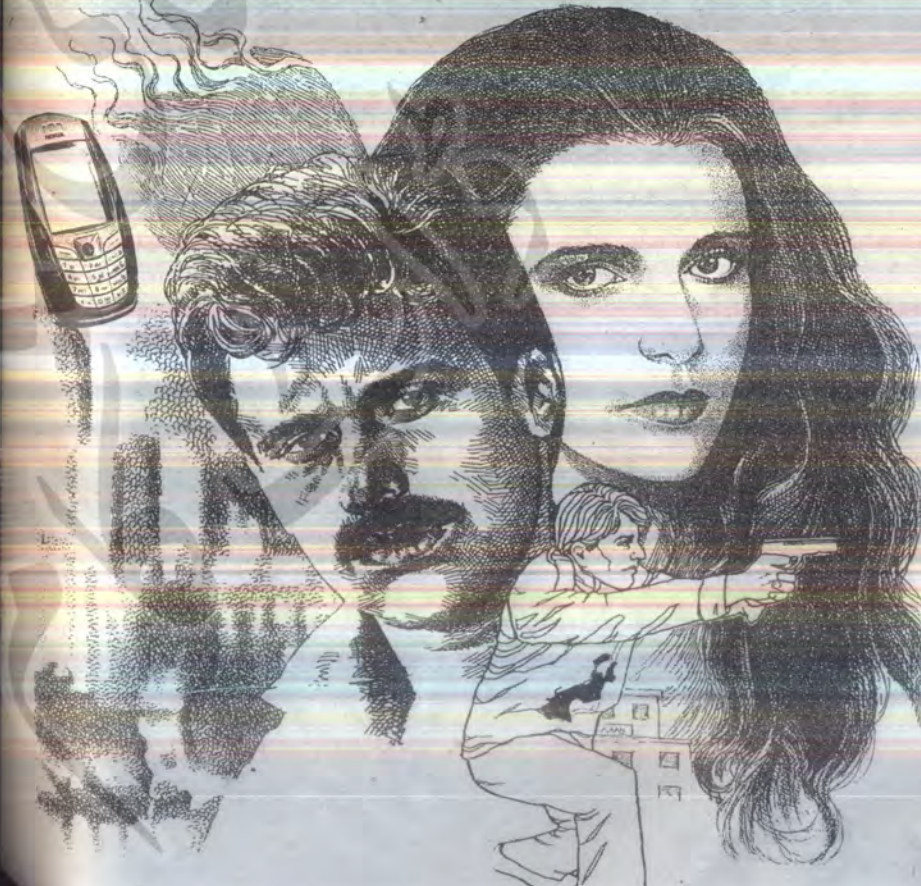
☆☆☆

خلیل جبار

ماضی بنا حال

ارتضاء و ارثی کا خیال
بائے با دل وہ عہد ماضی کے
پھر تصور میں چھائے جاتے ہیں

پیش پرستی میں وہ ایک شخص کا حول اس نے جو بویادی کا نا



سے لگا اور وہ کافی دیر تک اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا حواس
درست ہوئے تو اجو غائب ہو چکا تھا۔ میں جب
دکان پر پہنچا استاد بہت غصے میں تھا۔
میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”استاد کیا
ہوا؟“
”آئے دو اجو کو اسے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ وہ
زندگی بھر یاد رکھے گا۔“
”استاد خیر تو ہے نا؟ آخر اس نے ایسا کیا
کر دیا؟“
”تو اس کی بالکل حمایت مت لینا ورنہ میں تیری
بھی کھال اتار دوں گا۔“ استاد غصے سے چیخا۔ استاد کو
شدید غصے میں دیکھ کر میں خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ
دیر خاموش رہا پھر خود ہی بولا۔
”ہم آج تک استاد کے سامنے نہیں بولے۔
استاد نے ہمیں بچپن میں بہت پیٹا ہے ہم اف تک
نہیں کرتے تھے۔ یہ کل کا بچہ مجھے ڈنڈا مار کر بھاگا
ہے۔“
”اجو نے آپ پر ہاتھ اٹھایا ہے؟“ میں نے
حیرت سے پوچھا۔
”میں کیا فارسی میں بول رہا ہوں؟“ استاد غصے
سے بولا۔
”استاد مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ اس نے ایسا
کیوں کیا؟“ میں نے کہا۔
”آئے دو اس خبیث کو دیکھنا“ میں اس کا کیا
حال کرتا ہوں۔“ استاد طفیل کو شدید غصے میں دیکھ
کر میں نے اپنی خیریت اسی میں جانی کہ خاموشی
اختیار کر لوں ورنہ وہ سارا غصہ مجھ پر اتار دیتا۔ اجو بھی
استاد کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے
دوبارہ پلٹ کر دکان پر نہیں آیا۔
ایک دن وہ سر راہ مجھے مل گیا۔ میں نے جب
اس سے استاد پر ہاتھ اٹھانے کے بارے میں پوچھا

میں موٹر سائیکل ٹھیک کرنے میں مصروف سوچ
رہا تھا کہ استاد طفیل ابھی تک نہیں آیا۔ مجھے استاد طفیل
کی بیٹی مہوش کو کالج سے لانے کی فکر تھی وہ انتظار
کر رہی ہوگی۔ کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر پڑتے ہی
میری بے چینی میں اضافہ ہو گیا۔ اس وقت میرے
پاس کوئی دوست وغیرہ بھی نہیں تھا جسے دکان پر
بٹھا کر کالج جانا۔ استاد طفیل کے ستارے اُن دنوں
گردش میں تھے۔ کبھی اس کی دکان خوب چلتی تھی
موٹر سائیکل مرمت کے ساتھ ساتھ پارٹس کا سامان
آئل وغیرہ بھی دکان پر بکتا تھا۔ کئی رکشے بھی اس
نے کرائے پر دیئے ہوئے تھے ضرورت سے زیادہ
آمدنی انسان کو عیش پرستی کی طرف لے جاتی ہے
استاد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کبھی دن میں اور
کبھی رات میں گھر اور دکان سے غائب ہو جاتا
دکان کو شاکر دستنبھال لیتے تھے لیکن رات میں گھر
سے غائب رہتا اور دن نکلے گھر پہنچنا بیگم کونا گوار
گزرتا تھا اسی لیے آئے دن استاد کے بوی سے
بھگڑتے ہوئے نکلے تھے۔ استاد کو جب غصہ آتا وہ
بوی کو روٹی کی طرح دھک دیتا جو چیز ہاتھ آتی
اس کے دے مارا۔ دکان میں میرے ساتھ اجو بھی
کام سیکھے آتا تھا۔ وہ مجھ سے پرانا تھا اور جبکہ اس
وقت مجھے دکان میں آئے ہوئے چند ماہ ہی ہوئے
تھے۔ میں اسکول سے پڑھ کر دکان پر کام سیکھے آتا
تھا۔ اجو سویرے آکر دکان کھولتا تھا۔
ایک دن اجو گھر پر دکان کی جانی لینے گیا۔ استاد
غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔ استاد کو زور کی بھول لگ رہی
تھی۔ گیس کا پریشر کم آنے سے ناشتہ بننے میں دیر
ہو گئی تھی۔ اجو جیسے ہی گھر میں داخل ہوا استاد نے فی
دی ریوٹ بیگم کے سر پر دے مارا۔ اجو کو یہ
برداشت نہ ہو اور اس نے بھی پاس پڑا لکڑی کا ڈنڈا
استاد کی جانب کھینچ مارا۔ ڈنڈا استاد کے سر پر زور

تو وہ غصے میں آ گیا۔

”تم جانتے ہی ہو کہ ہماری استانی کتنی اچھی عورت ہے۔ بڑے پیار و محبت سے بات کرتی ہے۔ جب بھی گھر میں اچھا کھانا پکاتی ہے ہمارے لیے دکان پر ضرور بھیجتی ہے۔ شکل و صورت بھی اچھی سیرت بھی اچھی! پھر بھی استاد پر اپنی عورتوں کے پاس جاتا ہے۔ جب بھابھی غصہ کرتی ہے استاد اس کی پٹائی کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کتنا ظالم ہے ہمارا استاد! بس اس دن جب استاد نے ٹی وی ریوٹ کھینچ کر استانی کو مارا تو مجھے شدید غصہ آ گیا اور میرے ہاتھ جو لگا وہ استاد کے دے مارا۔“

”وہ ہمارا استاد ہے تمہیں ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔“

”ہوں..... استاد! ایسے شخص کو استاد بنانے سے بے استاد اچھا۔ کئی بار استاد کی بے ایمانی کی عادت کے سبب میں پھٹتے پھٹتے بچا ہوں۔“ اجونے انکشاف کیا۔

”کیسی بے ایمانی جو تم پھٹتے پھٹتے بچے؟“

مجھے حیرت کا جھکا لگا۔ اجو استاد کے پاس کئی سال سے کام کر رہا تھا اور مجھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اس لیے استاد طفیل کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں تھیں۔

”استاد آکل کے ڈپٹی کی سیل اس طرح کھولتا ہے کہ پھر دوبارہ دو نمبر آکل ڈال سکے اور سیل بھی ڈبے سے اس طرح دوبارہ لگ جائے جیسے ڈبہ کھلا ہی نہیں ہے۔ اکثر وہی قسم کے لوگ مجھے ڈبے سے سیل کو ہٹاتے ہوئے دیکھتے رہتے ہیں۔ کبھی بے دھیانی میں طاقت کا مظاہرہ کرنے سے پہلے ہی سیل ہاتھ میں آ جائے تو ایسے گا بک مجھ سے بحث شروع کر دیتے ہیں کہ تم بے ایمان ہو، بڑی مشکل سے انہیں سمجھانا پڑتا ہے کہ میں نے طاقت لگائی تھی، سیل

بغیر طاقت لگائے نہیں کھلتی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب استاد کو اللہ اتنا دے رہا ہے پھر ایسے بے ایمانی کرنے کی کیا ضرورت ہے اور ہاں تمہیں پتا ہی ہے استاد کیٹی ڈالتا ہے وہ خود کو اور اپنے قریبی دوستوں کو فائدہ پہنچانے کو ہر ماہ پرچیوں میں ایک پرچی پر مخصوص نشان ڈال دیتا ہے اور مجھے پرچی اٹھانے کو کہتا ہے وہ نشان والی پرچی اکثر پرچیوں میں دب جانے سے فوراً نظر نہیں آتی اور مجھے اس وقت بڑی الجھن ہوتی تھی اور میں پریشانی کے عالم میں پرچیوں کو فور سے دیکھتا کہ کس پرچی کو اٹھاؤں؟ کتنی ممبران کو شک ہونے پر وہ میری پٹائی کر دیں گے اور استاد والی پرچی ہاتھ میں نہ آنے پر ان کتنی کے ممبران کے جانے پر استاد میری پٹائی کرے گا۔ شکر ہے استاد طفیل کی دکان سے میری جان چھوٹ گئی۔ اب کبھی بھول کر بھی میں اس کی دکان پر نہیں جاؤں گا۔ مجھے اچھا اور ایمان دار استاد مل گیا ہے۔ وہ استاد طفیل کی طرح یہ نہیں کرتا کہ پارٹس کا سامان منگوا کر کچھ سامان گاڑی میں لگایا اور بیچ جانے والا سامان پارٹس والے کو واپس دے کر رقم اپنی جیب میں رکھ لی۔“

”اس کا مطلب ہے اب تم استاد کے پاس کام کرنے نہیں آؤ گے؟“ میں نے کہا۔

”ہاں میں اب کبھی بھول کر بھی اس کی دکان پر نہیں آؤں گا۔“ اجونے کہا۔ ”لڑکے تم ابھی تک نہیں گئے؟“ استاد کی آواز پر میں چونکا۔

”استاد میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

”نذیر کا دامغ درست کرنے کیا تھا سی لیے دبو ہوگی۔ آئے دن اس کی نئی کہانی ہوتی ہے کہ دھننا نہیں ہوا، کبھی کہتا ہے کہ رکشہ ہی نہیں نکالا۔ میں بھی اس کو کہہ کر آ گیا ہوں، مجھے روزانہ رکشہ کا کرایہ چاہیے، جس دن تم رکشہ کی چھٹی کرو رکشہ میری دکان

رکھ کر دیا کرو۔ اگر جس دن رکشہ میری دکان پر نہ ہوگا اس دن کامیں کرایوں گا۔“

”ہاں استاد ایسے بے ایمان لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہیے۔“ میں نے استاد کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”اچھا، مہوش بیٹی انتظار کر رہی ہوگی۔ جلدی جاؤ اسے لینے،“ استاد نے موٹر سائیکل کی چابی مجھے دی۔

مہوش کا کالج زیادہ دور نہیں تھا، مشکل سے دس منٹ کا راستہ ہوگا۔ مہوش اپنی سیلیوں کے ساتھ بھی کالج سے گھر پہنچ سکتی تھی لیکن استاد طفیل کے دل میں جانے کیوں خوف تھا اس لیے اس نے مہوش کو کالج چھوڑنے اور لانے کی ڈپٹی میرے ذمے لگائی تھی۔ جس دن میں چھٹی کرنا استاد خود اسے چھوڑنے جاتا تھا۔ جب سے استاد کی بیوی نانکہ کا انتقال ہوا تھا استاد بہانے بہانے سے گھر کے کئی چکر لگانے لگا تھا حالانکہ گھر میں استاد کے بھائی کی فیملی اور بوڑھی ماں رہتی تھی پھر بھی اسے کسی پر اعتماد نہیں تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوتی تھی کہ استاد اتنا شکی اور وہی ہو گیا ہے مگر مجھ پر کیوں بھروسہ کرتا ہے؟ استاد بڑی شانہ زندگی گزار سکتا تھا، اس کی دکان بہت اچھی چلتی تھی، آکل اور پارٹس کا بھی سامان خوب بکتا تھا، موٹر سائیکل کی مرمت کے لیے لوگ استاد کے پاس ہی آتے تھے۔ انہیں استاد پر پورا بھروسہ تھا اور استاد اس بھروسے کا پورا فائدہ اٹھاتا تھا۔ وہ کسٹمرز سے ایک نمبر پارٹس منگواتا تھا اور موٹر سائیکل مالک کے جانے پر پارٹس واپس کر دیتا اور اس کی جگہ اپنے پاس سے دو نمبر پارٹس لگا دیتا۔ استاد کی اصل ”پیدا“ موٹر سائیکل کے انجن کھولنے پر ہوتی تھی۔ وہ موٹر سائیکل کے مالک سے ڈھیر سارے پارٹس منگواتا جس میں سے آدھا سامان انجن بنانے میں

کام آتا تھا، باقی وہ پارٹس والے کو واپس کر کے پیسے کھرے کر لیتا تھا۔ پارٹس کی دکان والا استاد کے اس کام سے خوش نہیں تھا مگر وہ مجبور تھا، اگر وہ استاد سے سامان واپس کرنے پر حجت کرنا تو اسے آئندہ دوسرے پارٹس والے سے سامان لینے کی استاد کی دھمکی کام کرجانی اور پارٹس والا خاموشی سے سامان واپس کر لیتا۔

پارٹس کا کاروبار کرنے والے ان استاد قسم کے لوگوں سے بہت خار کھاتے ہیں، پیچھے سے خوب کھری کھری سناتے اور گندی گندی گالیاں دیتے ہیں لیکن استادوں کے سامنے ان کی خوشامد اور تعریفیں اس طرح کرتے ہیں جیسے دنیا میں ان سے اچھا یا فرشتہ صفت انسان کوئی نہیں ہے۔

استاد اصل مزدوری کے علاوہ ہونے والی آمدنی کو ’بونس‘ کہتا تھا۔ وہ کہتے ہیں ناں کہ حرام کی کمائی اپنے ساتھ اصل رقم کو بھی ساتھ لے جاتی ہے۔ استاد کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

استاد کو جوئے کی لت بھی تھی وہ پہلے کم پیسوں سے جوا کھیلتا تھا پھر جوئے میں زیادہ رقم لگانے لگا۔ وہ جتنی زیادہ رقم جوئے میں لگاتا ہارتا تھی اس کا مقدر زہنی جاری تھی۔ استاد اس امید پر کہ آج بار ہوگی لیکن کل ضرور جیت ہوگی، پچھلی ساری کسر پوری ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ ہر روز جیت کی امید پر رقم ہارتا رہا، نویت یہاں تک پہنچی کہ پہلے آکل والے نے پھر رکشہ کے پارٹس والے نے مال ادھار دینے سے انکار کر دیا۔ موٹر سائیکل کے پارٹس والے نے بھی اصل رقم کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ استاد کے رکشہ جو کرائے پر چل رہے تھے ایک ایک کر کے سب بک گئے۔ استاد کو پھر بھی نصیحت نہیں ہوتی۔ وہ پہلے کی طرح ہر روز جیت کی آس پر جوا کھیلتا رہا اور فلاش ہوتا رہا۔ پرچوں والے سمیت

غرض جس سے بھی ادھار سامان لیتا تھا انہوں نے ادھار دینا بند کر دیا تھا۔ دکان مالک بھی سال بھر کا کرایہ چڑھ جانے پر دکان خالی کرانے کی دھمکی دینے لگا تھا۔ ایسے میں استاد کی بیوی نالہ بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اب اس کی کل کائنات مہوش ہی رہ گئی تھی جو کالج میں سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھی۔

مجھے استاد طفیل کی حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوتا تھا۔ استاد کی بربادی میں کسی دوسرے کا نہیں خود اس کا اپنا ہاتھ تھا۔ مجھے استاد کے وہ دن یاد آتے تھے جب اس کی بھری ہوئی دکان تھی۔ رات جب وہ گھر جاتا تھا اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوتی ہوتی تھیں اور آج یہ عالم تھا کہ قرض میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب وہ جو اکیلنا تقریباً بھول چکا تھا۔ کوئی پرانی آشنا عورت اس کے پاس آجائے تو وہ بڑی حسرت سے کبھی اپنی خالی جیبوں اور کبھی اس عورت کو دیکھنے لگتا۔ آنے والی عورت شرمندہ سی ہو کر آگے بڑھ جاتی۔

میں جب کالج پہنچا، مہوش کالج کے گیٹ پر کھڑی کسی لڑکے سے باتیں کر رہی تھی۔ دور سے اس نے مجھے آتا دیکھ لیا تھا اس لیے محتاط ہو کر لڑکے سے دور کھڑی ہو گئی۔ میں چند دن سے محسوس کر رہا تھا کہ مہوش کی لڑکے سے باتیں کر رہی ہوتی تھی اور مجھے دیکھ کر ایسی بن جاتی تھی جیسے وہ اس لڑکے کو جانتی تک نہیں ہے۔ میں نے کئی بار مہوش سے لڑکے کے بارے میں پوچھا لیکن وہ ہر بار ٹال جاتی تھی اور مجھے کہتی۔

”تھیں وہ ہم ہو گیا ہے میرا اس لڑکے سے کیا تعلق؟ وہ اپنی بہن کو کالج سے لینے آتا ہے کبھی جب اس کی بہن پر ٹیکٹل کے سلسلے میں لیٹ ہو جاتی ہے وہ مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ لیتا ہے۔“

مجھے مہوش کی اس بات سے تسلی نہیں ہوتی تھی اور میرے دل میں ایک شک جنم پانے لگا تھا مگر بغیر ثبوت کے میں استاد کو بھی اس حوالے سے کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔

ایک دن میں محلے کی پرچون کی دکان پر سودا سلف لینے گیا۔ پرچون والے کے پاس وہی لڑکا بیٹھا ہوا نظر آیا وہ مجھے دیکھ کر ایسا بن گیا جیسے پہلی بار دیکھا ہو پھر زیادہ دیر کا نہیں اور وہاں سے چل دیا۔ سامان خریدتے ہوئے میں نے دکان دار سے پوچھ ہی لیا۔

”کاشف! یہ لڑکا کون تھا؟“ میرے پوچھنے پر اس کی آنکھوں میں ایک پراسراری چمک آ گئی۔ کاشف مجھ سے چند سال ہی بڑا تھا، اپنے والد کی غیر موجودگی میں دکان وہی سنبھالتا تھا۔

”کیوں خیر ہے نا؟“ میرے دوست کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟“

”بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا یہ لڑکا مجھے کچھ اچھا نہیں لگا ہے۔“ میں نے کہا۔

”بیشک تجھے کیا معلوم؟“ مسلمان بہت ہی پیارا لڑکا ہے۔ سمجھ لے یاروں کا یار ہے۔“ کاشف نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”یاروں کا یار ہے میں کچھ سمجھتا نہیں۔“ میں نے کہا۔

”کسی کو یہ بات بتانے کا وعدہ کرو تو میں اس کے متعلق کچھ بتا سکتا ہوں۔“ کاشف نے راز دارانہ انداز میں میری طرف جھکتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارے دوست کو جانتا ہی نہیں پھر میں مسلمان کے بارے میں اس کے جاننے والوں کو کیا بتاؤں گا؟ میں صرف اپنی تسلی کے لیے معلومات کر رہا ہوں۔“

”میرے والد کو بھی کچھ نہیں بتانا۔“

”یہ میرا تم سے وعدہ ہے، اگر کوئی چھپانے کی بات ہوئی تو میں انہیں نہیں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”مسلمان بہت ہی پیارا لڑکا ہے، اسے باتیں کرنے کا فن خوب آتا ہے، موبائل پر مختلف لڑکیوں سے دوستیاں کر کے انہیں پھانسی لیتا ہے، لڑکیاں بھی اس کی باتوں میں کھو جاتی ہیں اور اسے اپنا آئیڈیل سمجھتی ہیں۔ وہ اپنے گھر والوں سے زیادہ مسلمان پر اعتبار کرنے لگتی ہیں۔ مسلمان بھی موبائل پر اپنی

مجھے دار باتوں کے فن کا بھرپور فائدہ اٹھا کر انہیں پہلے مختلف تفریحی مقامات کی سیر کراتا ہے جب لڑکیوں کو اس پر اعتبار ہو جاتا ہے تو وہ لڑکی کو اپنے کرائے کے فلیٹ پر لے جا کر اپنی ہوس مٹاتا ہے اور ان کی شرم ناک مودوی بنا کر محفوظ کر لیتا ہے، جب لڑکی اس گندے عمل سے انکار کرتی ہے اور شادی کرنے کو کہتی ہے تو مودوی گھر بھجھنے کی دھمکی دے کر

بلیک میل کرتا ہے اور لڑکی بھی قلم دیکھ کر اس کے اشاروں پر چلنے پر مجبور ہوتی ہے۔ وہ اس عیاشی میں اپنے دوستوں کو بھی دعوت دیتا ہے۔ لڑکی مجبور ہو کر مسلمان کی ہر بات ماننے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ ان دنوں اس کے پاس ایک بڑی ہی اچھی کم عمر لڑکی صبح کے وقت آتی ہے۔ وہ اور اس کے دوست خوب عیش کر رہے ہیں کبھی تمہارا بھی عیش کرنے کا ارادہ ہو

مجھے بتا دینا۔“ کاشف نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

اس کی باتیں سن کر میں سنائے میں آ گیا تھا کہ کہیں وہ لڑکی مہوش نہ ہو مگر میرا دل نہیں مانا کہ مہوش ایسی نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنا شک دور کرنے کو صبح کے وقت مہوش کو کالج کے گیٹ پر چھوڑا اور وہاں سے کچھ دور جا کر گاڑی ایک گلی میں کھڑی کی اور چھپ کر کالج سے دور کھڑا ہو گیا۔ میری نظریں گیٹ پر لگی ہوئی تھیں۔ ابھی چند منٹ ہوئے تھے کہ مہوش گیٹ سے باہر آئی۔ مسلمان موٹر سائیکل لیے آ گیا

اور مہوش کے اس پر بیٹھتے ہی اس نے موٹر سائیکل تیزی سے آگے بڑھا دی۔ یہ منظر دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ کاشف ٹھیک کہہ رہا تھا، وہ لڑکی استاد طفیل کی بیٹی مہوش ہی تھی۔ مجھے کاشف نے مسلمان کے فلیٹ کا نمبر اور پلازہ کا نام بتایا ضرور تھا لیکن میں کم عمر لڑکا تھا، فلیٹ پر مسلمان کے دوستوں کے ہونے کی صورت میں تنہا ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ مجھ پر

جھوٹا الزام لگا کر کبھی بھی معاملے میں پھنسا بھی سکتے تھے جو لڑکیوں کو پھانسی کر بلیک میل کر سکتے ہیں، ایسے لوگوں کا میں بھلا کیا مقابلہ کرتا۔ مہوش بھی مسلمان کے کہنے میں آ کر میرے خلاف گواہی دیتی، یہی سوچ کر میں پریشان سا چہرہ لیے چلا آیا۔ میرے ذہن میں کشمکش چل رہی تھی کہ میں استاد کو یہ بات بتاؤں یا نہیں؟ اگر بتاؤں تو کس طرح؟ استاد طفیل کے غصے سے مجھے ویسے ہی خوف آتا تھا۔ میں جب

دکان پر پہنچا، میرا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ کم عمر ہونے کے سبب میں چہرے سے بچتی خوف کی کیفیت کو چھپانے کی کوشش میں ناکام رہا۔ استاد جہاں دیدہ شخص تھا، وہ میری صورت دیکھتے ہی سمجھ گیا، ضرور کوئی بات ہے۔

”کیا بات ہے شبیر، خیریت ہے نا؟“ استاد نے پوچھا۔

”ہاں خیریت ہے۔“ میں نے استاد سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا ہے تجھے بتاتا کیوں نہیں؟“ اس نے میرے شانوں کو پکڑ کر میرا رخ اپنی طرف کیا۔ ”بول“ کیا بات ہے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو بڑے خوش گوار موڈ میں گیا تھا اور اب آیا ہے تو تیرہ چہرہ اترا ہوا ہے؟ اتنا خوف زدہ ہے کہ جیسے تو کوئی چوری کر کے آیا ہے اور اپنے پکڑے جانے کے خوف سے پریشان ہے؟“

”کیا بات ہے شبیر، خیریت ہے نا؟“ استاد نے پوچھا۔

”ہاں خیریت ہے۔“ میں نے استاد سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”کیا ہوا ہے تجھے بتاتا کیوں نہیں؟“ اس نے میرے شانوں کو پکڑ کر میرا رخ اپنی طرف کیا۔ ”بول“ کیا بات ہے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو بڑے خوش گوار موڈ میں گیا تھا اور اب آیا ہے تو تیرہ چہرہ اترا ہوا ہے؟ اتنا خوف زدہ ہے کہ جیسے تو کوئی چوری کر کے آیا ہے اور اپنے پکڑے جانے کے خوف سے پریشان ہے؟“

”کیا بات ہے شبیر، خیریت ہے نا؟“ استاد نے پوچھا۔

”استاد.....! استاد.....! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ میں استاد طفیل کے غصے سے ہوتے سرخ چہرے سے نروس ہوتا جا رہا تھا اور مسلسل نظریں پتلی کیے ہوئے تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ استاد سے نظریں ملا کر بات کر سکوں۔ استاد کو میری اس کیفیت پر غصہ آ گیا تھا اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سب کچھ بتا دوں۔ میری خاموشی استاد کو بے چین کیے دے رہی تھی وہ غصے میں بھر چکا تھا۔ جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو اس نے بجلی کی وائر اٹھا کر میری پیٹھ پر مارنا شروع کر دی۔ مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہ ہو سکی اور میں سسک پڑا جو بات بتانے کے لیے میں منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ کس طرح استاد کو بتائی جائے وہ فر فر بولنے لگا۔ استاد کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے مجھ سے گاڑی کی چابی لی اور گاڑی کو تیزی سے دوڑاتا ہوا چلا گیا۔

رات گئے تک استاد طفیل کی واپسی نہیں ہوئی تو مجھے بڑی فکر ہوئی، میں ڈرتے ڈرتے استاد کے گھر گیا۔ گھر کے باہر بھوم بھوم تھا، وہیں مجھ پر محلے والوں کی زبانی علم ہوا کہ استاد نے مہوش کو چند اوباش لڑکوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے دیکھ لیا تھا، اس سے یہ منظر برداشت نہ ہو سکا اور موقع پر ہی اس نے مہوش اور ان عیاش لڑکوں کو گولی مار کر ہلاک کر کے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ مجھے یہ سن کر شدید جھکا لگا، خاصی دیر تک میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا؟

مہوش کی لاش پوسٹ مارٹم کے بعد آ چکی تھی۔ اسے غسل دے کر رات میں ہی تدفین کر دی گئی۔ صبح میں پولیس نے استاد طفیل کو عدالت میں ریمانڈ حاصل کرنے کے لیے پیش کر دیا تھا۔ میں بھی استاد

طفیل سے ملاقات کرنے عدالت پہنچ گیا۔ استاد کا چہرہ اترا ہوا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں کا بیار ہو۔

”استاد.....! یہ سب.....“

”شہیر بیٹے، میں نے جب تمہارے منہ سے مہوش کے حوالے سے بات سنی میرے ہوش اڑ گئے تھے پھر میں نے مہوش کو ان اوباش لڑکوں کے ساتھ شرم ناک حالت میں دیکھا تو میں ہوش کھو بیٹھا، مجھے کچھ نہیں سوچ رہا تھا، غصے میں ریو اور نکال کر میں نے سب کو قتل کر دیا۔ مہوش کے قتل کے بعد میری زندگی کا مقصد بھی ختم ہو گیا تھا، اس لیے میں نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ زندگی کی جو تھوڑی بہت سائیس ہیں، وہ اب جیل کی کال کوٹھری میں پوری ہوں گی۔“

”سمجھ میں نہیں آ رہا استاد، آپ کے ساتھ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟“

”شہیر، اپنا کیا ہی سامنے آتا ہے، میں جوانی کے جوش میں وہ کچھ کر گیا تھا جو مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ آج میں کسی کی عزت سے کھیل رہا ہوں تو کل کوئی دوسرا بھی میری عزت سے کھیل سکتا ہے۔ میرا ماضی، حال، بن کر میرے سامنے آ گیا۔ میں اپنی زندگی گزار چکا ہوں، شہیر بیٹے، تم کبھی جی وہ نہیں کرنا جس کا اس عمر میں آکر تمہیں بچھتاوا ہو۔“ یہ کہتے ہوئے استاد طفیل کی آواز بھرا گئی، آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

میں وہاں کھڑا ابھی سوچ رہا تھا کہ ہر انسان مکافات عمل سے ضرور گزارتا ہے اس کا اپنا کیا زندگی میں کسی بھی موڑ پر آ کر ہی رہتا ہے۔ جوانی جوش میں ہوش کھونے کا نام نہیں بلکہ ہوش سے کام لینے کا کام ہے۔

☆☆☆☆

عقل کو گند کر دینے والی ایسی کہانیاں جن پر دل اور ذہن یقین نہیں کرتا

پراسرار کہانیاں

انور فرہاد

آخری آرام گاہ

سلی پتوں کو لے کر گھر میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران اور پریشان ہو گئی کہ، مٹی جیسے ہوا میں تیر رہی ہو، لگتا تھا جیسے کہ کوئی اُسے فضا میں، گود میں لیے چپ کرانے کی نیت سے ادھر ادھر گھوم رہا ہو مگر.....

پراسرار کہانیوں کے شوہین قارئین کے لیے سب سے منفرد کا حصہ خاص



مسٹر اینڈ مسز عبداللہ کو ہم نے اپنے گھر میں رات کے کھانے پر مدعو کیا تھا۔ تقریباً کچھ بھی نہیں تھی، بس یونی کھانے پر بلا لیا تھا۔ بات دراصل یہی تھی کہ عبداللہ جو میرے بچپن کا دوست ہے ایک طویل عرصے کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی اور جب اس نے بتایا کہ وہ بھی اسی شہر میں سکونت پذیر ہے تو بڑی خوشی ہوئی اور تجب بھی ہوا کہ ایک ہی شہر میں رہنے کے باوجود ہم دونوں ایک دوسرے کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ شادی کی یا ابھی تک اکیلے ہو؟“

اس نے سارے سوالات کا جواب مختصر انداز میں دیا تو میں نے اس سے کہا۔ ”باقی ساری باتیں تفصیل سے ہوں گی۔ تم ایسا کرو کہ ہفتے کی رات کو بیگم کو ساتھ لے کر میرے گھر آ جاؤ۔ میرے بیوی بچوں سے بھی مل لینا اور ہمارے ساتھ کھانا کھا لینا۔“

اور اس نے اپنی پرانی عادت کے مطابق بڑی شرافت سے میری دعوت قبول کر لی اور ہفتے کی شام کو اپنی بیگم کے ساتھ ہمارے گھر پہنچ گیا۔

”یہاں تک آنے میں دشواری تو نہیں ہوئی؟“ میں نے عبداللہ سے پوچھا۔

”ہاں..... چھوڑی سی دشواری ہوئی۔“ اس نے میرے گھر کو تعریفی لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا مکان تو بہت اچھا ہے مگر بڑے کونے کدھرے میں واقع ہے۔ ہم دونوں ادھر ادھر بھٹکتے پھر رہے تھے کہ اچانک ایک لڑکے نے ہم سے پوچھا۔ ”انکل..... کسی کو تلاش کر رہے ہیں کیا؟“

”ہاں بھئی مگر ان کا مکان نہیں مل رہا ہے۔“

”کون ہے وہ؟ کیا پتا ہے ان کا؟“

”میں نے جب سے تمہارا دیا ہوا پتا تھا دیا۔ اس پر ایک نظر ڈال کر بولا۔ ”آئیے میں آپ کو پہنچا دوں۔“ اور پھر اس نے ایک دو گلیوں سے گزار کر تمہارے مکان کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ ”یہ ہے وہ مکان۔“ ہم نے دروازے پر لکھا تمہارا نام اور پتا پڑھ کر اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جو اس کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھا۔

”ارے..... وہ لڑکا کہاں چلا گیا؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

مجھ سے ذرا فاصلے پر ناہید سلطانہ کھڑی تھیں انہوں نے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ ”وہ نہیں تو کھڑا تھا میرے اور آپ کے درمیان گمروہ کب گیا؟ کہاں گیا؟ کیسے گیا؟“

میں نے اور میری بیگم نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرائے۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ اس نے قدرے خشکی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ہماری حیرانی اور پریشانی پر آپ مسکرا رہے ہیں؟“

”اوہو یا زاس بات پر حیرانی اور پریشانی کیسی کوئی بھوت پریت ہوگا..... ہمیں راستہ بتا کر غائب ہو گیا.....“

”تیری عادتیں اب تک نہیں بدلی ہیں اب بھی تو لوگوں کو پریشان کر کے لطف لیتا ہے؟“

”وہ..... وہ ملا بھی تو اسی طرح اچانک تھا اچانک نظر آتے ہیں اچانک غائب بھی ہو جاتے ہیں اور کبھی بھی نظر نہیں آتے ہیں مگر اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلاتے ہیں۔“

”کیوں بند کرو.....“ عبداللہ نے ڈانٹنے کے انداز میں مجھ سے کہا۔ ”یہ بھوت پریت کی کہانیاں صرف کہانیوں میں ہوتی ہیں حقیقتاً ان کا کوئی وجود

لجے میں پوچھا۔

عبداللہ نے پہلے مجھے عجیب نظروں سے دیکھا پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ ”تم ٹھنڈی بوتلیں لینے باہر گئے اور بھابی سلمیٰ پکن میں چل گئیں تو میں نے سوچا اس دوران ذرا مطالعہ ہی کر لوں یہ سوچ کر میں نے میز کے نیچے رکھے ہوئے رسالے کو اٹھا کر ابھی کھولا بھی نہیں تھا کہ کسی نے رسالہ میرے ہاتھ سے چھین کر میز پر رکھ دیا۔ میں نے غصے سے ادھر ادھر دیکھا کہ یہ حرکت کس نے کی ہے؟ مگر وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ ناہید مجھ سے خاصے فاصلے پر بیٹھی تھی اور اس کی نگاہیں گھڑی کے پنڈولم پر مرکوز تھیں۔ میں نے دوبارہ پرچا اٹھالیا۔ اس بار بھی کسی نے اسے چھین کر میز پر رکھ دیا۔ میری حیرانگی میں اضافہ فطری امر تھا مگر مجھے اس کے ساتھ غصہ بھی آ رہا تھا کہ یہ بدتمیزی کون کر رہا ہے؟ اب کی بار جو میں نے رسالے کی طرف ہاتھ بڑھایا تو کسی نے میری کلائی پکڑ لی۔ گرفت اتنی سخت تھی کہ لگتا تھا کلائی کی ہڈی ٹوٹ جائے گی مگر حیران کن بات یہ تھی کہ کلائی پکڑنے والا ہاتھ نظر آ رہا تھا نہ ہاتھ والا۔ میں تکلیف سے چیخ پڑا۔

”چھوڑو میرا ہاتھ.....“

بجائے کلائی چھوڑنے کے، نظر نہ آنے والی گرفت اور تنگ ہو گئی۔ میں پھر ایک بار بلبللا اٹھا۔ ”میری ہڈی چیخ رہی ہے میرا ہاتھ چھوڑو.....“

ناہید نے میری پہلی آواز پر میری طرف حیرت سے دیکھا تھا مگر شاید اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آئی تھی۔ دوسری بار میری آواز پر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آئی اور بولی۔ ”یہ آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں؟“

”دیکھو تو..... کسی نے میری کلائی پکڑ رکھی

نہیں ہوتا۔“ پھر اپنی بیوی کو مخاطب کر کے بولا۔ ”یہ شروع ہی سے ایسا ہی ہے لوگوں کو ڈرا کر پریشان کرتا ہے اور دوسروں کی پریشانی سے محفوظ ہوتا ہے اس کی باتوں پر تو جہنہ دو درنہ جہنمیں ڈرا کر خوف زدہ کر کے خوش ہوگا۔“

میری بیوی نے مسکراتے ہوئے ناہید کا بازو پکڑ کر اسے اپنے قریب ہی بٹھالیا اور پھر دونوں باتوں میں لگن ہو گئیں۔ میں دوسرے صوفے پر عبداللہ کے ساتھ بیٹھ گیا اور موجودہ حال کے بارے میں تبادلہ خیال کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد میں نے اپنی بیوی سے کہا۔

”ارے بھئی سلمیٰ اب بھوک لگنے لگی ہے کھانا کب کھلاؤ گی؟“

”جب ان لوگوں کو بھوک لگے گی۔“

”کیوں بھئی؟ تم لوگ کب کھانا کھاتے ہو؟“

عبداللہ نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اب ہمارے کھانے کا وقت بھی ہونے والا ہے۔“

سلمیٰ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”تو پھر میں کھانا لگانے کی تیاری کرتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پکن کی طرف جانے لگی پھر دو قدم جا کر پٹی اور مجھ سے بولی۔ ”جب تک میں کھانا لگاتی ہوں آپ ذرا بھاگ کر کولڈ ڈرنک کی دو بڑی بوتلیں تولے کو آ جائیں۔“

مجھے جانے اور واپس آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی مگر واپس آیا تو یہاں کا منظر بڑا افسوسناک تھا عبداللہ کی سیدھی کلائی پر ایک پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس کی بیوی سرا سیمہ حالت میں اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔

”ایں..... یہ کیا ہو گیا تم کو؟“ میں نے پریشان

ہے.....“ میں نے بڑی بے بسی سے کہا۔ میرے چہرے سے تکلیف کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ ”گرفت اتنی سخت ہے کہ میری ہڈی چھتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔“

ناہید نے ہونفوں کی طرح میری طرف دیکھا شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟ مگر.....“ اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ ”مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے آپ کی کلائی پر تو کوئی گرفت دکھائی نہیں دے رہی ہے؟“

ٹھیک اسی وقت وہ اُن دیکھا ہاتھ میری کلائی سے ہٹ گیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی کلائی سے خون کے قطرے بہنے لگے تھے جسے دیکھ کر ناہید کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ”ہائے اللہ! یہ خون کیوں بہ رہا ہے؟“ اس نے رندگی ہوئی آواز میں کہا اور وہیں سے بھائی بھائی کہہ کر تمہاری بیگم کو آوازیں دینے لگی۔ وہ آئیں تو انہیں بھی مجھے اس حال میں دیکھ کر جیرانی ہوئی تھی۔ ”یہ آپ کے ہاتھ میں چوٹ کیسے لگی عبداللہ بھائی؟ خون کیوں نکل رہا ہے آپ کی کلائی سے؟“ اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اس کی ڈریسنگ کے لیے متعلقہ سامان لانے اندرونی کمرے کی طرف بھاگی تھیں پھر جب وہ ناہید کے ساتھ اس کی ڈریسنگ کر رہی تھیں تو کلائی کے زخم کو دیکھ کر اپنا سوال دہراتے ہوئے بولیں۔ ”کس طرح یہ زخم لگا؟“ اب میں نے

ساری رو داد سنائی اور کہا۔ ”دیکھیے، کیسا فولادی ٹکچہ تھا کہ کلائی اہولہان ہو گئی۔“

میں نے عبداللہ سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”یاز اس گھر میں ایسے ہی ناپسندیدہ اور تکلیف دہ واقعات ہمارے ساتھ بھی ہوتے رہتے ہیں۔“

”تو کیا.....“ بیگم عبداللہ جھٹ بول پڑیں۔ ”یہ

گھر آسب زدہ ہے؟“

”ہاں.....“ میرے بجائے میری بیگم نے انہیں جواب دیا۔ ”بھی کبھی ایسی قیمتی چیزیں برباد ہو جاتی ہیں کہ.....“

”جس وقت ان کے ساتھ.....“ ناہید عبداللہ بولیں۔ ”کلائی مروڑنے کا کھیل ہو رہا تھا میں گھڑی کے پنڈولم کو دیکھ رہی تھی مجھے یہ دیکھ کر بڑا توجہ ہو رہا تھا کہ یہ پنڈولم اس تیزی سے کیوں حرکت کر رہا ہے؟ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی جلدی جلدی انہیں حرکت دے رہا ہو۔“

”یاز اگر اس گھر میں بھوتوں کا بے برابر ہے تو یہ گھر تم چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟“ عبداللہ پوچھ رہا تھا۔

میں نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔ ”مجھوری میرے یاز مجھوری..... بڑی مشکلوں سے ایک ایک پیسا جوڑ جوڑ کر بڑے دنوں کے بعد یہ گھر بنایا ہے اسے چھوڑنا اب ہمارے لیے ممکن نہیں۔ اگر اس کی تعمیر سے پہلے ہمیں معلوم ہو جاتا کہ یہاں کچھ نظر نہ آنے والی ہستیاں بھی ہستی ہیں تو ہم ہرگز اس پر اپنا پیسا اور وقت صرف نہ کرتے، ہمیں تو مکان کی مکمل تعمیر اور یہاں رہائش کے بعد آہستہ آہستہ پتا چلا۔

ابتدا میں ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا مگر پھر ہمیں ذہنی تکلیف کے ساتھ ساتھ جسمانی اور مالی اذیت بھی پہنچانی جانے لگیں۔“ مگر تم نے جو بھوت پریت کے بارے میں ابھی ذرا در پر پہلے یہ کہا تھا کہ میں ان پر یقین نہیں رکھتا یہ سب فضول باتیں ہیں شاید اسی لیے انہوں نے ہمیں یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ فضول باتیں فضول نہیں ہیں۔ بھوتوں یعنی روحوں کے وجود سے منکر نہیں ہونا چاہیے۔“

”ہاں.....“ یہ کہہ کر عبداللہ ذرا در تک خاموش

رہا اور اپنی کلائی پر بندھی پٹی کو گھورتا رہا پھر بولا۔ ”اب یقین نہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ زندگی بھر کے لیے مجھے یہ سبق مل گیا ہے کہ.....“

”ناہا.....“ ٹھیک اسی وقت زبردست قہقہوں کی گونج سنائی دی تھی، یوں لگا تھا جیسے ڈرائنگ روم کے دروازوں سے کھڑکیوں سے دیواروں سے اور چھت سے قہقہوں کی بازگشت آرہی ہو۔ ہم سب گھبرا گھبرا کر دروازوں کو دیکھنے لگے اور شاید قہقہے لگانے والوں کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگے مگر وہاں تھا کون کر نظر آتا؟ ذرا در بعد میں نے محض اس جانب سے توجہ ہٹانے کی نیت سے عبداللہ سے پوچھا۔

”اب تمہاری کلائی کی تکلیف کا کیا حال ہے؟“ وہ یوں اپنے خیالات سے چونکا جیسے خواب سے اچانک بیدار ہو گیا ہو۔ اب وہ اپنی کلائی پر بندھی بینڈج کو دیکھ رہا تھا پھر چند لمحوں کے بعد اس کی آواز سنائی دی۔

”اب..... اس وقت تو..... یہاں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی ہے۔“

”کیا واقعی؟“

”ہاں یاز بالکل کوئی تکلیف نہیں۔“

”ذرا پٹی تو کھولو میں بھی دیکھوں، کس نوعیت کا زخم ہے؟“

پہلے تو وہ ذرا اچکاچایا پھر جانے کیا سوچ کر اپنی کلائی میری طرف بڑھادی اور میں نے بسم اللہ کہہ کر پٹی کھولنا شروع کر دی پھر جب پوری پٹی محل گئی تو بے ساختہ عبداللہ کے منہ سے نکلا۔

”ارے..... یہ کیا؟“

اس کی کلائی بالکل بے داغ تھی نہ کوئی زخم نہ تھانہ کوئی داغ دھبہ، حد تو یہ ہے کہ دو انیاں جو لگا کر پٹی باندھی گئی تھی ان کا بھی دور دور تک کوئی نشان نہیں

تھا۔ میری بیگم سلمیٰ اور اس کی بیوی ناہید قریب آ کر اس کی صاف ستھری کلائی دیکھنے لگیں۔

”یہ تو..... یہ تو.....“ مارے حیرت کے ناہید کے منہ سے جملہ مکمل نہیں ہو رہا تھا۔

”ہاں..... ایسا ہی کمال ہمارے گھر میں ہوتا رہتا ہے۔“ سلمیٰ نے اس کی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”در اصل.....“ میں نے اپنی بیوی کی بات آگے بڑھائی۔ ”ہمارے گھر کے بھوت ایسے ہی باکمال ہیں جو ہم سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں مگر ہمارے دوست اور بھائی بھی ہیں اس لیے تو ہم ان کے ساتھ اور وہ ہمارے ساتھ نباہ کر رہے ہیں۔“

عبداللہ میری باتوں سے زیادہ اپنی کلائی کی طرف متوجہ تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اسے ہر طرح سے چھو کر دیکھ رہا تھا، بار بار ہاتھ ہٹا رہا تھا۔

”کیوں؟“ میں نے اسے ٹوکا۔ ”اندرونی طور پر بھی کسی ٹوٹ پھوٹ کا اندازہ ہو رہا ہے یا نہیں؟“

”نہیں یاز.....“ وہ بے حد بیشاش لہجے میں بولا۔ ”بالکل ٹھیک ہے ایک دم پہلے کی طرح۔“

ذرا در بعد ہم لوگ ڈرائنگ ٹیبل پر بیٹھے خوش گوار موڈ میں کھانا تناول کر رہے تھے۔ کھانا کھاتے وقت ناہید بیگم نے میری بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”بھابی..... اگلے ہفتے کی رات کا کھانا آپ لوگ ہمارے ساتھ کھائیں گی۔“ سلمیٰ نے میری طرف دیکھا۔

”اوہ! ان سے اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟“ عبداللہ بول پڑا۔ ”اس کی کیا مجال کہ انکار کرے۔“

”ارے بھئی، کیا یہ ضروری ہے کہ اگلے ہفتے ہی حساب چکلا کر دیا جائے؟“

”ابے بازار تھے دنوں کے بعد تو ہماری ملاقات ہوئی ہے اب تم کسی نہ کسی بہانے اس کی تجدید تو ہوتی رہتی چاہیے۔“

اور ہم لوگ اگلے ہفتے عبداللہ اور ناہید کے گھر پر موجود تھے۔ کچھ دیر تک تو ہم دونوں پرانی یادوں کی راکھ کریدتے رہے اس دور کے دوستوں کو یاد کرتے رہے پھر عبداللہ بولا۔

”تمہارے گھر سے واپس آنے کے بعد ہم دونوں میاں بیوی اس فکر میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ تم لوگ ایسے آسب زدہ گھر میں کیوں رہتے ہو؟ میری بیوی کو تمہاری بیوی سے ایک ہی ملاقات میں بڑی محبت ہو گئی ہے وہ کہتی ہے کہ ہمیں ان لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہیے وہ لوگ بال بچے دار ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا میں تمہارے لیے کیا کروں؟ تمہیں اس بھوت گھر سے کیسے نجات دلاؤں؟“

”شاید.....“ میں نے بڑی بے بسی کے ساتھ کہا۔ ”ہم کبھی بھی اس گھر کے بھوتوں سے نجات حاصل نہ کر سکیں.....“

”کیوں تم اس قدر مایوس کیوں ہو؟“

”جب اس گھر میں ہم شروع شروع میں نئے نئے واقعات سے دوچار ہوئے مثلاً ایک دن یوں ہوا کہ رات کے وقت ہماری مسہری کے نیچے سے کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں آئیں تو میں نے سلمیٰ بیگم سے کہا۔ ”کیا مسہری کے نیچے کوئی چوہا یا بلی تو نہیں گھس گئی ہے؟“

”مجھے کیا پتا اٹھ کر دیکھ لو۔“

میں ابھی بستر سے اٹھا بھی نہیں تھا کہ مسہری کے نیچے سے ایک چھوٹا سا بچہ نکلا اور دروازے کی طرف جانے لگا۔ دروازے کے قریب جا کر اس نے پلٹ کر جو ہماری طرف دیکھا تو ہم ششدر رہ گئے وہ ہماری چھوٹی بیٹی کے ہو بہو شکل و صورت کا بچہ تھا جبکہ

ہماری بیٹی ہمارے پہلو میں سو رہی تھی جو ابھی سال بھر کی بھی نہیں تھی اور اس کا پاؤں پاؤں چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دروازے کے پاس جا کر وہ ایک دم غائب ہو گیا۔

اس طرح ایک بار میرے بیٹے نے ہم سے شکایت کی کہ کل رات میری آنکھ کھلی تو ایک بونا میرے اوپر چھکا ہوا تھا۔ میں نے خوف زدہ ہو کر چیخنے کی کوشش کی تو اس نے اپنا گندہ اور بد بو دار ہاتھ میرے منہ پر رکھ دیا۔ وہ قد میں مجھ سے بھی چھوٹا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اپنی پوری طاقت سے اسے دھکا دینے کی کوشش کی تو وہ ایک دم غائب ہو گیا۔ میں نے اسے یہ کہہ کر اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی۔

”ارے بھئی تم نے کوئی خواب دیکھا ہوگا یہاں کوئی گندہ اور غلیظ بونا کیسے آسکتا ہے؟“ مگر مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میرے بیٹے نے کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔

ایک دن میری بڑی بیٹی ضد کرنے لگی۔ ”میں بھائی کے ساتھ کمرے میں نہیں سوؤں گی۔ مجھے بھی مٹی کی طرح اپنے پلنگ پر سلائیے۔“

”مگر کیوں؟ کیا بھائی تمہیں تنگ کرتا ہے سونے نہیں دیتا؟“

”نہیں پاپا یہ بات نہیں بھائی تو بستر پر جاتے ہی سو جاتے ہیں۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

ذرا دیر تک وہ پچھلی پتی رہی پھر بولی۔ ”رات جب بھی میری آنکھ کھلتی ہے کمرے میں کچھ عجیب و غریب قسم کے بچے میرے کھلونوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں۔“

اسے بھی میں نے جھوٹ بول کر بہلایا پھلایا کہ یہ کوئی حقیقت نہیں محض تمہارا خواب ہے۔ تم

ایسے خوابوں سے کیوں ڈرتی ہو۔ کلمہ پڑھ کر سویا کرو۔ ڈراؤنے خواب نظر نہیں آئیں گے مگر اس بات سے ہم دونوں میاں بیوی واقف تھے کہ اس گھر میں بھوت پریت موجود ہیں۔ ایک دن سلمیٰ نے مجھ سے کہا۔

”کسی مولانا یا مولوی سے مل کر جھاڑ پھونک کا کوئی بندوبست کیجیے۔“

اور اگلے دن ہی میں ایک مولوی سے کچھ اگر بتیاں اور پڑھوایا ہوا پانی لے آیا اور ان کی ہدایت کے مطابق گھر کے مختلف حصوں میں ایک ایک اگر بتی جلادی اور پانی کے چھینے مارے جس کا ری ایکشن یہ ہوا کہ ذرا دیر بعد کھانسنے اور کھنکھارنے کی آوازیں آنے لگیں پھر کرائے اور سسکیاں لینے جیسی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ آوازیں تیز سے تیز تر ہونے لگیں۔ ہم چھوٹے بڑے تمام لوگ گھبرا کر ایک دوسرے کے قریب آگئے اور سوچنے لگے یہ نئی مصیبت آن پڑی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر طرف کچھ آن دیکھے لوگ کھانسنے رہے ہیں کراہ رہے ہیں سسکیاں لے رہے ہیں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا مگر ان کی آوازیں ہماری ساعت پر گویا ہتھوڑے برسار ہی تھیں۔ جتنی دیر تک اگر بتیاں جلتی رہیں نظر نہ آنے والے لوگوں کی آوازیں آتی رہیں پھر آہستہ آہستہ اس وقت بالکل معدوم ہو گئیں جب اگر بتیوں کا دھواں

نہم ہو گیا۔

اگلے روز میں نے مولوی صاحب کو ساری باتیں بتائیں تو وہ بولے۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری اگر بتیوں اور بڑھے ہوئے پانی کے چھڑکاؤ نے اپنا اثر دکھلایا ہے۔“

”مگر مولوی صاحب اس اثر کا ہمارے اوپر

بہت برا اثر ہوا ہے۔“

”وہ تو ہوگا بھائی.....! جس طرح تم ان کے خلاف کارروائی کر رہے ہو اسی طرح وہ بھی تم لوگوں کو تنگ کریں گے۔ اگر بتیاں اور پانی اسی لیے دیا ہے کہ وہ پریشان ہوں یوں بھوت بھوتوں سے اب تمہارا مقابلہ ہے۔ تم چیت گئے تو وہ بھاگ جائیں گے۔ تم ہمت ہار گئے تو تمہیں اس گھر سے بے دخل کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”اگر ان سے مقابلہ کر سکتے ہو تو اگر بتیاں جلاتے رہو پانی چھڑکتے رہو۔ بے شک وہ اپنے دفاع کے لیے تم لوگوں کو تنگ کریں گے ورنہ ان کے آگے ہتھیار ڈال دو۔“

میں نے گھر آ کر مولوی صاحب کی باتیں دہرا دیں۔ سلمیٰ بیگم اس بات پر رضامند نہیں تھیں کہ ہم بھوتوں سے مقابلہ کریں مگر میں نے انہیں سمجھایا۔ ”اگر ہم سر پیڈر کر جائیں گے تب بھی ان کے ہاتھوں ستائے ہی جائیں گے اس لیے ایک دو دنوں تک مقابلہ کر کے دیکھ لیں میں کیا پرہیز ہے۔“

بادل ناخواستہ سلمیٰ بیگم مان گئیں اور ہم نے اگر بتیاں جلادیں اور پانی کا چھڑکاؤ کر دیا۔ ذرا دیر بعد پھر کھانسیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا پھر کرائے اور سسکیاں لے لے کر رونے کی آوازیں بھی آنے لگیں پھر گھر کی چیزیں ادھر ادھر پھینکی اور توڑی جانے لگیں پھر اچانک مٹی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس کی ماں پتھوڑے کی طرف لپکی مگر وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ سلمیٰ نے گھبرا کر کہا۔

”مٹی تو یہاں موجود نہیں ہے آخر وہ گئی کہاں؟“

”مگر اس کے رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے کمرے میں ادھر ادھر

نیچے اوپر دیکھا تو یہ دیکھ کر لرز کر رہ گیا کہ وہ کمرے کے سیلنگ فین پر بیٹھی رو رہی تھی، یوں لگ رہا تھا جیسے اسے کوئی گود میں لیے بیٹھا ہے۔“

”ہائے میری بچی.....!“ کہہ کر سلمیٰ رو پڑی۔ ”مے وہاں کون لے گیا؟“ اگرچہ یہ سوال بالکل مہمل تھا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”منی کو وہاں سے لائے نا۔“

میں نے سلمیٰ کو تو کوئی جواب نہیں دیا، پکھے کی طرف منہ کر کے بولا۔ ”میں اگر بتیاں بھجار رہا ہوں تم میری بچی کو ہمیں واپس کر دو۔“ اور کسی جواب کا انتظار کیے بغیر اگر بتیاں بھجانے لگا پھر سلمیٰ بھی اس کام میں میرا ساتھ دینے لگیں۔ جلد ہی ساری اگر بتیاں بھج گئی تھیں۔ ان کا دھواں بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ابھی ہم اس کام سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ میری بیٹی چیخی۔ ”پاپا..... امی! منی نیچے آگئی ہے۔“

ہم دونوں پنگھوڑے کی طرف بھاگے تو وہ وہاں موجود تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ننھا منسا سا خوب صورت چھنٹھا بھی موجود تھا جو ہرگز ہمارے لائے ہوئے کھلونوں میں سے نہیں تھا۔

”یعنی..... تم دونوں بھوتوں سے ہار مان گئے؟“ عبداللہ نے کہا۔

”ہاں یا زہار مانی ہی پڑی۔ بچی کا معاملہ تھا، ہم ان سے مقابلہ نہ کر سکے اور اس کے بعد سے ہم نے توبہ کر لی کہ اب انہیں ہرگز نہیں چھیڑیں گے۔“

”تو اس کے بعد سے آپ لوگوں نے بھوتوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کا فیصلہ کر لیا؟“ اس بار عبداللہ کی بیگم بولی تھی۔

”اس کے علاوہ اور ہم کیا کرتے؟“ ہماری بیگم نے جواب دیا۔

”یا زہ اس مکان پر لعنت بھیجوا سے سچ کر کوئی

دوسرا گھر خرید لو۔ گھر امن و سلامتی کی جگہ ہوتا ہے مگر تم لوگوں کو وہاں کوئی سکون نصیب نہیں ہر وقت خطرے کا دھڑکا ایسے مکان کے ہونے سے نہ ہونا بہتر۔“

”تمہاری بات بالکل درست ہے مگر ہماری مجبوری یہ ہے کہ نہ ہم اس مکان کو فروخت کر سکتے ہیں نہ کرائے پر دے سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں ہم اسے بھوتوں کے حوالے بھی تو نہیں کر سکتے۔ تم کو شاید اس بات کا اندازہ نہیں کہ ہم نے کتنی محنت اور جدوجہد کے بعد یہ مکان بنایا ہے۔“

”اس بات کا تو اندازہ ہے کہ آج کے دور میں معمولی آمدنی والے آدمی کے لیے گھر بنانا آسان کام نہیں لیکن تمہاری یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ تم اب اس مکان کو فروخت کر سکتے ہو نہ کرائے پر دے سکتے ہو؟“

”بات دراصل یہ ہے پیارے کہ جب میں نے یہ جگہ خریدی تھی تو یہ علاقہ بالکل غیر آباد تھا اور جہاں اب یہ مکان ہے وہاں جھاڑ جھکاڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب اس کے اطراف بسنے والے لوگوں کو پتا چلا کہ ہم نے یہ قطعہ اراضی خریدا ہے تو کچھ لوگ بولے۔ ”یہ آپ نے کیا غلطی کی؟ کم از کم اسے خریدنے سے پہلے ہم لوگوں سے مشورہ تو کر لیا ہوتا۔“

”کیوں؟ اس میں غلطی کی کیا بات ہے؟“ میں نے ان لوگوں سے کہا۔ ”اس کی قیمت بہ نسبت دوسری زمینوں کے بہت کم تھی اس لیے خریدی۔“

”ہمیں معلوم ہے کہ آپ نے کوڑیوں کے مول خریدی ہے کیونکہ اس زمین کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ یہ حصہ ایک عرصے سے بھوتوں کا مسکن سمجھا جاتا ہے اس لیے اس کے قریب کوئی جانا بھی نہیں چاہتا۔“ ہم نے اس وقت ان باتوں پر توجہ نہیں دی کہ ہم

دونوں میاں بیوی پڑھے لکھے ہیں اور ایسی تو ہم پرستانہ باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔“

”اور جب.....“ میں ذرا رکا تو سلمیٰ بیگم نے پریشانی سے آگے بڑھائی۔

”ہم نے بھوتوں سے تنگ آ کر اسے فروخت کرنا یا کرائے پر اٹھانا چاہا تو اس علاقے کے سارے اسٹیٹ ایجنٹوں نے صاف کہہ دیا۔“

”نہ یہ مکان بک سکتا ہے نہ کرائے پر اٹھ سکتا ہے کیونکہ اس علاقے کے تمام لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ جگہ اور یہ گھر بھوتوں کا مسکن ہے جبکہ ہم اس علاقے کے باہر کے لوگوں کو دھوکہ دے کر بھی اس کا سودا نہیں کر سکتے کیونکہ ہمیں اسی علاقے میں رہنا ہے، کاروبار کرنا ہے اس لیے ہم کوئی دھوکہ دہی کا کام نہیں کر سکتے۔“

”اوہ پھر تو واقعی تم لوگ بھوتوں کے ہاتھوں بالکل پریشان بن کر رہ گئے ہو۔“

عبداللہ کے گھر پر خاصا وقت گزار کر جب ہم میاں بیوی لوٹنے لگے تو سلمیٰ بیگم نے عبداللہ بیگم کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ ”دیکھیے اب آپ لوگوں کی باری ہے، کسی دن وقت نکال کر آئیے۔“

”آخر آنے جانے ہی سے توجہ بڑھتی ہے۔“

ناہید جھٹ بول پڑی۔ ”بھائی، برا مت مانجے گا، جہاں تک آپ کے گھر دوبارہ آنے کی بات ہے تو میں اس کا بالکل حوصلہ نہیں کہ آپ کے بھوت بھائیوں اور بھوت بہنوں سے رشتے داری قائم کر لیں۔ ہمارا پہلا ہی تجربہ خاصا ہیچ ہوا ہے۔“

”تو اب آپ لوگ یہاں آ جایا کریں۔“

یہاں آتے وقت ہم بچوں کو ان کی نانی کے گھر بھجوا آئے تھے۔ میرے بیٹے جو ادے اپنی نانی کے گھر پر ہی ایک تصویر دکھائی۔ ”ارے یہ تصویر کلاس سے پاس کہاں سے آئی؟“

”میں نے کھینچی تھی جس وقت آپ لوگ منی کے لیے حواس باختہ تھے میں بھاگ کر کیرہ لے آیا تھا کہ ایسا منظر بار بار نظر نہیں آئے گا اور میں نے جلدی سے تصویر کھینچ لی تھی۔“

یہ تصویر منی کی تھی، سیلنگ فین پر بیٹھی ہوئی منی کی۔ واقعی یہ ایک نایاب تصویر تھی۔ ایک ننھی منی بچی جو اپنے بل بوتے پر ابھی بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی، پکھے کے اوپر پیر لڑکائے بیٹھی تھی۔ میں نے اس تصویر کو ذرا روشنی میں لے جا کر غور سے دیکھا تو اس بات کا پتا چل رہا تھا کہ کوئی اسے گود میں لیے بیٹھا ہے مگر اس کا عکس واضح نہیں تھا، دھندلا دھندلا سا کوئی پیکر تھا۔ وہاں تو یہ بات میں نے کسی اور کو نہیں بتائی مگر گھر آ کر سلمیٰ سے کہا۔

”اس تصویر کو غور سے تو دیکھو۔“

اس نے کچھ نہ کہتے ہوئے پہلے سوالیہ نگاہوں سے مجھے دیکھا پھر تصویر دیکھنے لگی۔ اس کے بعد اچانک بول پڑی۔ ”ارے.....!“

”کیوں کہا ہوا؟“

”منی کو تو کوئی گود میں لیے بیٹھا ہے۔“

”ہاں یہی دکھانے کے لیے تو میں نے تمہیں اسے غور سے دیکھنے کو کہا تھا۔ کیرہ لے کی آنکھ چونکہ بہت حساس ہوتی ہے اس لیے جو چیزیں ہماری آنکھیں بھی نہیں دیکھ سکتیں، اسے نظر آ جاتی ہیں۔“

”مگر یہ ہے کون؟ اس کی شبیہ تو واضح نہیں؟“

”منی کا کوئی ماموں یا خالہ کے سوا کون ہو سکتا ہے؟“

”اچھا، سلمیٰ مسکرائی۔ ”آپ بھی ناہید سلطانہ کی طرح بھوتوں کو میرا بھائی بہن سمجھتے لگے ہیں؟“

ایک دن سلمیٰ نے مجھ سے ایک عجیب بات کہی۔ ”اس گھر کے بھوت میرے بھائی بہن ہوں یا نہ ہوں مگر منی کے دوست ضرور بن گئے ہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”یہ تو آپ جانتے ہیں کہ میں اسے پگھوڑے میں ڈال کر اپنے کام کاج میں مشغول ہو جاتی ہوں۔“

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“

”ادھر جب سے وہ بڑی ہو رہی ہے مجھے ہر وقت خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش میں پگھوڑے سے گرنے جائے اس کے لیے ذرا ذرا دیر کے بعد میں آ کر اسے دیکھتی ہوں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے اس کے ہسنے کی آواز سنائی دی۔“

”ہاں اسے گدگدی بہت ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں جب اسے گدگداتا ہوں تو وہ خوب ہنستی ہے۔“

”میں یہی محسوس کرتی ہوں کہ منی کے پاس کوئی ہے جو اسے گدگداتا ہے اس کے ساتھ کھیلتا ہے اور پھر.....“ اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی تھی۔ جب وہ ذرا دیر کے بعد بھی کچھ نہیں بولی تو میں نے اسے ٹوکا۔

”تم کچھ کہتے کہتے رک گئیں؟“

”میں یوں رک گئی کہ کہیں وہ میرا واہمہ تو نہیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ کبھی کبھی میں اچانک منی کے پاس چلی جاتی ہوں تو اس کے پاس ایک دو نئے کھلونے موجود ہوتے ہیں مگر اگلی بار وہ کھلونے غائب ہوتے ہیں۔“

”نہیں تمہارا واہمہ نہیں ہے منی کے بھوت ماموں یا بھتی خالہ جب اس کے پاس ہوتے ہیں تو اس کے ساتھ کوئی نیا کھلونا ہوتا ہے۔“

اور ایک دن اس بات کا ثبوت بھی مل گیا ہوا یوں کہ محلے میں کچھ دور دیکھا کہ سا ہوا اور پھر آگ کے شعلے لپکنے لگے۔ لوگ اس طرف بھاگے تو

میرے دونوں بچے جو ادھر ادھر بھی یہ دیکھنے کے لیے کہ کیا ہو گیا ہے اس طرف بھاگے۔ بچی عمر کے لڑکیوں اور لڑکوں میں بحس کا مادہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے اپنے بچوں کو اس طرف بھاگتے ہوئے سلٹی نے دیکھا تو انہیں آواز دے کر روکنے کی کوشش کی مگر جب انہوں نے پلٹ کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تو وہ بھی دیوانوں کی طرح ان کے پیچھے بھاگا اور پھر انہیں بھیڑ بھاڑ سے ڈھونڈ کر گھر لائی۔ گھر پہنچی تو منی کے بے تحاشہ رونے کی آواز سنائی دی۔ دھماکے کی آواز سے پہلے منی پگھوڑے میں بے خبر سو رہی تھی شاید دھماکے کی آواز یا کسی اور وجہ سے وہ پگھوڑے سے گر گئی تھی جس کے بعد غالباً خوف زدہ ہو کر وہ رونے لگی تھی۔ سلٹی بچوں کو لے کر گھر میں داخل ہوئی تو یہ دیکھ کر حیران پریشان ہو گئی کہ منی جیسے ہوا میں تیز رہی ہو۔ لگتا تو ایسا ہی تھا کہ اسے گود میں لیے کوئی چپ کرانے کی نیت سے ادھر ادھر گھوم رہا ہو مگر اسے گود میں لینے والا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ سلٹی کے واپس آنے کے بعد منی کو کسی نے پگھوڑے پر لٹا دیا تھا۔

.....

آج ہم لوگ عبداللہ کے گھر میں پھر مدعو تھے۔ آج ہمارے ساتھ ہمارے بچے بھی تھے۔ ذرا دیر بعد عبداللہ نے کہا۔ ”جب تک دونوں بیگمات غمغموں غمغموں کرتی ہیں ہم دونوں ذرا باہر کا چکر کیوں لگا لیں؟ دراصل مجھے ایک ضروری کام ہے۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے آپ لوگ جائیے۔“ بیگم عبداللہ نے خوش دلی سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد عبداللہ ایک گھر میں موجود تھا۔ ایک صاحب جب اس کے پاس آئے تو عبداللہ نے ان سے گویا میرا تعارف کرایا۔ ”حضرت یہ میرے وہی دوست ہیں جن کے بارے میں میں نے آپ

کو تفصیل بتائی تھی۔“

میں چونکا۔ تو یہ عبداللہ کا بچہ مجھے بھوتوں سے نجات دلانے کے لیے چپکے چپکے خود ہی کارروائیاں کرتا پھر رہا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

”مخلص دوست ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ صاحب خانہ کے منہ سے یہ جملہ سن کر میں ایک بار پھر چونکا تھا۔ گویا انہوں نے میرے دل کی آواز سن لی تھی۔ اب وہ کہہ رہے تھے۔ ”ان کا فکر مند ہونا فطری بات ہے۔ ٹھیک ہے آپ ان بھوتوں کو اب چھینڑنا نہیں چاہتے مگر ان کے ساتھ مستقل رہائش بھی تو کوئی اچھی بات نہیں۔ آپ کے ساتھ بچے بھی ہیں جبکہ بدروحوں کے موذ مزاج کا کچھ پتا نہیں ہوتا کسی وقت بھی وہ شیطان بن سکتے ہیں۔ ان کے کہنے پر میں نے آپ کے گھر کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کی ہیں۔ آپ کے گھر میں ایک دو نہیں سات آٹھ بھوت موجود ہیں جن میں ایک بوڑھی عورت، ایک جوان عورت، مرد کا جوڑا اور چند بچوں کی روحیں یا بھوت موجود ہیں۔“

یہاں تک کہہ کر موصوف ذرا رکے پھر گویا ہوئے۔ ”جہاں اس وقت آپ کا یہ گھر موجود ہے ایک طویل عرصے تک یہاں ایک جنگل سا تھا۔ تحقیق سے پتا چلا ہے کہ جب یہ حصہ جنگل نہیں تھا یہاں ایک بوڑھی خاتون رہتی تھی جسے آخری عمر میں جادوئی طاقتیں کا خبط سوار ہوا اور اس چکر میں اس نے اپنے کوئی پانچ نواسے نواسیوں کو ایک ایک کر کے مار ڈالا یوں جیسے اپنے شیطانی دیوتا کو خوش کرنے کے لیے اس پر ان بچوں کو قربان کر دیا۔ جب اس کی بیٹی اور اس کے داماد کو معلوم ہوا کہ اس کے جو بیٹے غائب ہو گئے ہیں ان کا اغوا کنندہ کوئی اور نہیں اس کی ماں ہے جس نے اپنے شیطانی ارادے کے تحت انہیں مار دیا ہے تو دونوں میاں بیوی نے اس خبیث بڑھیا کو

قتل کر دیا مگر اس جادوگر نے مرنے کے بعد بھی بیٹی داماد کو معاف نہیں کیا اور بدروح کی صورت میں دونوں کی موت کا سبب بنی۔

پورے خاندان کی تباہی اور خاتمے کے بعد ان کا گھر بہت دنوں تک بدروحوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ کچھ لوگوں نے اس میں داخل ہونے اور رہنے کی کوشش کی تو انہیں نقصان پہنچا پھر یہ گھر ویران پڑے پڑے ہی کھنڈر کی صورت اختیار کر گیا پھر یہاں جنگل جھاڑ اگ آئے۔ وہاں سے بھی اکثر راتوں کو رونے اور سسکیاں لینے کی آوازیں آتی تھیں۔ وقت گزرتا رہا اس جھاڑی کے ارد گرد تو آبادی ہو گئی مگر اس مخصوص جگہ کے قریب بھی کوئی جانے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ جس اسٹیٹ ایجنٹ نے آپ کے ہاتھوں وہ زمین بیچی تھی آپ کو شاید علم نہیں کہ وہ آپ کو اس مصیبت میں مبتلا کرنے کے بعد وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ آپ نے بڑی ہمت کی کہ اس جگہ کو صاف کر لیا اور مکان تعمیر کیا۔ ”ذرا دیر تک رک کر موصوف نے دم لیا پھر بولے۔“ آپ لوگ اس مکان میں محض اس وجہ سے رہائش پذیر ہو گئے کہ آپ کے ساتھ بچے تھے جس میاں بیوی کے بچوں کو خبیث بڑھیا نے قتل کر دیا تھا وہ آپ کے بچوں کو دیکھ کر اپنی ممتا کو تسکین دیتے ہیں۔ وہ تو ایک طرح سے آپ لوگوں کے دوست بن گئے ہیں مگر خطرہ اس جادوگر نے بڑھیا کی بدروح سے ہے وہ کسی وقت بھی آپ لوگوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا سکتی ہے۔“

وہ اب ٹی بار رکنے کو عبداللہ بول پڑا۔ ”اب بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

کوئی جواب دینے کی بجائے میں سوچنے لگا کہ یہ بزرگوار اس مولوی کی طرح اناڑی نہیں معلوم ہوتے جنہوں نے اگر تیاں اور پڑھا ہوا پانی دیا تھا۔

”ہاں بھائی.....! تمام لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے پھر بھی اگر آپ کا دل نہ مانے تو نہ میں زبردستی کروں گا نہ ہی برخوردار عبداللہ آپ کو مجبور کریں گے۔“

مجھے ان حضرات کے علم اور دانش کا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ یہ عام جھاڑ پھونک کرنے والے بندے نہیں ہیں، کوئی پہنچی ہوئی شخصیت ہیں لہذا میں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے ان بھوتوں کے ساتھ رہنے کا کوئی شوق نہیں، بس اس بات سے ڈرتا ہوں کہ ان کے خلاف کوئی تدبیر کرنے سے وہ پھر مشتعل نہ ہو جائیں۔“

”نہیں بھائی، ایسی کوئی بات نہیں ہوگی، بس آپ لوگوں کو چند دنوں کے لیے کہیں اور قیام کرنا پڑے گا۔ اس دوران جو کارروائی کی جائے گی، اول تو اس کا ان کی طرف سے کوئی ری ایکشن نہیں ہوگا اور اگر ہوگا بھی تو اس کا نشانہ نہیں بنو گے۔“

عبداللہ کے گھر واپس آ کر میں نے ساری باتیں بتائیں تو سلمیٰ نے کہا۔ ”دیکھیے، اچھی طرح سوچ سمجھ لیجیے پھر کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

”ارے نہیں بھائی! یہ کوئی اناڑی مولانا مولوی نہیں، آپ کے میاں کو کچھ اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ کوئی نیچے ہوئے بزرگ ہیں۔“

”مگر یہ جوانوں نے چند روز کہیں اور رہنے کو کہا ہے تو ہم جائیں گے کہاں؟“

”ارے بھائی! یہ بھی کوئی پرائیلم ہے، یہیں رہیں گے آپ لوگ۔“

”یا پھر.....“ میں نے کہا۔ ”تمہاری والدہ کے گھر۔“

”نہیں۔“ سلمیٰ نے کچھ سوچ کر کہا۔ ”اماں کے گھر نہیں، ہم یہیں رہیں گے۔“

اور پھر ایسا ہی ہوا، اگلے بدھ کو پروگرام کے مطابق ہم میاں بیوی اپنے بچوں سمیت عبداللہ کے گھر آ گئے اور جمعرات کے دن سے بزرگوار نے ہمارے گھر پر اپنا عمل شروع کر دیا اور پھر پیر کے دن انہوں نے ہم سے کہا۔ ”لو بھئی، تمہارا گھر اب ہر طرح کے بھوت پریت سے پاک ہو گیا ہے۔ جاؤ، اب بال بچوں کے ساتھ بے کھلے وہاں رہو۔“

میں نے پہلے تو بزرگوار کا شکر یہ ادا کیا پھر کہا۔ ”اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو کیا یہ بتانا پسند کریں گے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟“

”نہیں۔“ وہ مسکرائے۔ ”اس میں ناگواری کی کیا بات ہے مگر آپ لوگوں کو صرف اتنا ہی بتایا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے اس جادوگر نے بڑھیا کی بدروح کو قابو کرنا پڑا اور اس کے جادو کو بے اثر کرنا پڑا۔ اس کے بعد ان بدروحوں یا بھوتوں کو کوئی تکلیف دیئے یا گزند پہنچانے بغیر اللہ تعالیٰ کے کلام کی مدد سے ان بے قرار اور بھکتی ہوئی روحوں کو قرار پہنچانے کی دعائیں اور تدبیر کی لگیں اور پھر اس رحیم و کریم ذات نے ان کی بے قراری کو قرار بخشا اور وہاں سے آپ کے گھر سے، انہیں بلا کر ان کی آخری آرام گاہ تک پہنچا دیا گیا۔“

یہاں تک کہہ کر وہ رے پھر بولے۔ ”اب آپ لوگوں کو یہ کرنا ہے کہ چالیس روز تک آپ دونوں میاں بیوی جتنا بھی اللہ تعالیٰ کا کلام پڑھ کر ان روحوں کی بخشش کی دعا کر سکتے ہیں، کریں تاکہ اب وہ جہاں بھی ہیں زیادہ سے زیادہ سکون اور اطمینان کے ساتھ رہیں۔“

☆☆☆☆

عقل کو گند کر دینے والی ایسی کہانیاں جن پر دل اور ذہن یقین نہیں کرتا



نوشاد علی

بندل شاہ

سائیں بندل شاہ بابا سے اگر کوئی مایہ پریشانی کا تذکرہ کرتا تو

وہ ایک سادہ کاغذ پر چیک کی طرح رقم لکھ کر دیتے تھے، اور خدا کی قدرت دیکھیے،

اس شخص کو اتنی ہی رقم کہیں نہ کہیں سے ضرور مل جاتی تھی ایک روز.....

موسیٰ قاری اعظم نوشاد کے قلم سے نکلا ماضی کا ایک کرا راج



میرق ایک بزرگ سے ملاقات تھی فقیری لینے سے قبل یہ بزرگ مدراس سیشن عدالت کے جج تھے۔ بمبئی کے لوگ انہیں سائیں بنڈل شاہ بابا کہتے تھے۔ انگریزی زبان کے ماہر تھے۔ یہاں تک کہ عربی کی کوئی آیت بھی لکھتے تو رومن حروف میں۔ زبردست روشن ضمیر تھے۔ مجذوبی کیفیت میں رہتے تھے۔ بابا کے پاس کوئی مریض آتا تو وہ ہمیشہ اُسے سنگتر اکلانے کی تلقین کرتے۔ ایک دن اُن کے ایک مرید سے میں نے اس کی وجہ پوچھی۔ جواب ملا۔ ”بابا کا اشارہ ہوتا ہے کہ ناگپور میں بابا تاج الدین کے دربار میں حاضری دو۔“ وہ بابا تاج الدین ناگپوری کے مرید تھے۔

سائیں بنڈل شاہ بابا سے اگر کوئی شخص مالی پریشانی کا تذکرہ کرتا تو وہ ایک سادہ کاغذ پر چیک کی طرح رقم لکھ کر دیتے تھے اور خدا کی قدرت دیکھیے اُس شخص کو اتنی ہی رقم کہیں نہ کہیں سے ضرور مل جاتی۔ ایک روز میں بابا کو میاں کاردار سے ملانے کے لیے لے گیا۔ کاردار اُن دنوں فلم دل لگی کی ایڈیٹنگ میں مصروف تھے۔ بابا کو میں تے کچھ نہیں بتایا تھا کہ میں انہیں کہاں لے جا رہا ہوں۔ جب وہ کاردار اسٹوڈیو کے ایڈیٹنگ روم میں داخل ہوئے تو مجھ سے پوچھا۔ ”یہاں کیا کام ہوتا ہے؟“ میں نے جواب دیا۔ ”بابا! یہاں فوٹو کھینچے جاتے ہیں۔“ بابا بھند ہو گئے کہ میرا فوٹو بھی کھینچو۔ ممبئی کے فوٹو گرافر کو بلا کر اُن کی تصویر بنوائی گئی۔ اب بابا کی یہ ضد کہ میرا فوٹو بھی دکھاؤ۔ بابا کو بہت سمجھایا کہ تصویر بننے میں وقت لگے گا مگر اُن کی ضد باحکم دیکھتے ہوئے فوراً تصویر بنوا کر انہیں پیش کی گئی۔ بابا نے اپنا فوٹو دیکھا تو بہت خوش ہوئے کہنے لگے۔ ”اُن کو کچھ دینا چاہیے۔“

اُن کے مرید نے کہا۔ ”بابا! اُن کو چیک دے دیجیے۔“ میں نے کاردار کی طرف اشارہ کر کے اُن سے کہا۔ ”بابا! فوٹو کی یہ دکان اُن کی ہے۔“ کاردار اُن چیزوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ میں نے اُن سے کہا۔ ”بابا! آپ کو جو کچھ بھی دیں اُسے احترام کے ساتھ قبول کر بیٹھے گا۔“ بابا نے کانڈ منگوایا اور لکھا۔ PAY HIM RUPEES 25 LAKHS (انہیں 25 لاکھ روپے دے دیے جائیں)

اور اس کے نیچے اپنے دستخط کر دیے۔ میاں کاردار نے یہ چیک قبول کر لیا۔ میں نے اُن سے کہا۔ ”اسے احتیاط سے رکھیے گا۔ آج تک بابا نے جسے بھی ایسا چیک دیا وہ کیش ضرور ہوا۔“ کاردار نے میرے اصرار پر وہ چیک اپنے پاس رکھ تو لیا مگر یہ بھی کہا۔ ”نوشاد صاحب! اس بوڑھے نے ایک کانڈ کا ٹکڑا تمہا دیا ہے آپ بھی کیا مذاق کرتے ہیں۔“ فلم دل لگی بہت ہی کم لاگت میں بنی تھی۔ ریلیز ہوئی تو سپر ہٹ ثابت ہوئی اور کاردار میاں پر دولت کی بارش ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے دلاری بنائی۔ یہ بھی چھوٹے بجٹ سے بنائی گئی تھی مگر سپر ہٹ ہوئی۔ دلاری کے بعد کاردار نے ’دزد بنائی۔ تینوں فلمیں سلور جوہلی ثابت ہوئیں۔ میں نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میاں کاردار کے آفس میں ایک تجوری تھی اور میاں کاردار اُس تجوری میں پیروں سے روپے ٹھونکتے تھے۔ کیوں کہ ہاتھوں کی طاقت سے یہ کام نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن میاں کاردار نے مجھ سے کہا۔ ”واقعی نوشاد صاحب بابا نے مجھے جو چیک دیا تھا۔ وہ

کیش ہو گیا۔“ پھر انہوں نے مجھے اپنا ایک خواب سنایا کہ ”بابا اسٹوڈیو میں شوٹنگ دیکھنے آئے ہیں اور کرسی پر بیٹھے شوٹنگ دیکھ رہے ہیں۔ اتنی دیر میں یونٹ کے لوگوں نے شور مچایا کہ بابا مر گئے۔ میں نے چیخے مڑ کر دیکھا تو بابا کرسی پر لڑھک گئے تھے۔“ یہ خواب بیان کرنے کے بعد کاردار میاں نے مجھ سے کہا۔ ”بابا! خیر خبر معلوم کیجیے کہ کہاں ہیں۔ مجھے تو اُن کو نذر پیش کرنا ہے۔“ بابا ناگپاڑے میں رہتے تھے وہاں جا کر معلوم ہوا کہ بابا کا اسی رات انتقال ہوا جس رات میاں کاردار نے انہیں خواب میں دیکھا تھا۔ بابا کا مزار چھوٹا سونا پور قبرستان بمبئی میں ہے۔

اس واقعے سے بہت پہلے ایک ایسا ہی چیک بابا نے ایس یوسی کو بھی دیا تھا اور انہیں ایک سائیں بورڈ بھی بنا کر دیا تھا جس پر یونی آرمی اور کمانڈر جیسے الفاظ بابا نے لکھے تھے۔ سنی صاحب اور میں سمجھ نہیں پائے کہ سائیں بورڈ پر جو کچھ لکھا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔ بابا کے ایک مرید نے اس کی تشریح کی کہ آپ آزادانہ طور پر کوئی کام کریں گے اور اس کام میں آپ کی پوزیشن ایک کمانڈر کی ہوگی۔ اس کے بعد ایس یوسی نے اپنا ادارہ قائم کیا۔ پروڈیوسر بنے اور اُن کی بنائی ہوئی پہلی فلم ”باہل“ نے کامیابی کے ریکارڈ قائم کیے۔ جس وقت بابا نے ایس یوسی کو چیک لکھ کر دیا تھا تو سنی صاحب نے پوچھا تھا کہ چیک میں لکھی ہوئی اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے گی؟ خدا کی قدرت کہ کچھ دن بعد ایک گجراتی فنانسر خود سنی صاحب کے پاس آیا اور اتنی ہی رقم لے کر آیا جسٹی رقم کا چیک بابا نے ایس یوسی کو دیا تھا۔

ایک دن میں بابا کی ہدایت اور حکم کے مطابق اُن کے ساتھ ٹیکسی میں چو پائی جا رہا تھا۔ چو پائی نیچے

تو بابا نے ٹیکسی ڈرائیور سے کسی اور جگہ چلنے کے لیے کہا۔ وہاں پہنچے تو دوسری جگہ جانے کو کہا۔ اس طرح صبح سے شام ہوئی۔ آخر میں ناگپاڑے آئے۔ ٹیکسی میں پیٹرول بالکل ختم ہو گیا تھا۔ بابا سے کہا گیا۔ ”حضرت! گھر آ گیا۔ اتریے۔“ بابا نے کہا۔ ”میں نہیں اُترتا ابھی تو مجھے اندھیری جانا ہے۔“

اندھیری میں ایک ضعیف خاتون رہتی تھیں۔ بابا اکثر اُن سے ملنے جاتے تھے۔ ٹیکسی ڈرائیور صبح سے شام تک بابا کو اور نہیں گھماتا رہا تھا۔ اب وہ بھی جھنجھلا چکا تھا۔ ٹیکسی بالکل خالی تھی۔ ”آپ ٹیکسی میں خود دیکھ لیجیے۔ نہیں معلوم اب میں واپس بھی کس طرح جاؤں گا۔ پیٹرول پمپ بھی یہاں سے دور ہے۔ ٹیکسی روک کے پہلے مجھے ڈبے میں پیٹرول لانا ہو گا یا کسی ٹیکسی ڈرائیور کی منت کرنی ہوگی۔“ ڈرائیور ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں بھی دیکھ رہا تھا۔ میٹر میں سوئی اب زیرو سے بھی نیچے آچکی تھی۔ آخر کبھی تو پیٹرول ختم ہو جاتا تھا۔ ٹیکسی کا پیٹرول پمپ تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ میں نے بھی بابا سے کہا کہ ٹیکسی سے اتر آئیں۔ دوسری ٹیکسی سے اندھیری جائیں گے۔ کہنے لگے۔ ”پیٹرول بن جائے گا۔ گاڑی چلے گی۔ گاڑی چلے گی۔“ اس ٹکڑا کے بعد بابا نے اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ ”لو پیٹرول بن گیا۔ ڈرائیور سے کہو گاڑی چلائے۔“ میں نے ٹیکسی والے سے کہا۔ ”بھائی! تم گاڑی اسٹارٹ کرو۔ اگر نہیں چلے گی تو بابا کو اتار لیں گے اور قریب میں کوئی پمپ نظر آیا تو پیٹرول بھر والیں گے۔“

ڈرائیور نے میری طرف تہر آلود نظروں سے دیکھا کہ یہ کیا بے وقوفی کی بات کر رہا ہے۔ پھر غصے میں آ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی فوراً چل دی۔ اُس نے کہا۔ ”پیٹرول کے دو چار قطرے ہوں گے

اس سے اسٹارٹ ہوئی ہے۔ اندھیری یہاں سے میں میل دور ہے۔ پیٹرول کے بغیر کہاں جائے گی؟“ میں نے اس سے کہا۔ ”تم چلائے جاؤ۔ گاڑی جہاں رکے گی ہم وہیں اتر جائیں گے۔“ ٹیکسی چلی، اندھیری بچینی، باباجن بی سے ملنے گئے۔ واپس ناگپاڑے آئے۔ ٹیکسی باقاعدگی سے چل رہی تھی۔ ٹیکسی والا جب ناگپاڑے واپس آیا تو بابا کے قدموں میں گر گیا اور معافی مانگنے لگا۔ بار بار یہی کہتا۔ ”بابا! میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ مجھے معاف کر دو۔“ بعد میں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”بابا میں سیٹھ کا دس ہزار کا مقروض ہوں۔“ بابا نے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہا ہے؟“ ہم نے بتایا کہ اپنی پریشانی بیان کر رہا ہے۔ دس ہزار کا مقروض ہے۔ بابا نے یہ بات سنی تو اس سے کہا۔ ”کاغذ لا، کاغذ لا۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے سڑک پر بڑا ہوا کاغذ کا ٹکڑا اٹھا کر بابا کو دیا۔ بابا نے اس پر انگریزی میں لکھا۔ ”دس ہزار روپے حامل رقعہ کو ادا کر دیے جائیں۔“ ٹیکسی ڈرائیور غیر مسلم تھا۔ اس نے عقیدت کے ساتھ چیک لیا اور چلا گیا۔

دوسرے دن وہ مٹھائی پھول اور ناریل وغیرہ لے کر بابا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے بتایا کہ اُسے دس ہزار روپے مل گئے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ”اُسے دس ہزار کہاں سے ملے؟“ اس نے جواب دیا۔ ”سٹہ لگا تھا۔ پورے دس ہزار روپے ملے۔ زندگی میں کبھی اتنا پیسہ نہیں ملا تھا۔ حالانکہ میں ہمیشہ سے سٹہ کھیلتا ہوں۔“

بابا سے اپنی پہلی ملاقات کا حال بھی بیان کرتا چلوں۔ ایک صاحب دہلی کے رہنے والے تھے۔ وہ بابا کے ساتھ رہتے تھے۔ ایک روز میرے پاس وہ دادر کے مکان میں آئے۔ اُن کا بیوی کے ساتھ

معمولی سا جھگڑا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ بتائیے کیا کروں۔ میں نے کہا۔ ”تمہیں اپنے بابا کے پاس جانا چاہیے۔ وہ بتائیں گے کہ تم کیا کرو۔“ وہ صاحب بابا کے پاس پہنچے۔ مریدوں نے اُن سے کہا کہ یہ بابا کی عبادت کا وقت ہے۔ اس وقت وہ آپ سے نہیں ملیں گے۔ یہ بعد ہوئے اور رونے پینے لگے تو مریدوں نے انہیں بابا کی پشت کی طرف بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ وہ خاموشی سے بابا کے پیچھے جا کر بیٹھ گئے۔ بابا کی عبادت کا طریقہ بھی بڑا نرا تھا۔ وہ رسی کا بہت بڑا بندل بناتا تھے اُسے کھولتے تھے اور لپیٹتے تھے۔ اسی لیے لوگ انہیں بندل شاہ بابا کہنے لگے تھے۔ ایک طرح یہ بابا کی سبج تھی۔

کچھ دیر بعد اپنے پیچھے دیکھے بغیر بابا نے بولنا شروع کیا۔ ”اُس کی ماں طوائف اُس کی نانی طوائف، وہ تیری کب رہ سکتی ہے۔ طلاق دے دے۔ طلاق دے دے۔“ وہ صاحب اپنی بیوی کو طلاق نہیں دینا چاہتے تھے۔ بابا کی زبان سے طلاق کا لفظ سنا تھا بھگے بھاگے میرے پاس آئے۔ کہنے لگے۔ ”غضب ہو گیا۔ میرے سوا یہ راز کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میری بیوی طوائف خاندان سے ہے مگر بابا نے تو اس کا پورا شہرہ بنا دیا۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے مگر بابا اُسے طلاق دینے کی بات کرتے ہیں اور میں طلاق نہیں دینا چاہتا۔“

دوسرے روز وہ عورت اپنے خاندان کو چھوڑ کر چلی گئی۔ میں نے اُن صاحب کا یہ واقعہ سنا تو سوچتا رہا کہ میں بابا سے آج تک کیوں نہیں ملا۔ مجھے بزرگوں سے ملنے کا بچپن سے شوق تھا۔ رات کو نو بجے میں نے ملے کیا کہ صبح بابا سے ملنے ضرور جاؤں گا۔ صبح میں کاردار اسٹوڈیو گیا تاکہ اپنے اسٹنٹ

غلام محمد کو بتا دوں کہ تم گلوکاروں کو ریہرسل کراتے رہنا، میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔ پھر میں جیسے ہی میوزک روم میں داخل ہوا میں نے دیکھا کہ ایک بزرگ میری کرسی پر تشریف فرما ہیں۔ اُن کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے۔ اُن صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ”آپ کا نام نو شاد ہے؟“ میں نے کہا۔ ”جی ہاں“ وہ صاحب کہنے لگے۔ ”رات نو بجے مجھ سے بابا نے کہا کہ پریل میں ایک میوزک والا رہتا ہے۔ صبح اُس سے ملنا ہے۔ رات سے یہی ضدھی۔ لہذا بابا آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔“ میں نے بابا کو سلام کیا۔ میرے سلام کے جواب میں بابا نے ہنسا شروع کر دیا۔ جو صاحب بابا کے ساتھ آئے تھے وہ اُن کے خاص مرید تھے۔ انہوں نے بابا سے کہا۔ ”بابا آپ جن نو شاد سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ یہ ہیں۔“ بابا نے کہا۔ ”گئی ہے، گئی ہے۔“ بابا نے گئی ہے گئی ہے کی اتنی تکرار کی کہ اُن کے مرید نے کہا۔ ”اگر اچھا لڑکا ہے تو کچھ دیجیے۔“ بابا نے کاغذ منگوا لیا اور اس پر لکھا۔

PAY HIM RUPEES 25 LAKHS (اُسے 25 لاکھ روپے ادا کر دیے جائیں) اُس وقت تک میں بابا کے کشف و کرامات سے واقف نہیں تھا۔ اُن کے مرید نے کہا۔ ”آپ بہت خوش قسمت ہیں۔ بابا نے آپ کو اتنی بڑی رقم کا چیک دیا ہے۔“ میں نے بابا کا دیا ہوا چیک لیا اور اُسے دیکھنے لگا۔ بابا مجھے بخور دیکھتے رہے میں نے چیک بابا کو واپس کر دیا اور کہا۔ ”بابا یہ مجھے نہیں چاہیے آپ سے کچھ لوں گا تو اس سے بڑی چیز لوں گا۔ مجھے یہاں سے 500 روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ اُس سے ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔ آپ مجھے اتنی بڑی رقم دے کر دنیا کی زنجیروں میں اور الجھانا

چاہتے ہیں۔“ بابا نے اپنے مرید سے کہا۔ ”اس سے پوچھو کیا چاہتا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”مجھے دعا دیجیے کہ میں نیک رہوں نیک بنوں۔“ بابا نے میری بات غور سے سنی میری بیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا اور پھر مجھے سینے سے لگا لیا اور کہا۔ ”تو پہلا آدمی ہے جو پیسہ نہیں مانگتا۔ یہاں تو جو ملتا ہے پیسہ مانگتا ہے۔ تو صرف دعا چاہتا ہے۔“ بابا نے بعد میں اُس چیک کی پشت پر ایک دعا لکھ کر دی اور کہا کہ ”اسے بعد نماز عشا پڑھا کرو۔“

بابا نے آج سے 42، 43 سال پہلے جو دعا لکھ کر دی تھی۔ وہ میں آج تک باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ دعا یہ چیک ملنے کے دوسرے تیسرے دن سے لوگ گھر آنے لگے۔ نئی نئی آفرز آنے لگیں۔ اس دوران مجھے جن لوگوں کی فلموں کی پیش کش ہوئی۔ اُن میں وی شانٹا رام، من موہن ڈیاسی کے والد نانو بھائی ڈیاسی، جے بی ایچ واڈیا، وی ایم ویاس اور موہن اسٹوڈیوز کے مالک کی فلمیں تھیں مگر میرا قاعدہ تھا کہ میں ایک وقت میں ایک یا زیادہ سے زیادہ فلموں کی موسیقی ترتیب دیتا تھا۔ لہذا میں نے اپنے وقت کے اتنے بڑے بڑے اداروں اور فلم میکرز کی فلمیں سائن نہیں کیں۔ انہی دنوں فلستان کے مالک جلالن صاحب رات کے وقت میرے گھر تشریف لائے اور انہوں نے مجھے میں پچیس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ پر فلستان میں کام کرنے کی آفر دی۔ بابا کے چیک دینے کے سال ڈیڑھ سال بعد جب میں نے حساب لگایا تو آپ کو حیرت ہوگی۔ اگر میں یہ تمام فلمیں سائن کر لیتا تو مجھے وہی معاوضہ ملتا جو بابا نے چیک میں لکھا تھا۔

☆☆☆

محمد اقبال زمان

موت کا کھیل

سعدیہ حریم کا خیال

یوں تو ”دکھ“ لفظ ہے چھوٹا سا مگر پھر بھی حریم
جب اٹھانا ہو تو ایک بار گراں ہوتا ہے

زندگی کی بازی ہارتے شہر لہورنگ کراچی کی ایک اور کہانی



ایسا لگتا ہے جیسے میرے اس کراچی عروس
الہداد (کبھی ہوا کرتا تھا) سے زندگی روٹھ گئی ہے۔
ہر طرف موت کا شور اور زور ہے۔ پہلے ٹی وی نیوز
چینلوں پر بریکنگ نیوز کی صورت اور پھر اخبارات
میں سرخیوں کی صورت مرنے مارنے اور مارے
جانے کی خبریں ہیں کہ مرنے کا نام ہی نہیں
لیتیں۔

کراچی کا المیہ

پھول کھل رہے ہوں یازدرد موسم ہو
دھوپ ہو کہ چھاؤں ہو
خواہ کوئی موسم ہو

ان کے شہر میں لیکن ایک سا ہی منظر ہے
بارشیں عداوت کی آندھیاں عقائد کی
مختلف زبانوں کی دھوپ سی چمکتی ہے

گولیوں کا موسم ہے
ایسولینس چمکتی ہے

گھر سے جب نکلے ہیں
سوختے ہی رہتے ہیں

زندگی کی مٹی سے آج جانے کیا نکلے!
وصل کی بشارت یا ہجر کا ہے پروانہ!
گھر کو لوٹ بائیں گے؟

شام اپنے آچل میں کیا چھپا کے لائے گی
قربتوں کا موسم یا فاصلوں کی آہٹ کو
سوچتے ہی رہتے ہیں

بات چیت ڈرامے کا ڈرامپ سین کیا ہوگا
ٹریجڈی یا کامیڈی
وقت اپنے دامن میں کیا چھپا کے لائے گا
بے گناہ لوگوں کا خون بول اٹھے گا
یا کراڑیگاں ہوگا؟

(طلعت اخلاق احمد)

یہ خبر بھی میں نے پہلے ٹی وی پر بریکنگ نیوز کی

صورت اور پھر اخبارات میں دیکھی ہے کہ.....
ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی میں ایک ہی خاندان کے
15 افراد سروں پر گولیاں لگنے سے جاں بحق ہو گئے۔
ان میں خاتون اور ایک شیرخوار بچے سمیت 3 بچے
شامل ہیں جبکہ پولیس خیال ظاہر کر رہی ہے کہ گھر
کے سربراہ نے باری باری سب قتل کرنے کے بعد
خود کو بھی گولی مار کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا ہے۔

بچکے میں موجود خاندان کو پولیس نے حراست میں
لے کر تفتیش شروع کر دی ہے۔ تفصیلات کے
مطابق گذری تھانے کی حدود ڈیفنس ہاؤسنگ

سوسائٹی فیز فور اسٹریٹ کمرشل نمبر 3 بنگلہ نمبر
83C/2 میں رہائش پذیر ساگھر شوگرمل کے فنانس
آفیسر سمیت ان کی بیٹی کے 15 افراد پر اسرار طور پر

سروں میں گولیاں لگنے سے ہلاک ہو گئے۔ پولیس
کے مطابق ہلاک ہونے والوں میں مذکورہ گھر کا
سربراہ 45 سالہ عبدالجواد درانی ولد عبدالصمد درانی

ان کی اہلیہ 40 سالہ وجیہہ درانی ان کا شیرخوار ایک
سالہ بچہ عارضہ 10 سالہ بیٹی ربین اور 13 سالہ بیٹا
ریان شامل ہیں۔ پولیس کے مطابق واقعے کی

اطلاع انہیں ساڑھے 10 بجے کے قریب متونی
عبدالجواد کے سالے وقار نے دی اور بتایا کہ
عبدالجواد کے دوست جو متونی عبدالجواد سے بار بار

فون پر رابطہ کر رہے تھے مگر گھر والوں نے فون انینڈ
نہیں کیا جس پر انہوں نے گھر کے باورچی کو
موبائل پر فون کیا کہ گھر والے کہاں ہیں کوئی فون

نہیں اٹھا رہا جس پر باورچی اوپر گیا اور کمروں کے
دروازے بند دیکھ کر اس نے دوست کو بتایا کہ سب
سورہے ہیں۔ پولیس کے مطابق متونی عبدالجواد

کے دوست نے دو بار رابطہ کیا تو عبدالجواد سے
رابطہ نہیں ہو سکا اور اس بار انہوں نے متونی
عبدالجواد کے والد کو فون کیا اور ساری صورت حال

ذکرِ جل پری کا

سفر نامہ ذنمارک

قر علی عباسی

ذکرِ جل پری گا

آتش کا خیال

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا ہجر سایہ دار راہ میں ہے

قر علی عباسی کے قلم سے ذنمارک کے سفر کا آنکھوں دیکھا حال



قر علی عباسی

میں چھٹیوں پر ہوتی ہیں اور اتوار کو دیدار کے لیے نہیں آتیں بلکہ صرف اپنی سالگرہ کے دن جھروکے میں آتی ہیں اور وہ 16 اپریل ہے جسے گزرے چار ماہ ہو چکے تھے۔ یورپ کے سیاح بھی اسی غلط فہمی میں تھے۔ بہر حال وہ نہ سہی ان کے گارڈ دروازے کی تصویر اتاری۔ محل کو اچھی طرح دیکھا۔ اس فضا میں سانس لی جس میں وہ رہتی ہیں اور واپس چلے آئے۔

ملکہ ڈنمارک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ پیرس، لندن، کیمرج میں طالب علم رہیں۔ یہ خوش نصیب خاتون ہیں۔ ان سے پہلے صرف مرد حضرات ہی بادشاہ بن سکتے تھے۔ 1953ء میں ایک ریفرنڈم کے ذریعے خواتین کو بھی ملکہ بننے کا حق ملا۔ 1972ء میں یہ 31 سال کی ہوئیں تو ان کے والد فیڈرک نیم کا انتقال ہو گیا۔ یہ اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں اس لیے ملکہ بن گئیں اور یوں اس ملک کی پہلی ملکہ کا

زندگی بھر کسی شاعر سے سوال نہیں کیا کہ حضور! آپ اُن دیکھے محبوب کو ہمارے اعصاب پر کیوں طاری کرتے ہیں اس لیے کوئی ہم سے کیوں پوچھے۔

ملکہ مارگریٹ کی تصویریں ہم نے سفر سے پہلے دیکھی تھیں۔ صورت اور سیرت کی اچھی لگتی ہیں۔ جب اُن کے ذوقِ جمال اور حسنِ کلام قابلیت اور صلاحیت کے بارے میں پڑھا تو محسوس ہوا یہ قابلِ قدر باعثِ احترام اور چاہے جانے کے قابل ہیں۔

ملکہ سے ملاقات ہوگی تو ممکن ہے وہ نقب باندھی لوئڈی عطا فرمادیں۔ ڈنمارک کا کوئی غیر آباد جزیرہ عنایت کر دیں۔ ہم بھی چھوٹے موٹے بادشاہ بن جائیں۔

ایک بجا۔ کوئی نہیں آیا۔
ترغیب کی اطلاع غلط تھی۔ ملکہ اگست کے مہینے

انسان ہی انسان کا دشمن بن گیا ہے انسانیت دوستی رشتے سب کچھ بھول کر.....! آخر وہ کون سا آسیب ہے جو انسان کو اپنے پیاروں کے لبو سے ہاتھ رکھنے پر مجبور کر دیتا ہے؟..... میں نے تو اس سوال کا جواب بہت تلاش کیا ہے لیکن اس تلاش میں ناکام رہا ہوں..... کیا آپ کے پاس اس سوال کا جواب ہے کہ وہ کون سا آسیب ہے؟ کون ہے یہ.....؟

کون ہے یہ؟

یہ کون ہے کہ جو ہم تک آئی ہو اور
گر ہیں لگا رہا ہے؟

ہماری سچی سے زندگی کے
حسین جگنو چرا رہا ہے

کون ہے جو

ہماری شاموں میں دھیرے دھیرے

اترنے والے جمیل رنگوں کو

سیاہیوں میں بدل رہا ہے

یہ کون ہے جو

ہماری صبحوں کو

ذہلیق شامیں بنا رہا ہے

ہمارے دل اب ہوا کی دستک پہ کانپتے ہیں

کون ہے جو ہوا کو

خوشبو کو زہرا لود کر رہا ہے

موسموں کو چرا رہا ہے

دلوں میں گر ہیں لگا رہا ہے

کون ہے یہ!

پتلا گدا

تم اپنے گھر کی خبر نہ لو گے!!

(ط-ا-۱)

☆☆☆☆

سے آگاہ کیا جس کے بعد ان کے والد نے مجھے فون کیا اور جب میں گھر آیا اور ان کے کمروں میں گیا تو سب کی خون آلود لائیں پڑی تھیں۔ پولیس کے مطابق خاتون اور شیر خوار بچے کی لائیں ایک کمرے میں بیڈ پر پڑی تھیں جبکہ گھر کے سربراہ ان کے بیٹے اور بیٹی کی لائیں ایک کمرے میں پڑی تھیں۔ پولیس کے مطابق گھر کے معائنے کے دوران ایسی صورت حال نظر نہیں آئی کہ گھر میں کوئی لوٹ مار کی واردات ہوئی ہو۔ پولیس ذرائع کے مطابق متوفی عبدالجواد کی اہلیہ اور بیٹیوں بچے دیہی میں مقیم تھے اور تین روز قبل ہی وہ کراچی آئے تھے تاہم پولیس نے گھر کے اندر موجود کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ ساتھ چند مشکوک چیزیں اپنی تحویل میں لی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ گھر کے چند حصوں کے فنکٹر پرنٹ بھی لیے گئے ہیں جبکہ پولیس مذکورہ 5 افراد کے قتل کے حوالے سے کسی ٹھوس ثبوت تک تو نہیں پہنچ سکی البتہ پولیس اپنا خیال ظاہر کر رہی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ گھر کے سربراہ عبدالجواد نے باری باری سب کو قتل کرنے کے بعد آخر میں خود کو گولی مار کر ہلاک کر لیا ہے جبکہ 5 افراد کے قتل کے بعد علاقے میں بھی سخت خوف کی لہر پائی جاتی ہے، تاہم پولیس نے گھر کے باورچی کو حراست میں لے کر مزید تفتیش شروع کر دی ہے اور پولیس ذرائع کا کہنا ہے کہ مذکورہ گھر میں ملازم کے طور پر صرف باورچی ہی کام کرتا ہے۔

میں اس خبر کے پیچھے چھپی کہانی جاننے کی خواہش میں جب مرنے والوں کے درتا سے رابطہ کرتا ہوں تو میرے ہر سوال کا جواب بس ایک خاموشی ہی ہوتا ہے.....!

کچھ سمجھ نہیں آتا کہ..... زندگی کے ساتھ موت آخر یہ کیسا کھیل، کھیل رہی ہے کہ.....

اعزاز حاصل کر لیا۔ ملکہ ڈنمارک تاریخ، معیشت دان اور علوم آغا تدریس کی ماہر ہیں۔ کئی جگہ تاریخی مقامات کی کھدائی کی نگرانی کی ہے۔ انہیں مصوری سے گہرا لگاؤ ہے۔ ڈنمارک کے مشہور مصنف اینڈرسن کی کہانیوں کو ٹیلی ویژن پر پیش کرنے میں پیش پیش رہی ہیں۔ ٹیلی ویژن پروڈکشن بھی کی ہے۔ انہیں ٹکٹ جمع کرنے، زردوزی اور پرانی پوشاکوں کا شوق ہے۔ اس کی کئی بار نمائش بھی ہو چکی ہے۔ خوش ذوق خوش لباس اور ذہین ہیں جو اکثر بادشاہ اپنے دور حکومت میں ہوتے ہیں۔ شاپنگ خود کرتی ہیں دنیا میں خواتین کا یہ پسندیدہ مشغلہ ہے۔ لفظ ”شاپنگ“ کو خواتین کے لیے ٹانگ سمجھتے ہیں۔ کسی ملک، قوم اور علاقے سے تعلق رکھتی ہوں شاپنگ کا لفظ ن کریوں خوش ہوتی ہیں جیسے کسی حکومت کا تاج ملنے کی خبر ہو۔ ملکہ کیونکہ خاتون ہیں اس لیے یہ اطلاع ملتی کہ وہ شاپنگ نہیں کرتیں تو حیرت ہوتی۔ قانون ساز اسمبلی کے اجلاس کی صدارت کرتی ہیں۔ ملک میں قانون اس وقت تک لاگو نہیں ہو سکتا جب تک یہ دستخط نہ کر دیں اور انہیں کرنا پڑتے ہیں۔

1967ء میں جب یہ ملکہ نہیں بنی تھیں لندن گئیں۔ ایک تقریب میں فرانسیسی سفارت کار ہنری آندرے سے ملاقات ہوئی اور پہلی نظر کا عشق ہو گیا۔ ہنری نے ملازمت چھوڑ کر شہزادہ بنا قبول کیا۔ شادی ہو گئی۔ انہوں نے اپنا عقیدہ زبان مقام کام سب بدل لیا۔ ملکہ کے پیاری اجڑا ایسی پینی کہ ان ہی کے ہور ہے۔ ہنری اب شہزادہ ہیں۔ ہوا بازی، کشتی رانی، شاعری، مصوری میں ماہرین بناو جانے میں جواب نہیں رکھتے۔ ملکہ کی طرح ذہین ہیں۔ ان کے دو شہزادے ہیں پرنس فیڈرک اور یوگم۔ قانون کے حساب سے فیڈرک ولی عہد ہیں

اور بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ایک بار ہمیں بادشاہ بنا دیا جائے تو یقین کیجئے ان سے زیادہ صلاحیتوں کے مالک بن جائیں گے۔ اینڈرسن کی جگہ اپنا مجسمہ تک لگوا لیں گے۔ شرط یہ ہے کہ ہمارے بعد ہمارا ہی خاندان برسر اقتدار رہے ورنہ وہی حال ہوگا جو پاکستان میں سابق صدر اور سابق وزیر اعظم کا ہوتا ہے۔

وہ بھی خوش، ہم بھی.....

ڈنمارک یورپ کا سب سے پرانا ملک ہے۔ برس ہا برس پہلے وائی کنگ۔ بحری فزاقوں نے دریافت کیا۔ یہ لوگ سمندر میں سفر کرتے اور ملکوں کو لوٹنے، کبھی ان پر حکومت کرتے۔ پہلی بار ڈنمارک وہی لوگ آئے۔ ویسے اس کی تاریخ کے آثار 240 ہزار قبل مسیح سے ملتے ہیں۔ اس دور میں بھی انسانی وجود کا احساس ہوتا ہے۔ پتھر کے اوزار اور ہتھیار برآمد ہوئے جن سے خیال کیا جاتا ہے لوگ شکار کرتے یا مچھلیاں پکڑتے تھے۔ زمین بھی کاشت کرتے ہوں گے۔

8ویں صدی شروع ہوئی تو ڈنمارک کے ایک علاقے جٹ سے تاریخ شروع ہوئی۔ ہمارے پنجاب میں ایک خاندان جٹ کہلاتا ہے نہ جانے ان لوگوں کا ڈنمارک کے علاقے جٹ سے کیا تعلق ہے؟ ضرور ہوگا۔ 8ویں صدی میں یہ لوگ اس طرف آنکھ ہوں گے۔ جٹ کا علاقہ ابھی تک ہے اور پنجاب میں پنجاب قوم بھی اگر کہیں پوچھ گچھ ہو تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا علاقہ ڈنمارک میں ہے۔ تمہارے کچھری کی ضرورت ہو تو ہم ان کے خرچ پر گواہی دینے جہاں چاہیں سفر کریں گے۔

ڈنمارک میں جو قبیلہ مضبوط تھا جس کے پاس ہتھیار اور عقل تھی وہ بادشاہ بن گئے۔ باقی رعایا۔ بادشاہ اور جنگ لازمی جزو ہیں بلکہ جنگ نہ ہو تو

بادشاہ کی دھاگ نہیں بیٹھتی۔ پچھلے زمانے میں بادشاہوں کو جنگوں کا شوق تھا۔ جب دیکھو دوسروں کے ملکوں پر حملہ کر رہے ہیں۔ ڈنمارک کے برابر سویڈن اور ناروے ہے۔ یہ لوگ بھی کرکٹ اور فٹ بال ٹورنامنٹ کی طرح جنگیں لڑتے رہے۔ تاریخ کے ساتھ ڈنمارک کا جغرافیہ بھی بدلتا رہا۔

ایک زمانہ آیا ڈنمارک کے بادشاہ نے ناروے اور انگلینڈ پر قبضہ کر لیا۔ یقین نہیں آ رہا لیکن یہ حقیقت ہے پھر سویڈن بھی قبضے میں آ گیا۔ اس کے بعد انگلینڈ ہاتھ سے گیا۔ ناروے بھی الگ ہو گیا۔ سویڈن کبھی ہاتھ آتا، کبھی جاتا۔ آنکھ بچوٹی ہوتی رہی۔ بادشاہ تو خوش رہے بس عوام برباد ہوتی رہی جانی و مالی دونوں صورتوں میں لیکن لڑائی کا عجب نشہ ہے۔ جب بادشاہ کرتے ہیں تو خوب کرتے ہیں۔ ڈنمارک 30 سال تک جنگ کرتا رہا۔ ایک بار برطانیہ نے موقع پا کر ڈنمارک کے شہر میں اتنے کولے برسائے کہ سب ٹوٹ پھوٹ گیا لیکن انہیں جلانے سے زمینیں بچر نہیں ہوتیں۔ کوپن ہیگن پھر دیا سا ہی ہو گیا۔

ڈنمارک نے گرین لینڈ کو اپنی نوآبادی بنا لیا۔ اس لینڈ پر قبضہ کر لیا۔ جرمنی سے جھگڑا ہوا پھر باقی۔

18ویں صدی کے وسط میں 5 جون کو پارلیمنٹ کی تشکیل کی اجازت دی گئی۔ اس یادگار دن کو چھٹی آج بھی ہوتی ہے۔

ڈنمارک کی نوآبادی اس لینڈ نے آزادی کے لیے عور کیا۔ پہلے شیم خود مختاری دی لیکن اس سے عوام مطمئن نہیں ہوئے لہذا مکمل آزادی دی گئی۔ گرین لینڈ قبضے میں رہا بلکہ کئی اور مضبوط ہو گیا۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ہٹلر نے موقع

غیبت جان کر ڈنمارک پر قبضہ کر لیا۔ ادھر ادھر کے ملکوں پر راج کرنے والے غلام ہو گئے لیکن ہٹلر کا سورج ڈوبا، جرمنی کو شکست ہوئی تو ڈنمارک آزاد ہو گیا اور ابھی تک ہے۔ کوپن ہیگن نے ترقی کی۔ خواتین کے حقوق کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اس کا فائدہ موجودہ ملکہ مارگریٹ کو ہوا۔ یہ فیصلہ کیا گیا عورت کو بھی ملکہ بننے کا حق حاصل ہونا چاہیے اس لیے جب شاہ وقت گزرے تو مارگریٹ ملکہ بن گئیں۔ دنیا میں آزادی خواتین کا سب سے زیادہ فائدہ ڈنمارک کی شاہی خواتین کو ہوا۔

ڈنمارک یورپ کا سرال کہلاتا ہے۔ اس ملک کی شہزادیاں کئی جگہ شادی ہو کر گئیں۔ آج سے 30 سال پہلے ہمیں یہ معلوم ہوتا تو برصغیر کا سرال بھی بنا دیتے۔ لاکھ ہمارے مخالفین یہ انواہ اڑا میں کہ اگر ہم ڈنمارک کے شاہی خاندان میں شادی کرتے، گھر داماد بن جاتے اور برصغیر کب سرال ہوتی لیکن رقیبوں کی بات پر کان نہیں دھرنا چاہیے ویسے ان دنوں بھی خسارے میں نہیں اپنے گھر میں بادشاہ ہیں ہمارا ہی حکم چلتا ہے۔

ڈنمارک کے شاہ کرچین ہم کو یورپ کا سر کھا جاتا ہے۔ شہزادیاں خوبصورت ہوں گی تو رشتے دوز قریب ہر جگہ سے آئیں گے اور سر بننا بہر حال اچھا ہوتا ہے غلام بننے سے۔

ڈنمارک 500 جزیروں پر مشتمل ہے، بعض اتنے چھوٹے ہیں کہ سمندر میں ڈوبتے ابھرتے رہتے ہیں اور ان پر آبادی نہیں ہے۔ دو جزیرے سب سے بڑے ہیں۔ ایک جزیرہ زہنی لینڈ ہے یہ سویڈن سے ملا ہوا ہے۔ اس میں کوپن ہیگن ہے جہاں ملک کی بڑی آبادی رہتی ہے۔ یہ تجارتی صنعتی شہر ہے۔

دوسرا جزیرہ جٹ لینڈ ہے جو جرمنی سے متصل

ہے۔ ان جزیروں کے درمیان فری سروس چلتی رہتی ہے۔

بحری جہازوں کی رہنمائی کے لیے لائٹ ہاؤس تعمیر کیے گئے ہیں۔

فیونن جزیرے میں قلعے ہیں۔ اس کی وجہ شہرت ایڈرن ہے جو اس کے دیہات اوڈیش میں پیدا ہوا تھا۔

ڈنمارک جرمنی سے ملا ہوا ہے اس لیے لوگ عام طور سے جرمنی زبان سے واقف ہیں۔ دوران تعلیم ڈینش کے علاوہ بھی ایک زبان سیکھنی ضروری ہے۔ لوگ جرمنی اور انگریزی سیکھ لیتے ہیں سیاحوں کو بڑی سہولت ہوتی ہے ہمیں بھی کوئی وقت نہیں ہوتی۔

یہ ملک ایک جزیرہ ہے اس لیے سمندر کی آب و ہوا گہرا اثر ڈالتی ہے۔ گرمیوں میں موسم معتدل اور سردیوں میں نقطہ انجماد سے نیچے گرا رہتا ہے۔ سیاح خوب آتے ہیں اور اس کے میدان پہاڑ چھٹیلے اور سمندر دیکھتے ہیں۔ ڈنمارک کے ساحل سفید ریت یورپ کے لوگوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ دنیا بھر سے اشیاء آتی ہیں۔ ہم اس بات پر خوش تھے کہ پاکستان سے پسند کے آم اور گولیاں تک آتی ہیں۔

ڈنمارک کے سرخ جھنڈے پر سفید کراس بنا ہے۔ اس کے بارے میں ایک مشہور روایت مشہور ہے یہ آسمان سے خاص اس ملک کے لیے جنگ کے دوران گرا تھا۔ ڈنمارک کے لوگ پڑھے لکھے سمجھدار ہیں پھر بھی ایسی باتوں پر یقین کرتے ہیں۔ اگر اللہ میاں کو جھنڈا ہی گرا تا تھا تو وہ پاکستان کے لیے گراتے لیکن یہ بات بھی نہیں بھولنی چاہیے کہ اُس وقت پاکستان موجود نہیں تھا اس لیے اللہ سے شکوہ جائز نہیں۔ ڈنمارک خلائی ریاست ہے عوام کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھا جاتا ہے اتنا کہ ہم

قیام کے دوران کسی کو دماغتے دیکھنے کو ترس گئے۔ پردیس میں جاتے ہیں قدم قدم پر دعائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاکستان میں جہاں جاؤ سڑکوں پر دعائیں ڈھیروں ملتی ہیں۔ اگر چند کسے دے دو تو بادشاہ بنے اور بغیر شادی اولاد کی خبر سن لیں۔ ڈنمارک میں فقیر نہیں، حکومت بہانے بہانے لوگوں کو وظیفہ دیتی ہے۔ وہ بھی اتنا کہ ٹھاٹھ سے رہا جا سکتا ہے۔ یہ ماہانہ ہوتا ہے، بعض جلدی خرچ کر کے پھر دفتر پہنچ جاتے ہیں اس لیے ہفتہ وار بلکہ بعض کو روزانہ رقم ملتی ہے۔

ہر بچہ کے پیدا ہونے پر ایک خاص رقم ملتی ہے۔ گھر کے حالات خوش حال نہ ہوں دو چار بچے پیدا کر لو۔ کیش کے ساتھ عیش کرو بلکہ بعض حضرات یہ کام کر رہے ہیں۔ تعلیم مفت اور پر سے اچھی خاصی ماہوار رقم بھی ملتی ہے۔ ساری عمر طالب علم رہو کون روکے گا؟

مزدوروں کو تنخواہ ہر ہفتے اور باقی کو ماہانہ ملتی ہے۔ ملک مہنگا ہے اکثر لوگوں کو مہینے کے آخر میں مشکل ہوتی ہے۔ حکومت کے وزیروں کو بھی جو تنخواہ ملتی ہے اس میں گزر بسر میں پریشانی ہوتی ہے۔ بٹ بتانے لگے۔ ”مہینے کے آخری دنوں میں بعض وزیریڑے لینے اور ادائیگی کرنے آتے ہیں تو درخواست کرتے ہیں۔ کریڈٹ کارڈ سے زیادہ رقم لے کر کپڑوں کی دھلائی کاٹ کر باقی انہیں دے دیں۔ نہ جانے ان لوگوں کو علم ہے یا نہیں کہ برصغیر میں جس کا نام وزیر ہوتا ہے وہ بھی ادھر ادھر ہاتھ مار لیتا ہے۔ اصلی وزیر اپنے دور اقتدار میں کروڑوں کے صرف بینک سے قرضے لے کر ڈکار تک نہیں مارتے۔ دنیا میں دولت وہ چیز ہے جسے کھا کر کوئی ڈکار تک نہیں لیتا۔

معاشرہ مادر پدر آزاد ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ

بعض کو علم نہیں ہوتا ان کا باپ کون ہے؟ کچھ ماں سے واقف نہیں ہوتے۔ جو انہیں پہچانتے ہیں انجان بن کر آ زاور ہتے ہیں۔

ہم سے جب کسی ڈینش کا واسطہ ہوا اسے بااخلاق اور ملنسار پایا۔ وہ ہمارے بارے میں بھی یہی خیالات رکھتے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے بارے میں خوش فہمی کا شکار ہوں پھر بھی کیا برائے وہ بھی خوش، ہم بھی.....

زندہ گھر

اے ڈی بٹ پر خلوص انسان ہیں، کوئی بات بھولتے نہیں۔ ہم سے اصرار کر رہے تھے اُن کے گھر منتقل ہو جائیں، مہمان نوازی انہیں بھی کرنے دیں۔ ہم جھوٹے وعدے کر رہے تھے۔ ترغیب کے گھر بڑا لطف آتا۔ یہ کو پینٹین کا ادبی مرکز ہے، شہر میں کوئی آئے اور اُن سے ملاقات نہ ہو یہ ممکن نہیں۔

رات کے 12 بجے ہیں، کسی کا فون آیا، اصرار ہو رہا ہے۔ ”آ جائیے“ دوسری طرف والا ذرا سا تکلف کرتا پھر آ جاتا۔ جی چاہا، کچھ کھا لیا اور نہ چائے کافی تو ضروری ہے پھر باتوں کا سلسلہ ادیب، شاعر، گلوکار سب رابطے میں ہیں۔ ایک گلوکار جرمنی سے فون کر رہا ہے دوسرا لندن سے بات کر رہا ہے اپنی نئی دھن بنا رہا ہے، پھر دھن رہے ہیں۔

ترغیب کی بیٹی تعریف واقعی تعریف کے قابل ہے دو بیٹے اسد اور یزدان پڑھتے ہیں اور پارٹ ٹائم ملازمت بھی کرتے ہیں۔ ماں کا کہنا اور باپ کی بات سنتے ہیں۔ گھر میں اکثر ڈینش بولتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سنیم بھی ڈینش جانتی ہیں۔

ترغیب کا ہاتھ اور سنیم کا دل کھلا ہے، گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں، ہر طرح کے پھل، رس، شکٹ، ڈبل روٹی، ہماری فرمائش پر آم آتے ہیں۔ بغیر بیجوں والا تریوز انکوار اور موسیقی بھی آتی۔ ہمارا پسندیدہ پھل آڑو

ڈھیروں لائے جاتے۔

ہم نے ترغیب کو سوتے نہیں دیکھا۔ رات کو جب بھی آنکھ کھلی انہیں فون پر یورپ پاکستان بات کرتے، اکثر شعر کہتے دیکھا۔ جب دل چاہتا آواز دے لیتے۔

”عباسی بھائی! سوتے نہیں رہے؟“

ہمارا جواب پاکر دروازہ کھول کر کمرے میں آتے۔ ”ایک شعر موزوں ہوا ہے سنئے۔“

ہم اُن کی شعر گوئی کے گواہ ہیں۔ کبھی شعر نہ کہہ رہے ہوں تو دیکھا، جاہ نماز پر کھڑے ہیں۔ پڑھتے لکھتے، گھنگو کرتے، ٹیلی وژن کے سامنے ایسے گھر ہمیں پسند ہیں۔ زندہ چلتے پھرتے، جاگتے، ہنستے بولتے ایسا محسوس ہوتا تھا۔ ہمارے کو پونہ تین آنے سے پہلے ترغیب نے سونے کا کوٹا پورا کر لیا ہے۔ اُن کے دادا، والد اور خاندان کے کئی لوگ شاعر ہیں۔ صاحب دیوان اور اردو شاعری کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اس پر ترغیب نے بھی کوئی لن ترانی نہیں کی، بس کہتے۔

”بھائی! میں تو تنگ بند ہوں.....“

کاش ہم بھی ہوتے۔

وہ ضد کرتے۔ ”بھائی.....! شاعری کریں۔“

ہم سمجھاتے۔ ”پھول..... سینے..... کی چاند چھوئے کی عمر جا چکی۔ اب جو کر رہے ہیں اسی میں کامیابی حاصل ہو تو کارنامہ سمجھیں۔“

ایک دن کسی بات پر ہم نے کہا۔ ”ذرا موسم بدل جانے میں جب آ کر ملوں گا۔“

ترغیب تڑپ گئے۔ ”بھائی.....! امصرع ہو گیا۔ دوسرا کہیں.....“

نہ جانے کیا ہوا، ہم نے چند مصرعے بنائے۔ وہ واہ واہ کر کے ہمیں داد دینے لگے۔ خدا نے خبر کی۔ ہم نے اسی وقت توہ کی۔ اردو میں کیسے اچھے اچھے

شاعر ہیں انہی کو پڑھ کر لطف لیں گے۔ شاعری کی ہے نہ کریں گے۔

ترغیب کا بیٹا یزدان کینڈا سے پڑھ کر آیا اور اب کوپنٹین میں طالب علم ہے۔ کبھی کمرے میں آتا تو سنجیدہ باتیں کرتا۔ اس کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ ہے۔ ایک بار کہنے لگا۔

”ہم اللہ کا نام لیتے ہیں تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کہتے ہیں جس کا مطلب ہے۔“ شروع اللہ کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے۔“ پھر انسان کو کیا ڈر۔ اس کا خالق ناکم رحم کرنے والا رحیم ہے۔“

ہمیں اس کی بات پسند آئی۔ نوجوانی میں وہ گہری باتیں کرتا ہے۔

ترغیب نے ایک دن کہا۔ ”بھائی! اردو بولنے والوں کو ”اردش“ کا نام دینا چاہیے۔ میں نے رئیس امر وہوی کو بھی خط لکھا تھا۔“

ہم نے کہا۔ ”آپ کی بات معقول ہے لیکن کون مانے گا؟“

ایک صبح بٹ آئے تو ہمارے کپڑے اٹیچی میں ڈالے اور اپارٹمنٹ سے نیچے اتر گئے۔ اس کا مطلب تھا ہمارا قیام و طعام ترغیب کے گھر ختم ہوا۔ تنہا سے اجازت لی۔ ترغیب نیچے چھوڑنے آئے۔ ہم نے کہا۔ ”آپ بٹ کے گھر روز آئیں گے ورنہ فون کریں گے۔“ جس دن ایسا نہ ہوا، کوپنٹین سے چلے جائیں گے۔ انہوں نے ہنس کر وعدہ کیا۔ تمہا یا بھی۔

اسے ڈی بٹ کا گھر ایک خوبصورت کالونی میں ہے جو ہنزدرختوں اور پھولوں سے ڈھکی ہے، حسین مکانات صاف تھری سڑکیں۔

گاڑی دروازے سے داخل ہوئی۔ سیدھے ہاتھ پر ایک بزلان اس میں گلاب کے اتنے پھول ہر طرف رنگ ہی رنگ پھیل رہے تھے۔ ان میں

شوخ سُرخ، گلابی سفید اور نیلے پھول یوں محسوس ہوا لاہور کے پھولوں کے باغ میں آگئے۔ سامنے ایک پورچ ہے جس کا دروازہ ریوٹ سے کھلتا ہے۔ یہاں ایک طرف منرل واٹر کی بوتلوں اور ٹشورول کا ڈھیر ہے۔ ایک دروازہ اندر کی طرف کھلتا ہے۔ ادھر داخل ہوں تو راہ درہی جس کے اگلے ہاتھ پر گتے کے ڈبے قطار سے رکھے ہیں ان میں موسم کا ہر پھل تربوڑ، خربوڑ، ناشپاتی، آم سے گلزیاں تک رکھی تھیں۔ بٹ کو کھانے پینے کا شوق ہے اور کھلانے کا بھی۔

راہ درہی کے بعد ایک کمرہ اس کے برابر باورچی خانہ جس میں دو دروازے کھلتے ہیں ایک ڈائننگ ہال میں دوسرا پتلی راہ درہی میں جس میں تین بیڈروم اس کے برابر ہاتھ روم پھر ایک راستہ جو بڑے دروازے کو جاتا ہے یہ گھر میں داخل ہونے کا دروازہ الیکٹرونک چابی سے کھلتا ہے دروازے کے برابر ایک ہاتھ روم اور ہے ڈرائنگ روم سے ملا ایک بیڈروم ہے باورچی خانے کے دروازے کے آگے زمین اوپر اور دوسرا نیچے جاتا ہے۔ یہاں بھی بیڈروم ڈرائنگ روم اور ہاتھ روم ہیں۔ ضرورت کی ہر چیز نیچے ایک فریڈر بھی ہے جس میں انواع و اقسام کی اشیاء رکھی جاتی ہیں۔

ڈرائنگ روم کشادہ ہے۔ خوبصورت فرنیچر شیشے کے حسین پھولوں، پھلوں اور پتوں سے ہے۔ روشنی کا بڑا اچھا انتظام ہے۔

جو کمرہ ہمیں دیا گیا پورے کمرے کی چوڑائی میں شیشے کی کھڑکی تھی جس سے مکان کی پچھلی طرف کا باغ نظر آتا، پھول دکھائی دیتے اس کا دروازہ باورچی خانے سے بھی تھا۔ یہاں بھی ڈھیروں گلاب مسکار رہے تھے۔ باغ کے درمیان پھولوں کے ننھتے تھے۔ دائیں طرف ایک پودے میں

ڈھیروں بلیک بیر بگ تھیں۔ اس کے ساتھ آلوچے کا درخت تھا۔ ہم نیچے تو شاخ در شاخ زرد آلوچے لدے تھے۔ درخت کا آدھا حصہ دوسرے گھر میں جا رہا تھا۔ زمین پر بھی ڈھیروں گرے تھے۔ یہ رات کو شاخوں سے اس لیے جدا ہو گئے تھے کہ پک گئے تھے۔

ہم نے ایک جھکی ہوئی شاخ سے زرد آلوچے توڑ رکھا تھا۔ عجیب ذائقہ تھا۔ خوبانی، پلم کا مزہ۔

بٹ نے بتایا، اسے کراس کیا گیا ہے جب ہی کئی پھلوں کا لطف دے رہا ہے۔ بائیں طرف ایک چھوٹا پودا سرخ پلم سے بھرا کھڑا ہے۔ ایک طرف سیب کا درخت جس کی شاخیں پھولوں سے خالی ہو چکی تھیں۔ باورچی خانے سے جو دروازہ باغ میں کھلتا ہے اس کے آگے سفید سینٹ کا فرش اس پر سفید چھ گارڈن کرسیاں اور سفید میز رکھی تھی۔ اس حصے کے اوپر شیشے کی چھت تھی۔ اس کے برابر ایک حوض تھی۔ ہمیں یہ سب کچھ بہت اچھا لگا۔ قدرت زمین پودوں، پتوں، گھاس اور پھولوں سے سجاتی ہے۔ یورپ والے اس کا بھر پور لطف اٹھاتے ہیں۔ موسم بھی مدد کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام ہے۔

پہلی صبح ہماری آنکھ ایک خوبصورت آواز سے کھلی۔ کھڑکی سے دیکھا تو سُرخ پروں اور نیلے سروں والا پرندہ آلوچے کی شاخ پر بیٹھا بول رہا ہے۔ دل میں ایک انجمنی خوشی جاگ اٹھی۔ یہ اللہ کا کیسا کرم ہے۔ اس نے رنگوں کو آواز دی، ہوا میں اڑایا۔ ہم دیکھ کر اس کی قدرت کی تعریف کریں۔ بے شک میرا رب حسین ہے اور سن پسند کرتا ہے۔

مفت سہولت عطاء الحق قاسمی شاعر، کالم نگار، بستی بستی گھومتے امریکا آتے ہیں۔ ایک دن ”اردو ٹائمز“ نیوز

کے ایڈیٹر ظیل الرحمان کا فون آیا۔

”عطاء الحق قاسمی پاکستان جا رہے ہیں۔ ہوائی اڈے آجائے، گپ لڑائیں گے، کافی پیئیں گے۔“

ہم کسی کو الوداع نہیں کہتے افسوس ہوتا ہے جانے والا لوٹ کر آئے نہ آئے، کیوں جدا کریں۔

عطاء الحق قاسمی کے بارے میں یقین تھا، دو چار ماہ بعد لوٹ آئیں گے اس لیے سرور جاوید کے ساتھ ایئر پورٹ پہنچے تو دیکھا، عطاء الحق قاسمی کا وائٹ سے بورڈنگ کارڈ لے رہے ہیں پھر اچانک وہ نیل چیر میں بیٹھ گئے۔ ہم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”خیریت آپ ماشاء اللہ بھلے چکے ہیں۔“ وہ ہنس کر بولے۔ ”یہ ایک سہولت ہے، مل سکتی ہے فائدہ اٹھانا چاہیے۔“

اس دن احساس ہوا، اگر کوئی سہولت مفت مل سکتی ہے تو استعمال میں کیا مضائقہ سنا ہے، مفت کی ملا کو بھی جائز ہوتی ہے۔ ملا سے مراد ملا دو پیازہ ہے۔ دوسرے دل پر نہ لیں۔ مفت سہولت کا فائدہ کوپنٹین ہیگن میں لوٹا۔

نیشنل میوزیم کی شہرت سنی تھی۔ ڈینٹل کلینر ہسٹری کا مرکز سب سے پرانا، بڑا قابل دید خاص طور سے ہندوستانی حصہ۔ سیاحوں کو دیکھنا ضروری ہے۔ یہ سنا تو ایک صبح حملہ کر دیا۔ بٹ نے ٹکٹ خریدے۔ کاؤنٹر والی لڑکی نے اوپر جانے کے لیے انگلی سے اشارہ کیا۔

بٹ سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ ہم نے روکا۔ لفٹ کی سہولت سے فائدہ اٹھائیں۔ لڑکی نے انگلی راہ دکھانے کے لیے کم اوپنٹی کی تھی اس لیے پہلی منزل پر جا اترے۔ دوسری پر جانا تھا پھر لفٹ استعمال کی۔ جہاں جہاں معلومات کے کاؤنٹر تھے وہاں کچھ نہ کچھ پوچھا۔ یہ سہولت مفت تھی۔ جو پمفلٹ اور کتابچے رکھے تھے اٹھا لیے یہاں تک کہ

مفت سہولت عطاء الحق قاسمی شاعر، کالم نگار، بستی بستی گھومتے امریکا آتے ہیں۔ ایک دن ”اردو ٹائمز“ نیوز

ڈینش بھی لے لیے۔ مفت تھے۔ بٹ کو حیرت ہوئی۔ ہم نے کہا۔ ”اگر کبھی ڈینش زبان سیکھ لی تو پڑھ لیں گے۔“ جہاں لکھا تھا۔ ”اس ڈبے میں کوڑا ڈالیے۔“ جب سے کوئی بے کار کاغذ ڈالا۔ ایک جگہ پانی کا ٹل لگا تھا مفت منہ لگا کر پیا۔ ہاتھ روم کی سہولت بغیر کراؤن خرچ کیے میسر تھی استعمال کی۔ کاری ڈور کمروں ہال نوادرات کی الماریوں کے پاس جو خواتین نظر آئیں انہیں توجہ سے دیکھا۔ ذرا دیر میں مفت سہولت کی ایسی عادت ہوئی کہ نوادرات کو چھونے کی اجازت نہ تھی۔ انہیں ہاتھ لگایا۔

نیشنل میوزیم میں بدھ کے دن داخلہ مفت ہے۔ ہم اتوار کو گئے تھے۔ مفت کی سہولت سے محروم رہے۔ دل کو ٹسلی دی۔ ہم بدھ کو آتے تو بورڈ لگا ہوتا۔ ”اتوار داخلہ مفت“ ہمارے ساتھ ایسا اکثر ہوا ہے۔ قاہرہ میں مصری ہوائی سروس کے ڈنر پر گئے تو زائر پہلے رقاصائیں تھک کر چھٹی گلی سے جا چکی تھیں۔ کوالا لپور میں ایک رات ہوٹل میں مفت قیام کی سہولت ہمارے پیچھے ہی موقوف کر دی تھی۔ ایڈنبرا میں سینڈک ہوٹل والوں کو معلوم ہوا ہم دورات کے مہمان ہیں۔ دو دن ٹھہرنے والے کو تیسرے دن مفت قیام کا پمفلٹ جاری کر دیا۔ دوران سفر اپنی آمدورفت پوشیدہ رکھتے ہیں پھر بھی مقامی انتظامیہ پتا لگا کر مفت رعایت سہولت اور راحت ادھر ادھر کر دیتے ہیں۔ ہم نے بھی اب شکوہ کرنا بند کر دیا ہے کچھ خودداری بھی ہوتی ہے۔

نیشنل میوزیم والوں کا دعویٰ ہے یہ 10 ہزار سال کی ثقافتی تاریخ کا مرکز ہے۔ جب ویڈیو سے برف پر شکار کھلتے تھے اس دور سے آج تک کی تاریخ محفوظ کی گئی ہے۔ جس عمارت میں یہ میوزیم ہے وہ تین سو سال پہلے شہزادے فیڈرک بیچم کا محل

تھا۔ دو سال سے زیادہ ہوئے یہ سیاحوں کے لیے عجیب گھر بنا ہوا ہے۔ سو سال بعد کو پینٹین دوبارہ جانا ہوا تو ایک دو اور شاہی محل عجیب گھر میں تبدیل ہو چکے ہوں گے۔ عوام بیدار ہونی جائے گی تو بادشاہ اور ان کے قلعے محل دیدہ عبرت بنتے جائیں گے۔ اسی خوف سے ہم نے کبھی بادشاہ بننے کا نہیں سوچا۔ میوزیم میں ڈنمارک کے علاوہ دوسرے ملکوں کے نوادرات بھی ملتے ہیں۔ شاہی خزانے کے سکے بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ سیاحوں کو دوسرے ملکوں کا سامان بھی دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ بچوں کی تفریح کا بھی معقول انتظام ہے۔ کھلونے رنگ برنگی اشیاء اور بحری قزاقوں کے جہاز کی سواری موجود ہے۔

نیشنل میوزیم میں ہندوستانی حصے کی تلاش تھی جہاں کی حیرت انگیز نوادرات کا شہرہ تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ ایک زمانے میں ہندوستان اور ڈنمارک کے گہرے مراسم تھے۔ ہندوستان کے علاقے تامل ناڈو میں ڈینش گورنر راج کرتے تھے۔ ان دنوں ڈنمارک کے شاہ کرپین چہارم اور ہندوستان کے مہاراجہ رگھورام کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جو پان کی شکل کے ایک سونے کے پترے پر تحریر تھا۔ یہ ڈینش اور تامل زبانوں میں تھا۔ دروغ برگردن راوی مہاراجہ کو ڈینش بادشاہ پر اعتبار نہیں تھا۔ جانے ڈینش میں کیا لکھ دیں اس لیے اپنی زبان بھی شامل کی۔ اس میں تحریر تھا۔ ”ہندوستان اور ڈنمارک کے باشندے کسی روک ٹوک کے بغیر ایک دوسرے کے ملک سفر کر سکتے ہیں۔“ ہم اس معاہدے کی تلاش میں تھے تاکہ تامل حضرات کو اطلاع دے سکیں وہ ڈنمارک دوڑ جائیں۔ خیال یہ بھی تھا مغلوں نے ہزاروں سال ہندوستان پر حکومت کی ہے کچھ ان کی باقیات بھی شاید دیکھنے کو مل جائیں۔

کوری ڈور میں بٹ نے ایک محافظ خاتون سے

ہندوستانی شے کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے ڈینش میں کچھ سمجھایا اور ایک سمت اشارہ کیا۔ اس میوزیم میں یہ دوسرا اشارہ تھا۔ نہ جانے یہ خواتین اشاروں سے کیوں سمجھانا چاہتی ہیں؟ ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے ہم ڈینش زبان سے نا آشنا۔ بٹ سے گفتگو اور ہمیں اشارہ کرتی تھیں۔

ذرا دور چلے۔ سامنے ایک اسٹارٹ باوردی خاتون نظر آئیں۔ ہم نے بٹ سے کہا۔

”ان سے راستہ پوچھیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ وہ کہنے لگے۔

ہم چل گئے۔ ایک سہولت ہے دام درہم خرچ نہیں ہوتے اس سے فائدہ اٹھائیں۔ فارسی کا ایک شعر ہے جس کا مطلب ہے۔

”تم نے شراب دی آنکھوں سے دیکھا جام

ہاتھ میں لیا، جسم نے چھو ا منہ کے نزدیک کیا تاک

نے سونگھا، لبوں سے لگایا زبان نے لطف لیا، صرف

کان محروم رہ گئے۔ خدارا آواز سے بتاؤ۔“ یہ شراب

ہے..... میوزیم میں محسوس کر رہے تھے دیکھ رہے

تھے سنتا بھی چاہتے تھے چاہے وہ ڈینش ہی کیوں نہ

ہو۔

بٹ نے مہمان نوازی کی رسم نبھاتے ہوئے

خاتون سے پوچھا۔ خاتون نے مسکرا کر ڈینش

میں جواب دیا۔ اس موقع کے لیے شاعر نے کہا

ہے۔

اوروں سے سنا تم نے، اوروں سے کہا تم نے

کچھ ہم سے سنا ہوتا، کچھ ہم سے کہا ہوتا

ایک لمبے کاری ڈور میں چل دیے۔ کئی جگہ نقشے

اور ہدایات لکھی تھیں۔ ہم رک جاتے۔ یہ ڈینش میں

تحریر تھیں، بعض کو انگریزی سے نوازا گیا تھا۔ اُن

سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا تھا لیکن دیکھنے آئے ہیں تو

یہ کیوں محروم رہیں۔

شکوت تھا نوی اردو کے ممتاز مزاح نگار ایک افسانے میں لکھتے ہیں۔ ”بیگم آج پیک اگلے اگلے بے حال ہو گیا۔“

بیگم نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

”بھئی، جس عمارت میں گئے وہاں جگہ جگہ لکھا

تھا، برائے کرم یہاں تھوکیے۔ اب اتنے بد اخلاق

نہیں کہ کسی کی درخواست مسترد کر دیں۔“

ہم ہر ہدایت کا ڈنر اور میوزیم کے محافظ کے

پاس رکھے، آگے بڑھتے رہے یہاں تک کہ ایک

دروازہ آ گیا۔ یہ شیشے کا بنا تھا۔ دکھا دے رکھو لا تو

راہ درہم پھر کمرہ آ گیا۔ یہ ہندوستانی ثقافت اور

تہذیب کا حصہ تھا۔ ایک ڈولی رکھی تھی وہی جس

میں ذہن کو الوداع کہا جاتا ہے اور کھیاں، سہیلیاں

”چھوڑ باہل کا گھر“ گالی ہیں۔ ہندوستان والوں

نے ذہن رکھ لی۔ خالی ڈولی ڈنمارک بھجوا دی۔ خیر

اس کی کیا شکایت، یہاں ذہن کی کیا کمی۔ یورپ کی

سسرال ہے وہ ساری پری چہرہ شہزادیاں لے

گئے۔ اب بھی بازار گلی کو چپے بھرے ہیں، بس

ہمت مردان۔ وہاں جانے کے لیے ویزا اور

ڈھیروں کراؤن کی ضرورت ہے۔ اگلی الماری میں

چاندی کے زیورات پرانے انداز کے۔ ان کے

درمیان بھگوان براہمن تھے ان کی حفاظت کے

لیئے ہو سکتا ہے یاد کرانے کے لیے زیورات کی لالچ

نہ کروور نہ کئی نہیں دیں گے۔

ذرا فاصلے پر گوتم بدھ بیٹھے تھے۔ ہندوستان نے

تو انہیں اپنا یا نہیں۔ بدھ مت باہر زیادہ مقبول ہوا۔

آج چین تک پھیلا ہوا ہے۔ اس جگہ گوتم بدھ اچھے

لگے۔ ان کا دیدار مشرق بعید کے بہت سے ملکوں

میں ہوا تھا۔ بنگاک میں نرلا تو بہت ہی اچھی لگی

تھی۔ وہ بدھ تھیں۔ ان سے بدھ کے دن نہیں ہر روز

ملتے تھے۔ ایک جگہ مختلف لباس اور برتن بھی رکھے

صائمہ سحر

یہ ہے زندگی میری

حامل علی سید کا خیال

زبان رکھتے ہیں پتھر بھی، چٹا نہیں بولتی ہیں
جو چہروں پر لکھی ہیں داستاںیں بولتی ہیں

سچی کہانیاں کی سچی کہانیاں کی دلچسپ روداد زندگی

بتاتی تھی کیونکہ میری ماما مجھے ہی ڈانٹ دیتی تھیں کہ تمہاری ہی کوئی غلطی ہوگی لیکن سچی بات تو یہ ہے نہ میں بچپن میں کسی سے لڑتی تھی نا ہی اب لڑاتی پسند سے لیکن اب بڑے ہو کر جب میں ہر کسی کو لڑاتے جھگڑتے دیکھتی ہوں تو بہت دکھ ہوتا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ..... یہ انسان ہمیشہ محبت کے ساتھ مل کر خوشی خوشی ساتھ کیوں نہیں رہتا!..... کیا زمانہ ہے کہ میں نے خون کے رشتوں کو جائیداد کے لیے دشمنی میں بدلنے دیکھا ہے۔ اللہ رحم کرے! اور کرم کرے کہ..... ہر انسان انسان دوست بن جائے!!

میرے والد کا تعلق پشاور کی ایک پٹھان قبیلے سے ہے اور میرے والد کے تمام رشتے دار پشاور میں ہی رہائش پذیر ہیں اس لیے ہم سال میں ایک بار وہاں اپنی دادی (بے بے) سے ملنے ضرور جاتے ہیں۔ میں رشتوں کے معاملے میں بہت

میرا نام صائمہ سحر ہے، دو بھائی اور پھر دو بہنوں میں میرا نمبر پہلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب کی لاڈلی ہوں۔ میرا بچپن بھی اور بچوں کی طرح کھیلتے اور مستی کرتے ہی گزارا۔ مجھے جب اسکول میں داخل کرایا گیا تو میں بہت خوشی خوشی اپنی کلاس میں گئی اور پہلے ہی دن A,B لکھنا سیکھا اور گھر آ کر گھر کی دیواروں پر بھی لکھنا شروع کر دیا۔ مجھے شروع سے ہی لکھنے پڑھنے میں بہت دلچسپی رہی ہے یہی وجہ ہے کہ میں پوزیشن ہولڈر اسٹوڈنٹس میں سے تھی۔

میں ہمیشہ سے ہی بہت ہنس مکھ ہوں اور دوسروں کو ہنسانے میں مجھے بہت حرا آتا ہے۔ بچپن بہت اچھا ہوتا ہے نا!..... تاکوئی نام نا دکھ کچھ کچھ میں جو نہیں آتا بس خوشیاں ہی خوشیاں! ارے ہاں! بچپن میں میرے ساتھ ایک بڑا مسئلہ تھا وہ یہ کہ اگر کوئی مجھے مارتا تو میں گھر میں آ کر نہیں

حالا ان کہ ہم سیدھی سیدھی انگریزی بول رہے تھے۔ عربی کا ایک لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ معاہدہ یقیناً ہما دیا گیا ہے۔ کسی تہہ خانے میں رکھا ہوگا جس طرح شاہ وقت اپنے دشمنوں کو تہہ خانوں میں رکھ لیتے تھے۔ یہ کارروائی امیگریشن قوانین کے تحت ہو سکتی ہے تامل لوگوں سے خطرہ ہوگا ایسا نہ ہو تو وہ اس تعداد میں آ جائیں کہ بچہ بچہ تامل بولنا سنائی دے پھر ہم کو پینٹین نہیں ہندوستان ہی جاتے۔

ہندوستانی شیعے سے دوسری سمت آئے۔ ایک کمرے میں دس بارہ کرسیاں رکھی تھیں۔ یہ سہولت مفت تھی۔ اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک کرسی پر بیٹھے، ہتھے پر بازو رکھ لیا۔ جانے کیا ہوا، سامنے اسکرین روشن ہو گیا۔ فلم نظر آنے لگی۔ بٹ نے ہماری طرف دیکھا، ہم نے انہیں گھورا، غلطی دونوں کی نہیں تھی یہ خود بخود ہو گیا۔ ہندوستان، تھائی لینڈ کے مناظر سامنے آنے لگے۔ ایک شادی کا منڈپ، رسیں اس کے بعد ایک رقصہ آئی تو ظالموں نے فلم کے بجائے سلائیڈ دکھانے شروع کر دیئے۔ ہم انتظار کرنے لگے شاید اسکرین پر لکھا آئے۔ ”اصلی رقص بدھ کے دن“ یہ پسند نہیں آیا۔ کرسی سے اٹھے تو اسکرین کی روشنی جاتی رہی۔ فلم کے دوران اندھیرے میں برابر ایک خاتون آ بیٹھی تھیں۔ وہ کسی انجانی زبان میں کچھ کہنے لگیں۔ شاید ہمارے اٹھنے سے فلم بند ہونے پر براجمان رہی ہوں۔ ہندوستانی حصے سے متاثر ہو کر جانا تو تھا ہی۔

کاری ڈور میں آئے تو باہر پھوٹا گرنے لگی تھی۔

(یہ دلچسپ سفر نامہ ابھی جاری ہے
بقیہ آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔)

☆☆☆

تھے۔ گھر گریہ ہستی کا سارا سامان موجود تھا۔ ذہن نہیں تھی۔ عجائب گھروں میں یہی پریشانی ہوتی ہے۔ ہم برطانیہ میں چرچل کا گھر دیکھنے گئے وہاں سب کچھ تھا۔ ایک الماری میں کپڑے ٹنگے تھے۔ اوپر ہیٹ رکھا تھا۔ نیچے جوتے برابر میں چھڑی بس چرچل نہیں تھے۔ آپس کی بات ہے اگر ہوتے تو ہم یوں بے دھڑک ان کے گھر نہ جاتے۔ یہ الگ بات ہے ہم جاتے کیوں؟ دیکھنا تھا تو کسی چشم دلب اور سروخوش ادا کے نزدیک جاتے۔

موسیقی کے ساز بھی تھے۔ سازگی کتنے دنوں بعد دیکھی۔ ایک ستار بھی رکھا تھا۔ ہندوستان کی ایک زبان موسیقی بھی ہے۔ ہندو مذہب رنگ رقص اور موسیقی کا مرکب ہے۔ ایک الماری میں صراحیاں چائے کے پیالے پانی کے برتن نظر آئے۔

ہندوستانی حصے میں بدھ کے علاوہ مسلمانوں کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ خوبصورت قالین، شوخ رنگوں کے پھول الماریوں میں رکھے۔ تخت پر بچھے مسلمانوں کا لباس، گریٹ، پگولی، کشیدہ کاری کے نمونے، ہاتھی دانت کی اشیاء ایک جگہ۔ ہندوستان کے مرد عورتوں، بچوں کے چھوٹے چھوٹے جسمے مختلف علاقوں کے لباس میں نہ جانے کب سے کھڑے سیاہوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ہمیں بھی دیکھا ہوگا، بول نہیں سکتے جیسے ہندوستان کے غریب عوام زبان نہیں کھول سکتے۔

جو کچھ ڈنمارک والوں کے ہاتھ لگا رکھا۔ دیکھو اور لطف اٹھاؤ۔ ہندوستان کی ثقافت، تہذیب، مذہب رہن سہن ایک جگہ کر دیا۔

ہم نے ہر الماری، شوکیس کو غور سے دیکھا، افسوس سونے کا وہ پتر انظر نہیں آیا جس پر ہندوستان اور ڈنمارک کا معاہدہ تحریر تھا۔ اس بہانے کوئی گمران اور محافظوں سے پوچھا بھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا

خوش نصیب ہوں کہ ہر طرف ہر جگہ سے مجھے محبت ہی ملی ہے اور مل رہی ہے، سب مجھے بہت پیار کرتے ہیں اور میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی ہوں کہ میرے پاس رشتے اور محبتیں ہیں جنہوں نے مجھے جینے کا انداز سکھایا اور سمجھایا ہے۔ جب میں نویں جماعت میں تھی تو میری پسندیدہ بیٹ ٹیچر اور اسکول کی وائس پرنسپل مس مہر افروز نے مجھے زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں جو سمجھایا، مجھ پر اُن کا احسان ہے کہ انہوں نے مجھے زندگی اور لوگوں کو سمجھنے کا گر سکھایا۔ اسکول میں میری تین کلاس فیوز دوست روزی، فرحین نازیہ اور میرا ایک گروپ تھا اور میں گروپ لیڈر تھی۔ ہمارے گروپ نے کسی کو بھی کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا، ہمارا گروپ خصوصاً میں بہت شرارتیں کرتی تھی مگر کبھی کوئی ایسی بات یا شرارت نہیں کی جو دوسرے کے لیے پریشانی یا دکھ کا باعث بنے!

اسکول کا سنہرا دور ختم ہوا تو کالج کا دور شروع ہوا مگر مجھے کالج کبھی اچھا نہیں لگا، شاید اسی لیے میں اکثر کالج نہیں جاتی تھی اور شام کے اوقات میں کوچنگ سینٹر جوائن کر لیا تھا۔ وہاں مجھے اور بھی بہترین دوستوں، ٹیم، ٹیم، سر، عروج وغیرہ کا ساتھ ملا، یہ ساتھ انٹر کلیئر کرنے کے بعد بھی اب تک قائم ہے۔

مجھ میں جہاں بہت سی اچھائیاں ہیں، وہاں بہت ساری خرابیاں بھی ہیں جن میں سرفہرست میرا غصہ ہے، مجھے غصہ بہت زیادہ آتا ہے اور بہت جلدی بھی لیکن جب گئے دنوں کوچنگ کے دوران میں سر ویم احمد خان نے یہ سمجھایا کہ بیٹا، غصہ مت کیا کرو اور غصے کے بارے میں اسلامی باتیں بتائیں اور سمجھائی بھی تمہیں تو اُس کے بعد اب میرا غصہ

قدرے کم ہو گیا ہے!!

سچی بات تو یہ ہے کہ..... میری زندگی بنانے میں میری ماما کا ہاتھ سب سے زیادہ ہے کیونکہ میرے ابا کے خاندان والے تعلیم کے حامی نہ تھے، خصوصاً میرے چچا وغیرہ اس بات کے مخالف تھے کہ خاندان میں تعلیم وغیرہ کا کوئی سلسلہ ہو اور خصوصاً لڑکیوں کو تعلیم دلائی جائے..... مگر میری ماما اُن کے مقابلے میں ڈٹ گئی تھیں کہ میری بیٹیاں ضرور پڑھیں گی..... ”شکریہ ماما! کہ آج ہم ہمیں جو کچھ بھی ہیں، آپ کی وجہ سے ہیں۔“

جب میں نے رسالے وغیرہ میں لکھنا شروع کیا تو میری ماما نے ہی میری سپورٹ کی اور کہا کہ لکھو! پھر میں نے ایک کہانی ”سچی کہانیاں“ میں بھیج دی اور اُس کے چھپنے کا انتظار کرتی رہی مگر کہانی کا کچھ پتا نہیں چلا اور پتہ کبوں تو دو ڈھائی ماہ میں، میں یہ بھول بھی گئی تھی کہ..... میں نے کہانی کے نام پر کچھ لکھا بھی تھا۔

اُس دن میری Birthday تھی کہ شام کے وقت ڈاک آیا تھا اور پھر گیٹ پر جانے والے بھائی نے آکر مجھے بتایا تھا کہ تمہارے نام پر ڈاک آئی ہے۔

میں حیران و پریشان تھی کہ مجھے کس نے کیا بھیجا ہے؟ مگر جب وہ خاک لٹا دیکھا اور کھولا تو اتنی زیادہ خوش ہوئی تھی کہ بتا نہیں سکتی، میرے سامنے ادارہ ”سچی کہانیاں“ سے بھیجا گیا وہ شمارہ موجود تھا جس میں میری پہلی کہانی موجود تھی، بس پھر تو لکھنے کا سلسلہ شروع ہو گیا جواب تک جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔

”سچی کہانیاں“ میں جب بھی میری کہانی یا

پھر کوئی تحریر لگتی ہے، سب میری بہت تعریف کرتے ہیں جو مجھے بہت اچھا لگتا ہے بلکہ سب مجھ سے پوچھتے ہیں کہ صائمہ.....! کچھ اور لکھا؟ اور جب میں نہیں لکھتی ہوں تو ماما کہتی ہیں کہ لکھو اور پھر ماما ہی میری وہ تحریر پوسٹ کرواتی ہیں۔

میں صرف ”سچی کہانیاں“ کے لیے ہی لکھتی ہوں اور ہمیشہ ”سچی کہانیاں“ اپنی پاکٹ منی سے خریدتی ہوں۔ میری وجہ سے ہی میرے گھر والے، میری فرینڈز، کزنز اور میری رضائی بہن ماریہ بھی ”سچی کہانیاں“ پڑھنے لگے ہیں اور ”سچی کہانیاں“ کو بہت پسند بھی کرتے ہیں۔

اب تک تو زندگی بہت اچھی گزری اور گزر رہی ہے مگر چند ماہ پہلے میری پیاری ماما کو کینسر جیسا موذی مرض لاحق ہو گیا ہے، سو سارا گھر پریشان ہے۔ ماما کا علاج جاری ہے اور ہمیں اللہ پر بہت بھروسہ ہے۔ انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ تمام پڑھنے والے بھی اُن کی صحت کے لیے دُعا کریں۔

آخر میں، میں ناصر انکل، منزہ آئی اور ”سچی کہانیاں“ کے تمام اسٹاف کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جنہوں نے مجھے اس قابل سمجھا کہ..... ناصر میری تحریروں کو ”سچی کہانیاں“ میں جگہ دی بلکہ انہیں سنوارا بھی!..... اور اب اپنے اس زیت تارے سے اجازت کہ..... زندگی کو تو چلتے ہی جاتا ہے چاہے میں چاہوں یا نا چاہوں..... تمام لوگوں سے درخواست ہے کہ مجھے ہمیشہ اپنی دُعاؤں میں یاد رکھیں! اللہ حافظ!

☆☆☆

غزل

جاں سے اپنی گزر گیا ہوتا
تم نہ ملتے تو مر گیا ہوتا

ہوں سلامت تبھی تو ہوں یکجا
ٹوٹتا تو بکھر گیا ہوتا

وہ تو مقتل میں سوگ تھا ورنہ
آج اپنا بھی سر گیا ہوتا

انتہا بے رخی کی کرنے میں
کاش میں آپ پر گیا ہوتا

ناہموں نے ذرا سی غفلت کی
ورنہ میں بھی سدھر گیا ہوتا

دردوں اس لیے تو اٹھتا ہوں
زخم ہوتا تو بھر گیا ہوتا

فرخ اظہار صدیقی

ارشاد علی ارشد

مکھنسی

حزین صدیقی کا خیال

جب حقیقت فسانہ بن جائے
کیا حقیقت کسی فسانے کی

خیال اور حقیقت کی قبر سے آزاد ایک مجھ پر لڑکی کی داستان، تیسری کڑی



خلاصہ

مکھنسی ایک نہایت ذہین و سمجھ دار اوروں سے مختلف سوچ، خیالات، نظریات اور نسبی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ دو بھائیوں اظہر اور مظہر ایک بہن سکھاں اور محبت میں نام کام غیر شادی شدہ چھوٹو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کالج فیلو سانول سے محبت ہو گئی ہے مکھنسی اس محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چوٹے کی دیوار کو اپنی نسبی طاقت سے پردہ آسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدین اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے!!

محبت اور عشق کی باتیں کرتی، عتیاں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی و اسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی مکھنسی سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے اس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ مکھنسی کے بھائی اظہر کی دوسری رواجی سے پہلے شادی کر دی جاتی ہے۔ مکھنسی اسی دوران سانول کے گھر اس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کالج سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راجیل اسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جا رہی ہوتی ہے تو چوہدری راجیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا باپ اس کی مفتی فاطمہ خالہ کے دیور سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا مکھنسی کا راستہ روک لیتا ہے۔ مکھنسی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن مکھنسی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اسے عزتی پر مکھنسی کو دھکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا ناچ ہوگا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے مکھنسی کو اغوا کر کے اس کی کوشی کی شکل میں موجود حجرے میں پھنچا دیتے ہیں۔

(اور اب آگے پڑھے۔)

میں کچھ دیر میں ہی چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں پہنچ گئی تھی۔ یہ نام کا حجرہ ایک بہت بڑی کوشی کی شکل میں تھا۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے روایتی رعب و دبدبہ کے ساتھ مہری پر براجمان تھا۔ سر پر پگڑی سفید کلف شدہ کاشن کا سوٹ اور پاؤں میں سفید تلے کا کتھڑے دونوں ہاتھ تکیوں پر پھیلائے ہوئے اس نے میری طرف طنز بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ دو بندے اس کا کندھا دبا رہے تھے۔ یہ بھی چوہدریوں کی روایت میں شامل ہے ورنہ تو اتنا اور مضبوط افراد راہاتھ کو دبا دیں تو چوہدری بلبلٹا اٹھے۔ کمرے میں جا رہا کچھ گن مین باادب با ملاحظہ کی کیفیت میں کھڑے ہوئے تھے۔ یہ پر وٹو کول بھی روایتی رعب و دبدبہ کے لیے کیا گیا تھا ورنہ میرا دلنگر میں چوہدری اللہ رکھا کی مرضی کے بغیر جڑیا بھی پر نہیں مار سکتی ہے مگر آج اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے یہ خود میں بھی نہیں جانتی ہوں۔ چوہدری مجھے عیار اور چمکیلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے انگ انگ میں فتح کا احساس بلکورے لے رہا تھا۔ اس کی فتح کا تو ازن بس یہیں تک تھا۔ چوہدری اللہ رکھا کی بڑی بڑی موچھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ بوڑھے چہرے پر خباثت واضح دیکھی جا سکتی تھی۔ کوئی اس کی بیٹی کو یوں مردوں کی محفل میں لاکھڑا کرے تو چوہدری اسے کچا جبا جائے مگر مجھے اپنی محفل میں بے بس کھڑا ہوا دیکھ کر اس کی خبیثت آنکھوں میں چمک گہری ہوئی جا رہی تھی۔

مکھنسی، تو نے چوہدری اللہ رکھا کا ہاتھ روکا تھا؟ چوہدری اللہ رکھا کا اٹھا ہوا ہاتھ آج تک کیسے نے (کسی نے) نہیں روکا۔ میں چاہتا تو تیرے اس خوبصورت جسم کو لی راں لی راں (کپڑے کے ٹکڑے) کر دیتا اور تیرے جسم کے انہوڑے (اپنے) پالتو کتے چھوڑ دیتا مگر اس نون پھلوں (اس سے پہلے) تجھے ناچتا ہے میرے سامنے مجرہ کرتا ہے کیونکہ تو بہتوں سونہری کڑی ہے۔ (بہت خوبصورت لڑکی ہے۔)

میں نے چوہدری کو کوئی جواب نہیں دیا میرا ذہن بڑی تیزی سے چل رہا تھا۔ میں یہاں سے بھاگ جانے

کی تدبیریں سوچ رہی تھی۔ کمرے میں ٹوٹل سات افراد موجود تھے۔ دو چوہدری کے کندھے دبا رہے تھے دو دائیں طرف سر دو بائیں طرف کی دیواروں کے ساتھ مستعد کھڑے ہوئے تھے۔ خارجی دروازہ میرے عقب میں تھا اور چوہدری کی مسہری جس پر وہ بیٹھا ہوا تھا میرے بالکل سامنے تھی۔ اچانک چوہدری نے ایک آدمی کو آنکھوں سے اشارہ کیا اور چھن چھن کرنا ہوا گھنگروؤں کا جتھہ میرے قدموں میں آگرا۔

میں نے چوہدری اللہ رکھا کے چہرے کی طرف دیکھا پتا نہیں ایسے آدمیوں کو اللہ تعالیٰ زمین پر اتنی ڈھیل کیوں دیتا ہے جنہیں ماں بہن کی تیز نہ ہوا نہیں اس دھرتی کا بوجھ زیادہ دیر تک بننے نہیں دینا چاہیے۔ چوہدری نے حقے کی منہ میں ڈالی بڑبڑو بڑو حقے کے پانی سے ابھرنے والی آواز میری ساعت میں زہر گھول رہی تھی۔

چوہدری اللہ رکھا نے لمبا سانس لے کر چہرہ اوپر کی طرف اٹھایا اور سارا دھواں پھونک مار کر باہر نکال دیا۔ دھواں کے اٹھنے مرغولے میں چوہدری کا چہرہ مزید بھیانک ہو گیا تھا۔ چوہدری نے گھنگروؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”پہن لے چھوری..... بہت دنوں سے میرے حجرے میں کوئی حجرہ نہیں ہوا سا زندے تو نہیں ہیں مگر نور جہاں کے گانے کا بندوبست کر رکھا ہے میں نے۔“ میں نے گھنگروؤں کے جتھے کو دیکھا مجھے یوں لگا جیسے یہ چھوٹے چھوٹے گھنگروں کے بے شمار ہم جنہیں میں نے ہاتھ لگایا تو پھٹ جائیں گے۔

”چوہدری اللہ رکھا تمہاری دو بیٹیاں ہیں ناں، بچیوں میں تمہاری حویلی میں میں تمہاری بیٹی ہاجرہ کے ساتھ کھیلنے کے لیے بھی آئی تھی۔ جب میں اٹھ نو سال کی ہوئی تو اس پر پابندیاں لگ گئیں پھر وہ بڑی بڑی پگڑیوں اور بندوتوں کے سامنے میں باہر نکلی تھی۔ مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے۔ ایسا کروا سے بھی بلا لیا ہم دونوں سیلیاں مل کر یہاں حجرہ کر رہی گی۔“ میری بات مکمل ہوئی تو چوہدری یوں اچھلا جیسے اس کی مسہری میں بم پھٹ گیا ہے۔ اس کی بڑی گھٹی موچھوں میں زلزلہ آ گیا تھا چہرہ غصے سے سرخ ہو کر بھیانکی کی ساری حدیں پار کر چکا تھا۔ میں نے دیکھا غصے کی وجہ سے اس کا وجود رز نے لگا ہے۔

اس نے حلق کے بل چیختے ہوئے کہا۔ ”گھنگرواٹھا اور ناچ..... تیری اوقات میرے سامنے تانے کی ہے اپنی اوقات سے باہر نہ نکل۔ جب تو نچ نچ کے تھک جائے گی اور میرے قدموں (قدموں میں) گر جائے گی تب تجھے تیری اس گستاخی کی سزا دوں گا۔ گھنگرواٹھا اور نہ انہیں دیکھ رہی ہے میرے ایک اشارے پر تیرے جسم کو کتوں کی طرح بھینچھوڑ کے رکھ دیں گے.....“ چوہدری نے اسلمہ بردار آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ماحول کی کشیدگی کی وجہ سے اس کے اعصاب تن گئے تھے۔

میں نے سوچا رزق کمانے کے تو بہت سے ذرائع ہیں۔ انہوں نے کون سا ذریعہ اپنایا ہے؟ اپنی ماں بہن کی عزت کے رکھوالے دوسروں کی عزت لٹتے دیکھ کر خاموش کھڑے رہتے ہیں۔ میں نے جھک کر گھنگروؤں کا جتھہ ہاتھوں میں اٹھایا۔ چھن..... چھن..... گھنگروؤں کی آوازیں میرے کانوں پر ہتھوڑے برس رہی تھیں۔ میں انہیں دیکھ نہیں رہی تھی بلکہ نفرت سے گھور رہی تھی۔ ”میری پکار پر یہاں کوئی مجھ بن قائم نہیں آئے گا۔ آج کے سارے محمد بن قاسم اپنی اپنی ضرورتوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔“ میں نے جی سے سوچا مگر میں حجرہ نہیں کر سکتی۔ میں عزت دار گھرانے کی باجی لڑکی ہوں۔ میں نہ بخری ہوں نہ طوائف..... میرے ابا نے ساری زندگی عزت کو ٹھوٹھ خاطر رکھا ہے۔ میں ناچ کر اس کی عزت کا جنازہ نہیں نکال سکتی۔ میرے دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگا تھا۔ ہوا کے تیز جھکڑ چلنے لگے تھے۔ بھی بھی قسمت ہمیں کوئی فیصلہ کرنے کے لیے چند لمحے دیتی ہے

انہی چند لمحات میں اچھا ہو جاتا ہے یا پھر بہت ہی برا مگر میں نہیں جانتی میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ اچھا ہے یا برا میں نے پوری قوت سے بازو گھما کر گھنگروؤں کا جتھہ چوہدری کی طرف پھینک دیا جنہیں چھن چھن کر تیز آواز پیدا کرتا ہوا جتھہ سیدھا چوہدری اللہ رکھا کی لمبی ناک کے ساتھ زور سے ٹکرایا۔ چوہدری اللہ رکھا کی حویلی میں یہ پہلا دھماکا تھا جس کی گون اور تباہی بہت زیادہ تھی یہ دھماکہ سیلنگروں گھنگروؤں نے نل کر کیا تھا۔ چوہدری کی ناک سے خون ابل پڑا تھا اور چہرے کی کچھ جلد بھی پھٹ گئی تھی۔ اس نے جتھہ کا کھایا اور مسہری سے نیچے پیچھے کی طرف گر گیا۔ کسی کو بھی اس سچویشن کا تصور نہیں تھا۔ چند لمحے سب کو سانس سونگھ گیا اچھا دبیہائی محافظ جن کی حیثیت بالوتوں سے کم نہ تھی سارے چوہدری کی طرف بھاگ پڑے۔ انہیں حملہ آور کو پکڑنے کی ٹریننگ نہیں دی تھی تھی بس ہاتھوں میں رافٹلین تھا کر رعب جھاڑنے کے لیے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ سارے چوہدری کے گرد جمع ہوئے تو میرے لیے بھاگ جانے کو میدان خالی تھا۔ میں نورانی اور دروازے کی طرف دوڑ لگا دی۔ دروازہ پار کرتے ہوئے میرے کانوں سے چوہدری اللہ رکھا کی پھنکارنی ہوئی آواز گرائی۔

”ارے حرام زادو! میٹوں چھڈو اس کتیا نوں پکڑو۔“ (حرام زادو! مجھے چھوڑو اس کتیا کو پکڑو.....) ساتھ ہی چوہدری نے انہیں ماں کی موتی سی گالی دی۔ میں نے بھاگنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کمرے سے نکلتے ہی میں بائیں جانب دیوار کی جڑ میں بیٹھ گئی۔ اس طرف راہداری بند تھی۔ چوہدری کے پالتو کتے زنانے کی طرح باہر نکلے اور ٹھکا ٹھک ٹھک منہ اٹھائے دائیں جانب بھاگتے چلے گئے۔ نہ کسی نے بائیں جانب دیکھا اور نہ سوچا۔ آدھے منٹ سے باہر نکلنے والی لڑکی پچاس میٹر لمبی راہداری پار کرتے کیسے غائب ہوگی؟ میں واپس کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں تو ہا چوہدری زخمی شیر کی طرح اضطرابی حالت میں بیچ و خم کھا رہا تھا اور تھیلیوں پر کے مارتے ہوئے ٹہل رہا تھا۔ جب میں کمرے میں داخل ہوئی تب اس کی میری جانب پوچھی تھی۔ میں نے ایک طرف پڑا ہوا برا اگلدان اٹھا کر چوہدری کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”چوہدری اللہ رکھا..... اللہ سے اپنے لیے معافی مانگ لے۔“ میری آواز پر وہ پھرتی سے پلٹا۔ اگر حیرانگی سے موت ہوتی تو شاید وہ یوں مجھے اپنے سامنے دیکھ کر حیرت سے مر جاتا۔ اس کے لب کچھ کہنے کے لیے تھر تھرا رہے تھے۔ میں چل کر اس کے بالکل قریب سامنے چلی گئی۔

”گاؤں کی ہر لڑکی تیری زر خرید غلام نہیں چوہدری اللہ رکھا تو نے چند مہر داد مگروالوں پر بہت ظلم ڈھالیے اب تیرے حساب کا وقت آچکا ہے۔ یہاں بھی اور وہاں بھی۔“ میں نے آسمان کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ حیرت ابھی تک چوہدری کے چہرے سے ہٹی نہیں تھی اور جب تک حیرت رنج ہوتی ہماری بھرم گلدان اس کے سر سے نکل چکا تھا۔ اس کے منہ سے تیز اورغ..... کی آواز نکلی۔ پہلے وار سے چوہدری کی پگڑی گر چکی تھی دوسرے وار سے چوہدری بھی لہر کر پیچھے پڑے ہوئے صوفے پر جاگرا۔ میں نے بھاگ کر دیوار پر لٹکی ہوئی رائفل اتاری اس میں کارتوس چیک کیے رائفل لوڈ تھی چوہدری اللہ رکھا صوفے پر سیدھا گرا ہوا تھا میں نے رائفل کا بٹ اس کے دونوں پاؤں میں تھپتھپایا اور رائفل کی نال چوہدری کی تھوڑی کے نیچے رکھ دی۔ چوہدری کے پاؤں سے جوتے پہلے ہی نکل گئے تھے۔ میں نے اس کا انگوٹھا ٹریگر پر رکھا اور چوہدری کا جوتا اٹھا کر اس کے پاؤں پر ضرب لگائی ضرب لگنے سے انگوٹھا دب گیا۔ سنسان حویلی میں جی ایس کے کارتوس نے ایک دھماکا کر دیا۔ کارتوس چوہدری کے چہرے کا حلیہ بگاڑ کر باہر نکل گیا تھا۔ اب حویلی میں ہنگامہ بچ اٹھا تھا۔ میں فوراً باہر نکل کر راہداری

کے ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔ کمرہ بالکل خالی تھا اور میرے لیے بہترین پناہ گاہ تھی۔ تھوڑی دیر میں ہی بھاگنے اور تیز باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔

”اُوئے چوہدری کے کمرے سے آواز آئی ہے۔“ باہر سے کسی شخص نے پکارا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا، بہت سے لوگ بھاگتے ہوئے چوہدری کے کمرے کی جانب جا رہے تھے، کچھ دیر بعد آوازیں آنا بند ہوئیں۔ میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا، امداداری خالی تھی یقیناً سب لوگ چوہدری کے کمرے میں جمع ہو چکے تھے۔ میں جلدی سے باہر آئی اور اطمینان سے حویلی سے باہر نکل آئی۔ اُس حویلی سے جس کی اونچی فصیلوں سے کوئی لڑکی اپنی مرضی سے باہر نہیں نکل سکتی تھی۔

میں اپنے گھر میں داخل ہوئی تو پریشانی کا طوفان وہاں بھی تباہی مچا رہا تھا، وہ میرا ممکنہ جگہ معلوم کر چکے تھے ابا کے سامنے میری حاضری ہوئی تو مجھے پتا چلا احساس نام کی چیز تھی پاورٹل ہے، میں جس نے گاؤں کے ظالم چوہدری کو بلا خوف و خطر موت کے گھاٹ اتار دیا، ابا کے سامنے خوف کے مارے کانپ رہی تھی۔ مجھے احساس تھا یہ میرا سخت مزاج ابا ہے جس نے ہمارے اکیلے گھر سے باہر جانے پر پابندی لگا رکھی تھی مگر یہ غلطی کر بیٹھی تھی اور اس کی سزا بھی بھگت چکی تھی اور کچھ ابھی باقی تھی۔

چوہدری اللہ رکھا کا قتل معمولی بات نہیں تھی اس سانحہ نے لوگوں کو سکتے میں ڈال دیا تھا۔ لوگ چوہدری اللہ رکھا کے نام سے تھر تھر کانپتے تھے، دہشت اور خوف کی علامت چوہدری اللہ رکھا کو قتل کر دیا گیا، وہ بھی رحیم اللہ ترکان کی بیٹی مہسنی نے..... یہ خبر جنگل میں آگ کی طرح چنڑ مہر دادنگر کے علاوہ اردگرد کے سینکڑوں دیہاتوں میں پھیل گئی۔ جب پولیس والوں نے مجھے گرفتار کیا تو لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم وہاں جمع ہو گیا۔ مہر دادنگر کے سارے مرد اور عورتیں تو جمع ہی تھے اردگرد کے بہت سے دیہاتوں کے لوگ بھی آکھڑے تھے۔ وہ اس لڑکی کی جھلک دیکھنے کو جمع تھے جس نے چوہدری اللہ رکھا جیسی قد آور شخصیت کو قتل کیا ہے۔ جب مجھے وین میں بٹھایا جانے لگا تو میں نے قریب ہی کھڑی ہوئی صفیہ ماسی سے کہا۔

”ماسی ذرا ادھر آنا۔“ وہ میرے قریب آئی تو میں نے دونوں ہاتھ اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے ہاتھوں سے چوڑیاں نکال دو ماسی..... سنا ہے، ہتھکڑیاں مرد کا گناہ ہوتی ہیں مرد کا یہ گناہ میرے ہاتھوں میں ہے اس لیے عورتوں کا گناہ ان مردوں کو پہنادو۔“

صفیہ ماسی نے میرے چہرے کی طرف دیکھا، اس کی بوڑھی آنکھوں میں پانی کے قطرے تھے۔ چوڑیاں اتارنے کے بعد اس نے ایک نظر مجمع کو دیکھا اور پھر پوری قوت سے چوڑیاں ان کی طرف پھینک دی تھیں۔ میں نے چیختے ہوئے کہا۔

”جتنے مرد کھڑے ہو، سارے پہن لو۔ دوسروں کا تماشا دیکھنے کے لیے کیسے اکٹھے ہو جاتے ہو مگر اپنی عزت جان و مال اور زندگی کو یوں ہی چوہدریوں، ڈیروں اور سرمایہ داروں کے پاس رہن رکھے رکھنا، کبھی اپنے حقوق کے لیے آواز نہ اٹھانا، منٹے رہنا مگر چپ رہنا۔ تماشوں کے لیے ایک ہو جانا مگر اپنے حق کے لیے کبھی بھی ایک نہ ہونا۔ لعنت ہے تم مردوں کی زندگیوں پر.....“ کہہ کر میں وین میں چڑھ گئی۔ جمعیت میں چلا گیا تھا ویسے ہی جیسے اندر میرے گھر والے سکتے کی کیفیت میں تھے۔ وین ان سے دور ہو رہی تھی، کھیت کھلیاں جانور انسان گاؤں اور گاؤں والے پیچھے ہٹ رہے تھے۔ میری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہونے والا تھا۔

گھر میں کسی کو بھی وقت نہیں ملا تھا کہ وہ مجھ سے لپٹ کر رو لیں۔ ابا کے سامنے پیشی ہوئی تو ابھی باز پرس جاری تھی کہ پولیس گاڑی کے سائرن گونج اٹھے تھے۔ اس کے بعد سارے مراحل غلبت میں طے ہوئے۔ گھر والے حیرت کے مارے اپنی جگہ سے حرکت ہی نہ کر سکے اور پولیس والے مجھے تھانے لے آئے۔ دوسرے دن ملاقات کو آئے تو انہیں موقع ملا۔ آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں میں تھانے کا کمرہ ڈوب گیا۔ امی پھوپھو، سکھان پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ میں لوہے کی موٹی سلاخوں کو پکڑے ہوئے انہیں دیکھ رہی تھی۔ میری آنکھوں کی ندی ابھی خشک تھی، بس میں امی سے لپٹ جانا چاہتی تھی مگر سچ میں موٹی لوہے کی سلاخیں تھیں۔ میں نے دیکھا، مظہر بھائی دانت بھینچے کسی گہری سوچ میں ان کے پیچھے کھڑا ہے۔ وہ میرے پاس نہیں آیا تھا۔ اس کے چہرے پر سارا خون منجمد تھا۔ وہ آنسوؤں، جذبات اور نجانے کیا کچھ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”امی..... ابا کیسا ہے؟ اس کی طبیعت ٹھیک تو ہے؟ ابا مجھ سے ملنے کیوں نہیں آیا؟“ میں نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات پوچھ ڈالے۔ ”مجھے سب سے زیادہ فکر ابا کی ہے۔“ امی نے دوپٹے سے آنسو پونچھے اور بولی۔ ”مجھی کل (چار پائی لے لی۔) لی ہے تیرے ابا نے۔ نہ کسی سے بات کرتا ہے نہ کسی کی سنتا ہے۔“ امی اس سے آگے کچھ نہ کہہ پائی۔ ابا کی باقی کہانی ان کے آنسوؤں نے مجھے سنا دی۔

میں نے قریب کھڑی ہوئی پھوپھو سے پوچھا۔ ”اظہر بھائی نہیں آیا؟“ ”بھائی کے پاس ہے۔“ پھوپھو نے جواب دیا پھر میرے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”مکھنی، یہ تُو نے کیا کر دیا؟ تُو تو سکھان کے ساتھ بڑی بڑی باتیں کرتی ہے، خود ان پر عمل کیوں نہ کر سکی؟“ ”پھوپھو..... میں.....!“

”دھی.....! (بیٹی.....!) کہتے ہیں، جل کی مچھلی، جل میں ہی بھلی۔ ہم غریب لوگ (لوگ) ہیں۔ سر نیچے کر کے زندگی گزارنا ہی ہماری بھلائی ہے۔“ پھوپھو نے بڑی عجیب بات کہہ دی تھی۔ وہ پھوپھو جو میری باتیں سن کر جھاگ جایا کرتی تھی، آج نجانے کہاں سے اتنی گہری باتیں سیکھ آئی تھی۔ میں خاموش رہی تو وہ بولی۔ ”دھی.....! یہ روپے پیسے والے لوگ بری عادتیں اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ چوہدریوں سے مگر غریبوں کا کام نہیں ہے۔“

”پھوپھو.....! میں سب کچھ کر سکتی ہوں، ہر ظلم و ستم برداشت کرنے کی طاقت ہے مجھ میں اور میں یہ بھی جانتی ہوں دریا میں رہ کر مگر کچھ سے بے خبر نہیں رکھا جا سکتا مگر پھوپھو.....! میں کنجری بن کے مجرہ نہیں کر سکتی۔ میں.....!“ میری نظر اچانک مظہر بھائی کی طرف اٹھی۔ مجھے لگا جیسے میری باتیں سن کر اس کے اندر ایک طوفان اٹھ رہا ہے۔ وہ بار بار اپنی مٹھیاں سختی سے پیچ رہا تھا اور کھول رہا تھا۔ میں خاموش ہو گئی کیونکہ مظہر بھائی خاموش سمندر کی طرح چپ کھڑا ہوا تھا اور خاموش سمندر کی بہت بڑے طوفان کی علامت ہوتا ہے۔

وہ لوگ چلے گئے، مہر دادنگر کے حالات دگرگوں تھے۔ چوہدری اللہ رکھا کی موت کے بعد اس کی جگہ بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے لے لی تھی۔ مہر دادنگر کے باسیوں کا خیال ہے چوہدری اللہ رکھا اگر بھیرٹیا تھا تو چوہدری مشتاق بھیرٹیا بھی ہے اور درندہ بھی، عوام الناس کو اس کے آنے سے اندازہ ہو جاتا ہے چوہدری

مشتاق اب کمال کھلائے گا۔ اس کا بھائی چوہدری راجیل بھی انہی خصلتوں کا مالک ہے۔ مظہر بھائی کی وجہ سے میں نے سکھاں سے چوہدری راجیل کے بارے میں کچھ سوال نہیں کیا نہ ہی سانول کے بارے میں کچھ پوچھ سکی۔ چند دنوں بعد مجھے پھر اطلاع دی گئی۔ ”ارے لڑکی تیری ملاقات آئی ہے۔“ میں جو اداس اور پریشان بیٹھی ہوئی تھی، اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ملاقات کے لیے تنہا سکھاں کو دیکھا تو دل میں کئی قسم کے دوسوے اٹھنے لگے۔

”سکھاں، کس کے ساتھ آئی ہو؟“

”سانول کے ساتھ۔“ سکھاں نے جواب دے کر مجھے حیران کر دیا۔

”سا..... سانول کے ساتھ..... کہاں ہے سانول؟“

”تھانے دار کے کمرے میں بیٹھا ہے۔ مجھے تم سے اکیلے میں بات کرنی ہے مکھنی، اس لیے اسے وہاں بٹھا کے آئی ہوں۔“

”سکھاں تو سانول کے ساتھ آئی کیسے؟ ابا! امی! بھائی سب ٹھیک تو ہیں؟“

”سب ٹھیک کیسے ہو سکتا ہے مکھنی، تو حوالات میں بند ہے اور گھر میں سب ٹھیک ہیں؟“

”کیا ہوا سکھاں؟ تو مجھے بہت پریشان لگ رہی ہے؟“

”مکھنی، چوہدری مشتاق نے پیغام بھیج دیا ہے۔ اگر سکھاں کا رشتہ چوہدری راجیل کے لیے قبول ہے تو ہم مکھنی کو معاف کر دیتے ہیں یادیت کے قانون سے رہائی دلوادیتے ہیں۔“

”کیا.....؟“ میں نے حوالات کی سلاخوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو سکھاں؟ کیا انہونی بات ہے؟“

”چوہدریوں کو تھکان دیت کی رقم ادا کریں گے؟“

”مکھنی، اس کا کہنا ہے یہ رقم بھی ہمیں ادا کرنی ہے۔ ہمیں سکھاں کا نکاح چاہیے۔“

”سکھاں کا نکاح؟“ میں نے انتہائی کئی سے دہرایا۔ مجھے یوں لگا جیسے زہریلا تیر میرے دل کے آ رہا ہو گیا ہے۔

”مکھنی، وہ کہتا ہے، مکھنی کو جیل سے باہر لانا ہمارا کام ہے ورنہ وہ سیدھی پھانسی کے تختے پر لٹکے گی۔ یہ پہلا پیغام ہے جو چوہدریوں نے باعزت طریقے سے بھیجا ہے ورنہ ان کے ارادے مجھے بہت خطرناک لگتے ہیں۔“

”تو پھر سکھاں فیصلہ تو تم نے کرنا ہے، کیا سوچا ہے؟“

میرے سوال پر سکھاں کی آنکھیں پر نم ہوئیں۔ دانتوں سے ہونٹوں کو کاٹا اور تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ”اللہ کی قسم! مکھنی، تم مجھے سانول سے زیادہ عزیز ہو۔ میں اس کے ساتھ نکاح کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

سکھاں کی بات سن کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میرا دماغ چکرانے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر سکھاں کو پکڑ لیا۔ ”نہیں سکھاں، نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ جس پاک اللہ کی قسم تم نے کھائی ہے اسی پاک ذات کی قسم! میں مرجاؤں گی لیکن تمہیں قربانی کا بکرہ نہیں بننے دوں گی۔ اس زندگی سے موت بہتر ہے جو میری بہن کو زندہ لاش بنا کر توتوں کے آگے بھجھوڑنے کے لیے پھینک دے۔“ میں نے اسے جھنجھوڑا اور چیخ کر کہا۔ ”نہیں چاہیے مجھے ایسی زندگی، تمہیں تم؟“

”تو پھر پھانسی پر لٹکنے سے پہلے ابا کا جنازہ بھی پڑھ جانا۔“ سکھاں بھی جو اب چیخ پڑی تھی اور اس کی چیخ میری چیخ سے زیادہ بلند تھی۔ اس نے جھٹکا دے کر خود کو میرے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ ”پتا بھی ہے تمہیں تیری موت سے کتنے کو موت آئے گی؟ ابا چار پائی کا ہو کر رہ گیا ہے۔ وہ رحیم اللہ ترکھان جس کی غیرت کی مثالیں پورا مہر داد مگر دیتا ہے۔ آج اس کے کندھے جھک گئے ہیں، زندہ لاش تو وہ بھی بن گیا ہے، مکھنی، کداس کی بیٹی پولیس کی حویل میں ہے۔“

”مکھنی، مظہر بھائی نجانے کہاں سے پستول لے آیا ہے اس کے کندھے سے کلباڑی لٹکی ہوئی ہے اور ہاتھ میں پستول رہتا ہے۔ ساری ساری رات چھت پر جاگ کر کھلتا رہتا ہے کہتا ہے۔ ”رب کائنات کی قسم! کسی نے رحیم اللہ کے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا تو ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔“ اظہر بھائی کہتا ہے جب تک مکھنی حوالات سے باہر نہیں آتی، وہی نہیں جاؤں گا۔ بھابھی اسے مجبور کر رہی ہے کہ وہ جلدی چلا جائے، پورا گھر انتشار کا شکار ہے مکھنی.....!“

”مکھنی، یاد ہے تم نے مجھے کہا تھا، محبت پالے یا خاندان بچالے، بات میری سمجھ میں آگئی ہے مکھنی، میں اتنی خود غرض نہیں بن سکتی۔ اپنی محبت کے لیے پورے خاندان کو سولی پر نہیں لٹکا سکتی۔ میں چوہدری راجیل سے نکاح کروں گی تو جیل سے باہر آ جائے گی تو سب کو سکون مل جائے گا۔“ سکھاں نے مجھے لا جواب کر دیا۔ آج سکھاں نے ثابت کر دیا، وہ کاج وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں جاتی تھی وہاں سے کچھ لے کر آتی تھی۔

”سکھاں.....! مجھے پھانسی نہیں ہوگی۔ میں انشاء اللہ جلدی باہر آ جاؤں گی۔“

”مکھنی، ان جھوٹی تسلیوں سے نہ خود فریب کھاؤ ورنہ ہمیں دو۔ چوہدری اللہ رکھا کا قتل ہوا تیرے ہاتھوں اور چہرے ات آدمی اس بات کے گواہ ہیں۔“

”ایسی بات نہیں ہے سکھاں، لیکن ثبوت ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو؟“ سکھاں نے اختیار سلاخوں کے قریب کھسک آئی۔

”سکھاں! چوہدری اللہ رکھا مجھے اٹھا کر اپنے حجرے میں مجرہ کروانے کی غرض سے لے گیا تھا۔ وہاں چوہدری سمیت سات افراد موجود تھے۔ چوہدری اللہ رکھا نے میرے قدموں میں ٹھنگروؤں کا جھتھ پھینک کر کہا، اسے پہن کرنا چو۔ میں نے جواباً وہی جھتھ چوہدری کے منہ پر دے مارا۔ چوہدری اللہ رکھا زخمی ہو گیا اور میں وہاں سے بھاگ نکلی۔ اس کے بندے میرے پیچھے بھاگے تھے۔ میں حویلی سے نکل آئی تھی۔ بعد میں پتا چلا، چوہدری اللہ رکھا کا قتل ہو چکا ہے۔ جاتی ہو سکھاں، اسے کس نے قتل کا ہے؟“

”نن..... نہیں.....“ سکھاں میری باتیں پوری خوبیت سے سن رہی تھی۔

”چوہدری اللہ رکھا کو اس کی غیرت نے قتل کیا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں مکھنی.....!“

”سکھاں! چوہدری اللہ رکھا کو ایک نازک لڑکی اس کے بندوں کے سامنے ذلیل و رسوا کر کے بھاگ نکلی تھی، وہ ٹھنگرو جو لڑکی کے پاؤں میں بندھے ہونا چاہیے تھے، وہ چوہدری کے چہرے پر برس پڑے، یہ بات چوہدری کی

غیرت کے خلاف تھی اس لیے اس نے اپنے بندوں سے شرمندگی چھپانے کے لیے خودکشی کر لی.....“
”خودکشی.....“

”ہاں سکھاں.....! اگر پولیس دیانت داری سے تفتیش کرے اور آلہ قتل برآمد کر کے فنگر پرنٹ لے تو مجھے یقین ہے قاتل میں نہیں خود چوہدری اللہ رکھا نکلے گا۔“

”مکھنی! اگر تو سچ بھی کہہ رہی ہے مگر ہوگا کیا؟ پورا تھانہ چوہدری کا ہے پوری تحصیل بلکہ ضلع بھر میں چوہدری اللہ رکھا کا سیاسی اثر و رسوخ ہے۔ اس کے جنازے میں صوبائی وزراء، ایم این اے اور ایم پی اے تک شرکت کرنے آئے تھے۔ کہاں چوہدریوں کا گھرانہ اور کہاں رحیم اللہ ترکان کی بیٹی!“

”سکھاں تم اللہ تعالیٰ کو مانتی ہو؟“ میرے سوال پر سکھاں نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

”ہاں مکھنی.....!“

”کتنے یقین کے ساتھ؟“

”اتنے ہی یقین سے جتنے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ مکھنی اس وقت میرے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔“

”تو پھر سکھاں کوئی بھی فیصلہ جذبات میں آ کر مت کرو۔ سنا ہے چوبیس گھنٹوں میں ایک وقت ایسا بھی ہے کہ فرشتے آسمان سے اتر کر پکارتے ہیں۔“ بے کوئی مانگنے والا اور اپنی بخشش کروانے والا؟“ آج رات خدا کو آزما کے دیکھوں گی۔ اس کے بعد تمہیں کھلی چھٹی ہے جو مرضی آئے کرنا۔“

سکھاں چلی گئی مگر میرے لیے سوچوں کے انبار لگا گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ آج کی رات آزمائش کی رات تھی۔ میرے ذہن میں مولوی محمد عمر کی باتیں گونج رہی تھیں۔ ایک دن میں چھت پرتنا بھی ہوئی تھی۔ مولوی صاحب جمعہ کی نماز سے پہلے تقریر کر رہے تھے۔ میں غور سے سننے لگی تھی۔ ”دنیا کے تمام رشتوں میں ماں انسان سے سب سے زیادہ محبت کرتی ہے۔ اگر رات کی تاریکی میں بھی ماں کو پکارو تو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھتی ہے اور کہتی ہے۔“ جی میرے لعل!“ پھر پکارو اور وہ پھر کہے گی۔“ بول میری جان!“ پھر پکارو اس پر کہتی ہے۔ ”میں سن رہی ہوں چاند!“ پھر پکارو وہ کہے گی۔ ”اب بولو بھی؟“ پھر پکارو وہ کہے گی۔ ”بولو ورنہ سو جاؤ۔“ پھر پکارو وہ تنگ آ کر کہے گی۔ ”پرے مر نہ خود سوتا ہے نہ سونے دیتا ہے۔“ مگر اللہ تعالیٰ میرا اور آپ کا اللہ اے پکارو۔ ”یا اللہ!“ وہ کہے گا۔ ”لبیک میرے بندے!“ پھر پکارو پھر پکارو اور پکارتے ہی رہو۔ وہ کہتا رہے گا۔ ”لبیک! لبیک!“ کیونکہ اے بندے! تو نے اللہ کو پکارا ہے جو حضور بھی ہے رحیم بھی ہے کریم بھی ہے۔ تو قیامت تک پکارے گا تو بھی وہ برا نہیں مانے گا۔ تو پکارتے پکارتے تھک جائے گا وہ لبیک کہتے ہوئے نہیں تھکے گا۔..... میں ایک ہی رات اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئی اور اگلی ہی شام وہ مجھ کو ہو گیا جس نے تاریخ ایک بار پھر پلٹ دی۔

مجھ سے تفتیش کرنے کے لیے شہر سے لیڈی انپکٹر شانہ کو بلا یا گیا تھا..... شانہ میانہ قد کی تیس پینتیس سالہ خوب رو عورت ہے، جسم فربہ مال تھا مگر اس کے جسم میں کشش بھی عکس بھی روایتی پولیس والوں جیسی بات بات پر گالی دینا اور رعب جھاڑنا اس کی عادت ہے مجھے اپنے کمرے میں بلا کر اس نے میرا سر تاپا جائزہ لیا، کمرے میں دو کاسیٹو بھی موجود تھے ایک اچھی عمر کا جبکہ دوسرا جوان آدمی تھا۔ شانہ میرا مکمل جائزہ لینے کے بعد بولی۔

”کلا شکوف، رائفل یا پستول چلانا ہر کوئی سیکھ لیتا ہے مگر ان سے بندہ مارنا ہر کسی کا کام نہیں یہ بڑے دل گردے کا کام ہے۔ تجھ جیسی لڑکی نے یہ کام کیا تو کیسے کیا؟“

”میں نے واقعی قتل نہیں کیا۔“

”تو چوہدری اللہ رکھا کو آسمان سے فرشتوں نے اتر کر گولی ماری ہے؟“ اس نے انتہائی غصے میں کہا۔ دیکھا جائے تو خوبصورت عورت کا غصہ خاص اثر نہیں کرتا۔

”تو سمجھتی ہے اسے میں نے گولی ماری ہے؟“ میں نے نارمل لہجے میں جوابا کہا۔

”مجھے یقین نہیں ہوں یقین ہے مجھے کیونکہ میرے پاس گواہ بھی ہیں اور ثبوت بھی موجود ہے بس تجھ سے اقرار کروانا ہے۔“

”اور اگر میں اقرار نہ کروں تو؟“

وہ میری بات سن کر کھڑی ہو گئی۔ ہاتھوں میں ڈنڈا اگھا کر بولی۔ ”میں مولا بخش کم ہی استعمال کرتی ہوں۔“ اس نے ڈنڈا میری آنکھوں کے سامنے لہرا کر کہا۔ ”تجھ جیسی لڑکی سے اقرار کروانا میرے لیے اٹل ہاتھ کا کھیل ہے کیونکہ مجھے یقین ہے جب تیری شلوار کے دونوں پانچے باندھ کر میں اندر چوہے چھوڑوں گی تو تو ان کا نوچنا برداشت نہیں کر سکتے گی یا پھر بدبو دار کمرے میں جس میں انسانی فضلے کے ڈھیر لگے ہوئے ہوں اس میں بھی دن نہیں گزار سکتے گی اور نہ ہی ان ہزاروں چیونٹیوں کا جسم پر ریٹینا برداشت کر سکتی گی جو میں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھ کر تمہارے جسم پر چھوڑنے والی ہوں.....“

”شانہ.....! عورت بن کے سوچو غیر اخلاقی سوچ اور عمل سے دور رہو۔“

”غیر اخلاقی عمل.....؟“ اس نے میری تھوڑی ڈنڈے سے اوپر اٹھائی۔ ”کیا خوب بات ہے ایک قاتلہ قانون والوں کو اخلاق سکھا رہی ہے۔ جانتی بھی ہو ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے؟“

”جانتی ہوں مگر انسان کا قتل حیوان کا نہیں۔“

”چوہدری اللہ رکھا انسان تھا حیوان نہیں۔“

”میری نظروں میں وہ حیوان تھا ساٹھ سال کی عمر میں سترہ برس کی لڑکی کو اٹھوا کر مجھ کو رواتا ہے تم بتاؤ یہ انسانوں والا عمل ہے؟“

میری بات سن کر وہ ہٹا گئی۔ غصے سے بولی۔ ”ہاں میں بہت کرتی ہے تو جب میں آپ سے باہر آؤں گی تو زبان گدی سے کھینچ لوں گی۔“ اس نے ایک موٹی گالی دی مجھے۔ پولیس والے ہوں یا والیاں گالی کو تھانے کی لوٹڑی سمجھتے ہیں۔

”میں حیوان کا قتل کروں تو پوری انسانیت کی قاتلہ ٹھہروں اور تو مجھے بار بار گالی دے رہی ہو تو تم کیا ہو؟ اتنی پورتم بھی نہیں ہوجتی خود کو سمجھ رہی ہو۔“

میری جرات پر وہ ششدر رہ گئی۔ آگے بڑھ کر اس نے مجھے بالوں سے پکڑ کر ایک زور کا جھکا دیا اور بولی۔

”کس بات کا زعم ہے تجھے؟ یہاں کوئی نہیں آئے گا تجھے چھڑانے والا۔“

”وہ آ رہا ہے مجھے اس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے اس کے سفید گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔“

”اچھا تیرے کانوں میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز گونج رہی ہے؟“ انپکٹر شانہ نے تسخرانہ انداز میں کہا پھر ہنسی اڑانے والے انداز کو جاری رکھتے ہوئے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ ”بھئی یہاں تو صرف کانٹیل بلشارت اور میاں علی کھڑے ہیں کیا یہ تمہیں چھڑائیں گے؟“

”تم دھیان سے سنو، کان لگا کے سنو، آوازیں آرہی ہیں۔“

”او بھائی بلشارت.....! یہ تو گئی کام سے!“

”میڈم لگتا ہے صدمے سے اس کا دماغ چل گیا ہے۔“

”دماغ خراب نہیں ہے میرا، سندھ میں ایک عرب عورت نے محمد بن قاسم کو پکارا تھا جس پر محمد بن قاسم نے لیک کہا تھا۔ یہاں بھی آئے گا۔“

”اوئے.....! کون سا محمد بن قاسم؟“ شانہ نے میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر پوچھا جیسے یقین کر رہی ہو میں نیند میں ہوں یا اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہوں۔

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ”وہی محمد بن قاسم جس نے اروڑ کے مقام پر پہلی مسجد تعمیر کی تھی۔“

”ہاتھ آگے کر۔“ شانہ میرے بالکل نزدیک آ کر بولی۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ کر کے کہا۔ ”لگی شرط اگر محمد بن قاسم ابھی یہاں نظر آ جائے تو تو بری۔“

”اور اگر نہ آیا تو میں اترتا ہوں پر دستخط کر دوں گی۔ اس کا اگلا جملہ میں نے پورا کر دیا تھا۔“

”منظور ہے۔“ میں بولی۔ ”اب لادھا مجھے!“

”دیکھنے سے پہلے سنو شانہ دھیان دے غور کر۔“ میرے لہجے میں یکدم پراسراریت عود آئی تھی۔ گھوڑے دوڑ رہے ہیں، مٹی اور دھول اڑ رہی ہے محمد بن قاسم کا لشکر بڑھ رہا ہے۔ غور سے سن گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں۔“

کمرے میں پراسرار خاموشی تن گئی گہری اور مہیب خاموشی میں بہت سے گھوڑے بھاگ رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے پورا ایک لشکر اس طرف بڑھ رہا ہے۔ آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ انپکٹر شانہ پر خوف سوار ہو چکا تھا۔ وہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔ پیچھے اس کی کرسی پڑی ہوئی تھی وہ کرسی سے لگرائی اور اس پر بے سدھ بے جان جسم کے ساتھ بیٹھ گئی۔ دونوں کانٹیل بلشارت بھی خوف سے دائیں بائیں دیکھ رہے تھے۔

”ادھر دیکھو سفید دیوار کی طرف۔“ میرے اشارے پر انہوں نے وہاں دیکھا تو ایک بے بدنیاں رہ گئے۔

حیرت اور خوف سے وہ زندہ لاشوں میں بدل گئے تھے۔ انپکٹر شانہ کرسی پر ڈھیر ہوئی پڑی تھی۔

مجھے اسکرین پر بجیلا جواں سال محمد بن قاسم نظر آنے لگا۔ ”دیکھو شانہ.....! یہ ہے جواں سال سپہ سالار محمد بن قاسم یہ اپنے چچا حجاج کے کہنے پر چھ ہزار شامی فوج کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہے۔ تمام جنگی ساز و سامان کے ساتھ محمد بن قاسم کا لشکر اللہ اکبر کے نعروں سے گونجتا ہوا دستیل کے مقام پر پہنچ گیا۔ فوج نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور اپنے آگے خندقیں کھود لیں اور بجنتیں نصب کر لیں اور یہ دیکھو انپکٹر شانہ وہ مشہور تاریخی بجنتیں عروس نے بائیں سو آدمی بچھڑ رہے ہیں اب اسی سے سنگ باری کی گئی۔ دیکھو..... دیکھو..... دستیل کا گنبد گلزے گلزے ہو کر پھیر چکا ہے۔“ اسکرین پر گرد و غبار کے بادل چھائے ہوئے تھے گرد و غبار چھٹا تو چند مسلمان کندگار رہے تھے وہ کندگار کفیل پر چڑھ گئے۔ جیسے ہی مسلمان شہر میں داخل ہوئے دستیل کا حاکم بھاگنے لگا۔ یہاں محمد بن قاسم

نے چھ ہزار مسلمانوں کو آباد کیا۔ ایک جامع مسجد تعمیر کی اور آگے بڑھ گیا۔ محمد بن قاسم کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نیرون سری ویدوں کی کامیابی کے بعد اب وہ دریائے سندھ پار کر کے راجہ داہر کے علاقے میں داخل ہو چکا ہے۔ یہاں اس کے مقابلے کے لیے راجہ داہر کی 60 ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج جنگی ہاتھیوں کے ساتھ کھڑی ہے۔ خون ریز معرکہ جاری ہے۔ دیکھو جذبہ ایماہی جو بھی کافر سامنے آیا کٹ گیا۔ راجہ داہر بھی مارا گیا اور سندھ پر محمد بن قاسم نے اسلام کا پرچم لہرا دیا اور اب محمد بن قاسم زمین پر گھٹنے ٹیک کر سینے پر ہاتھ رکھ کر اس عرب عورت سے مخاطب ہے جس نے خط میں اسے پکارا تھا۔ ”تو گواہ رہنا، روزِ محشر میں نے اپنا فرض پورا کر دیا اور اب سترہ برس کا بجیلا نوجوان سپہ سالار اپنی فوج کی امامت کر رہا ہے۔ اس کے بعد یہ آگے بڑھے گا اور شہر در شہر فتح کرے گا۔ راور، برہمن آباد، ساوندری، سندھ اور اروڑ کو زیرِ نگیں کرنے کے بعد ملتان کے راجہ گھور سنگھ کو لاکارا جس نے تھوڑی مزاحمت کی مگر شرمناک شکست سے دوچار ہوا۔ یہ ہے محمد بن قاسم! دھیان سے دیکھو لو کیونکہ اس کے ہاتھ میں گولہ ہے جو پھٹے گا تو تیرا تھانہ بھی اڑ جائے گا.....“ تھانہ اڑانے کے الفاظ میری زبان پر تھے کہ ایک زوردار دھماکہ ہوا اور وہ دیوار جس پر اسکرین روشن تھی ریزہ ریزہ ہو کر زمیں بوس ہو گئی۔

میں نے شانہ کی طرف دیکھا وہ تھر تھرا کانپ رہی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں سمجھ گئی وہ کتنے مضبوط دل کی مالک ہے۔ میں نے دونوں مرد حضرات کو دیکھا وہ جس حالت میں تھے اسی حالت میں کھڑے رہ گئے۔ حیرت، خوف اور دہشت کے آثار ان کے چہروں پر ثبت ہو کر رہ گئے۔ میں چلتی ہوئی شانہ کے پاس پہنچی۔ اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ وہ بری طرح چونک پڑی۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور کھڑی ہو کر مجھ سے دور کھسکے گی۔ اس کا مولائیش پہلے ہی اس کے ہاتھوں سے گر گیا تھا۔

”نن..... نہیں..... مجھے معاف کر دو۔“ اس پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ وہ حد درجہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ تھانے کا مزید علم بھی وہاں پہنچ آیا تھا اور پھویشن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کے ٹکڑے کافی دور تک پھیل گئے تھے۔ میری نظر شانہ کی پینٹ کی طرف اٹھی تو میرے قدم ٹھم گئے۔ اس کی پینٹ گیلی نظر آرہی تھی۔ مجھے شک ہوا اگر میں اس کے مزید قریب گئی تو وہ خوف سے مر جائے گی۔ میں نے اشارے سے ادھیڑ عمر کانٹیل کو بلا لیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ پینٹ مٹے اور بال چھوٹے ہوتے جاتے ہیں وہ بھی انہی مراحل میں تھا۔ ”ادھر آؤ۔“ وہ ڈرتے ڈرتے میرے قریب آیا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“

”جی..... بلشارت حسین.....!“

”گاڑی چلانا جانتے ہو؟“ وہ کچھ کہنے سے ہچکچا رہا تھا۔ میں نے تھکسانہ لہجے میں کہا۔ ”جھوٹ موت بولنا۔“

”صورت دیکھنا اپنے انجام کے خود ذمہ دار ہو۔“

”جی..... جانتا ہوں۔“ اس نے تھوک نلکتے ہوئے جواب دیا۔

”میرے کیس کا تفتیشی افسر کون ہے اور اس وقت کہاں ہے؟“

”جی انپکٹر درانی صاحب ہیں اور اس وقت اپنے گھر میں ہوں گے۔“

”تمہیں بتا ہے اس کا گھر کہاں ہے؟“

”جی مجھے بتا ہے میں اکثر ان کے گھر کا سودا سلف لے جاتا ہوں وہاں!“

”چلو جیب نکالو۔“ بشارت نے میرے حکم کی تعمیل میں جیب نکالی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”انکسٹر درانی ہمیں سامنے پا کر حیران رہ گیا۔“ مکھنہ..... مکھنہ.....! تو؟ یہاں میرے گھر؟“

میرے بولنے سے پیشتر ہی کاٹھیل بشارت نے اسے فرساری روداد سنا دی۔ اسے میں نے اشارہ کیا تھا اس لیے وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح بجنے لگا۔ وہ روداد سنا رہا اور تھانے دار درانی محو حیرت کبھی اس کا چہرہ دیکھتا اور کبھی مجھے دیکھنے لگتا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ پوری کہانی سننے کے بعد وہ ناقابل یقین لہجے میں بولا۔ ”اس کا چہرہ بتا رہا تھا اسے اس کہانی پر یقین نہیں آیا۔“

”اللہ کی قسم! سرجی.....! مجھے میری بیوی بچوں کی قسم! اس لڑکی کے اشارے پر دیوار روشن ہوئی۔ اس پر نظر آنے والا شخص محمد بن قاسم ہی تھا۔ میں نے ایک بچے کی کتاب میں ایک بار محمد بن قاسم کی تصویر دیکھی تھی۔“

”تھانے دار جی آپ کو یقین نہیں آتا تو اپنے تھانے فون ملا کے پوچھ لو آپ کے تھانے کی ایک دیوار اب بھی ٹکڑوں میں ٹکھری پڑی ہے۔“ میں نے دیکھا وہ موبائل نمبر ملانے لگا تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔ جب تک تھانے دار درانی کو یقین نہیں آ جاتا، میرا کام ہونا مشکل تھا۔ تین چار منٹ فون پر بات کرنے کے بعد اس نے ایک بار پھر مجھے حیرت سے دیکھا۔ اس بار اس کے تاثرات بدلے ہوئے تھے۔ مجھے محسوس ہوا اب مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ میں نے کہا۔

”تھانے دار درانی صاحب! چوہدری اللہ رکھا کو میں نے قتل نہیں کیا، اس نے خودکشی کی ہے.....“

”چھ گواہ ہیں تمہارے خلاف، آگہ قتل بھی برآمد ہو چکا ہے۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ یہ قتل نہیں، خودکشی ہے.....؟“

”آپ کو یقین دلانے ہی یہاں آئی ہوں ورنہ سیدھی حویلی جاتی۔ آگہ قتل سے فنگر پرنٹس لو درانی پھر دیکھ کس کے نکلے ہیں، میرے یا چوہدری اللہ رکھا کے؟“

”چوہدری اللہ رکھا دنیا جا چکا ہے اور اس کے فنگر پرنٹس ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔“

”دنیا جا چکا ہے تو اسے قبر سے واپس نکال اور فنگر پرنٹس لو ہاتھوں اور پاؤں دونوں کے تمہیں ثبوت مل جائے گا۔“ میں نے دانستہ لہجے میں ٹی پیدا کر لی تھی۔ ”اور گواہ!“ میں چند ساعتیں خاموش رہی۔ ”جن چھ گواہوں کی تم بات کر رہے ہو ان میں سے ایک نے بھی اپنی آنکھوں سے مجھے گولی چلاتے نہیں دیکھا۔ وہ بس میرے پیچھے بھاگے تھے۔ اس قتل کا عینی شاہد ایک ہی تھا تھانے دار درانی اور وہ مر چکا ہے۔“

”کون؟“

”چوہدری اللہ رکھا.....!“ میں نے دیکھا تھانے دار تذبذب میں کھڑا ہوا ہے۔ درانی کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی، سر کے بیشتر بال سفید ہو چکے تھے، اپنے حلیے اور چہرے سے وہ فرض شناس تھانے دار لگتا تھا مگر بعض دفعہ کئی فرض شناس آفیسر اوپر سے آنے والی کال کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں اس کے چہرے پر پریشانی بالکل واضح ہوگی۔

”میں نے اس کی ہولت کے لیے کہا۔“ ثبوت تم دیکھو تھانے دار، گواہوں کو میں دیکھتی ہوں۔“

میں نے بشارت کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”مہر داد نگر چل، مجھے چھ آدمی گواہی دیں گے کہ انہوں نے قتل ہوتے

اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ یہ محض قیاس آرائی ہے کہ قتل مکھنہ نے کیا ہے۔“ میں تھانے دار درانی کو ہکا بکا چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ کاٹھیل بشارت میرے ساتھ کی غلام کی طرح ہاتھ باندھ کر چل رہا تھا۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگا مگر اس پر رعب قائم رکھنے کے لیے خاموشی ضروری تھی۔ میں ایک خیال کے تحت واپس تھانے دار کے پاس چلی گئی۔ عقب میں بشارت بھی چلا آیا۔

”انکسٹر درانی.....! تم ہمارے ساتھ چلو۔“

”میں..... میں نہیں جا سکتا۔ یہ میرا کام نہیں ہے۔“ اس پر تھانے داری کا بھوت سوار ہونے لگا۔ ”تمہیں یوں کھلے عام چھوڑ دینا بھی میرے فرض کے خلاف ہے۔“

”سوچ لو درانی صاحب، ہمیں ایسا نہ ہو، میں تمہارے گھر سے قدم باہر نکالوں اور یہ گھر آگ کی لپیٹ میں ہو تو چیختا چلاتا رہے، پکارتا رہے پانی کے سمندر بہا دے مگر آگ نہ بجھے کیونکہ ہر آگ بجھنے والی نہیں ہوتی۔ کیوں وہ اپنے بیوی بچوں کو کولنگ بنا لے پر بھندہ ہو رہے ہو؟“

”صاحب.....! خدا کے لیے، چلیں، آپ کو خدا، رسول کا واسطہ یہ جو کہتی ہے، کر بھی سکتی ہے۔“ کاٹھیل بشارت نے باقاعدہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔ وہ عملی نظارہ دیکھ چکا تھا اس لیے اسے میری باتوں کا سو فیصد یقین تھا۔

میں مزید کچھ کہنے کی بجائے کمرے سے باہر نکل آئی۔ مجھے یقین تھا، تھانے دار درانی ضرور آئے گا کیونکہ اولاد انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ میں ابھی گاڑی تک نہیں پہنچی تھی، عقب سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ قدموں کی چاپ بتا رہی تھی، آنے والا ایک نہیں دو ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے تمام آدمیوں کو میں جانتی تھی کیونکہ وہ سب مہر داد نگر کے پاسی تھے۔ جب ہم گاؤں پہنچے رات کا بی ڈھل چکی تھی۔ دیہاتوں میں ویسے بھی رات سر شام اتر آتی ہے۔ ہمیں دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آئی، بس کتوں کے بھونکنے یا کسی ڈنگر (پالتو مویشی) کی آواز، کبھی کبھی سنائی دیتی تھی۔ مہر داد نگر میں داغی کے بعد سب سے پہلا گھر منظورے کا آتا ہے۔ منظور اچھ گواہوں میں شامل تھا۔ تو عدو والے دن وہ بھی میرے پیچھے بھاگا تھا۔ ہم سیدھا اس کے سر پر پہنچ گئے۔ وہ گھر سے باہر کھیتوں کے کنارے چار پائی لگانے لگی تان کر سو رہا تھا۔ چار پائی کے ساتھ ایک طرف رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ منظورے کے بیوی بچے یقیناً اندر گھر میں ہی سو رہے تھے۔ تھانے دار درانی نے چار پائی کو زور سے ہلایا۔

”او منظورے.....! اٹھ، تجھ سے ضروری بات کرنی ہے۔“ منظور اہڑ بڑا کراٹھ بیٹھا۔

آنکھیں کھولتے ہی اس نے بندوق اٹھائی تھی۔ ”کون ہے؟“ اس نے غور سے دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ پولیس پر نظر پڑتے ہی اس کی اکڑ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔

”منظورے! اسے جانتے ہو؟“

”جی..... جی..... تھانے دار جی.....! اسے کوثر (کون) نہیں جانتا، چوہدری اللہ رکھا نوں (کو) قتل کرنے والی رجیم اللہ رکھان کی دہی (بیٹی) ہے جی.....!“

”اوئے منظورے.....! ایک بات تو بتا؟“

”جی، پوچھو تھانے دار جی.....!“

”اس نے گولی تیرے سامنے چلائی تھی؟“ اگلے سوال پر وہ خاموش ہو گیا۔ تھانے دار دروانی نے اس پار انتہائی سخت لہجے میں پوچھا۔

”جواب دے، سانپ کیوں سوگھ گیا؟ سچ بتانا ورنہ تھانے لے جا کر تیری بھی پھینٹی لگاؤں گا۔“

”میں نے انپڑی اکھاں نال (اپنی آنکھوں سے) نہیں دیکھا تھانے دار جی.....!“

”تو پھر تھانے میں تو نے بیان کیوں دیا کہ گولی مٹھنی نے چلائی ہے؟“

”وہ جی..... فیقہ اور پو پو بھی یہی کہتے ہیں، گولی مٹھنی نے.....“

”تو اپنی بات کرا نہیں بھی میں دیکھ لوں گا۔“ تھانے دار دروانی کا لہجہ انتہائی سخت تھا۔

”منظورے.....! جب میں بھاگی تھی تو مجھے پکڑنے کے لیے میرے پیچھے کون کون بھاگا تھا؟“

”میں‘ فیقہ‘ پو پو‘ رمضان اسی سارے چھ ہندے تیرے پیچھے بھاگے تھے۔“

”تب چوہدری اللہ رکھا کے پاس کون تھا؟“

”میرے خیال میں کوئی نہیں تھا مگر اس (ہم) جب برآمدے میں پہنچے تو گولی کی آواز آئی تھی۔“

”تو پھر گولی مٹھنی نے کیسے چلائی ہے جبکہ ریم لوگوں کے آگے بھاگی تھی؟“ تھانے دار نے غصے میں

پھنکارتے ہوئے پوچھا۔ اس بار منظور اچپ رہا۔

ہم منظورے کے بعد فیقہ پو پو رمضان سب کے پاس وقتاً فوقتاً گئے۔ سب کا بیان منظورے جیسا تھا۔ کیس

میرے حق میں پلٹ گیا تھا۔ میں نے تھانے دار کو وہی کہانی سنائی جو کھان کو سنائی تھی۔ اس سے پہلے اس نے

میری بات سننا گوارا نہیں کی تھی مگر اب بات کچھ اور تھی شاید چشم تصور میں اس نے بیوی بچوں کو آگ میں

جلتا ہوا دیکھ لیا تھا اس لیے اب مستعدی سے کام بھی کر رہا تھا۔

”تھانے دار صاحب.....! میں تھانے چلتی ہوں‘ آپ گھر جاؤ‘ گواہ میں نے پیش کر دیئے ہیں‘ ثبوت لینا

آپ کا کام ہے۔“

”بڑی مشکل میں پھنسا دیا ہے بھئی.....!“ وہ دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔ مجھے اندازہ تھا وہ واقعی بڑی مشکل

میں پھنس گیا تھا۔

میں بشارت کے ساتھ تھانے واپس چلی آئی۔ تھانے میں جس نے بھی مجھے دیکھا ڈر اور خوف سے دو قدم

پیچھے ہٹ گیا۔ لیڈی انپکڑ شائبہ تھانے میں موجود نہیں تھی اسے بخار ہو گیا تھا اس لیے گھر چلی گئی۔

.....

مہر داد نگر والوں کے لیے یہ ایک معجزہ تھا۔ رحیم اللہ ترکان کی بیٹی مٹھنی نے چوہدری اللہ رکھا کو قتل کر

دیا ہے اس واقعہ کی بازگشت بہت دور دور تک سنی گئی تھی۔ اب وہ دوسرا معجزہ دیکھ رہے تھے رحیم اللہ

ترکان کی بیٹی باعزت بری ہو چکی ہے۔ گاؤں والوں کے لیے یہ انہونی تھی اور چوہدریوں کے منہ پر

طمانچہ!

(اس حیرت اور اسرار بھرے ناقابل فراموش سلسلے

کی چوتھی کڑی آئندہ ماہ پڑھے گا۔)

☆☆.....

۱۱ ام کلثوم شیخوپورہ۔

☆ بی بی ام کلثوم! تمہارا خط قابل اشاعت نہیں ہے۔ تمہاری ہدایت کے مطابق میں نے تمہارا نام بھی تبدیل کر دیا ہے۔ اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اس میں تم بھی برابر کی شریک ہو۔ اب اس لغزش کو اپنے ذہن کا بوجھ مت بناؤ۔ بس اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور ہر صورت میں سچ وقتہ نماز کی پابندی کرو کہ نماز انسان کو ہر برائی سے روکتی ہے۔ ہر نماز کے بعد ایک سبج استغفار کی کر لیا کرو اور اٹھتے بیٹھتے یا قیوم برحمتک استغیث کا ورد کرتی رہو۔ اللہ تبارک و تعالیٰ بہت غفور الرحیم ہے اور معاف فرمانے والا ہے۔ اگر اگلے ماہ تمہاری شادی ہو رہی ہے تو تمہیں کسی بھی طرح پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے کہ تمہارے ہونے والے شوہر کو علم ہو جائے گا۔ ایسا کوئی طریقہ نہیں ہے جس سے اسے علم ہو۔ بس تم خود پتہ قابو رکھو اور خود سے وعدہ کرو کہ آئندہ صرف اور صرف اپنے شوہر کی وفادار رہو گی۔ اللہ کرم فرمانے والا ہے۔ ہاں اگر تمہیں کچھ زیادہ ہی پریشانی ہے تو جوانی لقاؤ سبج کر مجھ سے تعویذ منگو۔ ایک بات اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ اس ضمن میں اپنی کسی ہمدرد دوست بہن حتیٰ کہ والدہ سے بھی بات مت کرنا۔

۱۱ رابعہ احمد کراچی۔

۵ محترم باباجی! السلام علیکم! میں نے آپ کے بارے میں ”سچی کہانیاں“ میں پڑھا تھا۔ میرے بھی کچھ مسائل ہیں۔ مجھے توئی امید ہے کہ آپ میری مدد فرمائیں گے۔ میں تین جوان بیٹیوں اور ایک بیٹی کی ماں ہوں۔ میرے شوہر سانس کے مریض ہیں اس لیے گزشتہ دو سال سے وہ بے روزگار ہیں۔ ان کی صحت اجازت ہی نہیں دیتی کہ وہ کوئی

کام کر سکیں۔ بیٹا سب سے بڑا ہے۔ وہ ایک بڑی غیر ملکی کمپنی میں ملازمت کرتا ہے لیکن اسے ماں باپ اور بہنوں کا کوئی خیال نہیں ہے۔ میری دو بیٹیاں پرائیویٹ اسکولوں میں جاب کرتی ہیں۔ میں خود بھی گھر میں سلائی وغیرہ کر کے کسی نہ کسی طرح وقت کو دھکا دے رہی ہوں۔ باباجی! اصل مسئلہ شوہر کی بیماری اور بیٹیوں کی شادی کا ہے۔ ان کی عمریں نکلی جا رہی ہیں۔ اول تو کوئی رشتہ آتا ہی نہیں ہے اور اگر کوئی بھولا بھلا کا رشتہ آ بھی جائے تو وہ ہمارے گھر کی حالت دیکھ کر دوبارہ ادھر کا رخ نہیں کرتا۔ میری بیٹیاں انتہائی خوب صورت اور سلیقہ شعار ہیں لیکن فی زمانہ لوگ شکل و صورت اور سیرت نہیں بلکہ دولت دیکھتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے مجھے اپنی بچیوں کے مستقبل کا خیال رہتا ہے۔ میرے شوہر الگ کڑھتے رہتے ہیں۔ مہنگائی کے اس دور میں دو وقت کی روٹی کھانا اور تن ڈھانپنے کے لیے معمولی کپڑوں کا بندوبست کرنا بھی ہم جیسے لوگوں کے لیے بہت مشکل ہے۔ میں نے کئی دفعہ اپنے بٹے کو سمجھایا اُسے زمانے کی اونچ نیچ سے بھی آگاہ کیا لیکن وہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتا ہے۔ اس کی تنخواہ بھی خاصی معقول ہے اور اگر وہ چاہے تو ہماری مدد کر سکتا ہے لیکن نہ جانے وہ کن چکروں میں پڑ گیا ہے۔ صبح گھر سے نکلتا ہے تو پھر رات گئے گھر میں داخل ہوتا ہے۔

اپنی تنخواہ کا زیادہ حصہ وہ اپنے لباس جوتوں اور پرفیوم پر خرچ کر دیتا ہے۔ باباجی! مجھ سے زیادہ بدلہ صیب بھی کوئی ماں ہوگی جس کا کوئی بیٹا موجود ہو اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے ترستی رہے۔ باباجی! میں بہت امید سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ خدارا مجھے مایوس مت کیجیے گا۔ لگتا ہے کسی نے بندش کر دی ہے۔ میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ میری بیٹیوں کی اچھے اور شریف



ماہِ رَجَبِ الْمَرْجَبِ

عزیزو.....!

رَجَبِ الْمَرْجَبِ کا مہینہ ان چار مہینوں میں سے ہے جن کے احترام میں کفار بھی لڑائی حرام سمجھتے تھے۔ جناب رسالت مآب ﷺ فرماتے ہیں۔ ”رَجَبِ الْمَرْجَبِ اللہ کا مہینہ ہے۔ شَعْبَانَ المعظم میرا اور ماہِ رَمَضَانَ المبارک میری اُمّت کے لیے استغفار کا مہینہ ہے۔ جو شخص ماہِ رَجَبِ الْمَرْجَبِ میں ایک روزہ بھی رکھے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا مستحق ہوگا۔“

حدیث شریف میں یہ بھی آیا ہے۔ ”جو شخص ماہِ رَجَبِ الْمَرْجَبِ میں تین روزے رکھے گا اللہ تعالیٰ اُس کو ہر روز لے کے عوض میں سال بھر کے روزوں کا ثواب عطا فرمائے گا اور جو آٹھ روزے رکھے تو خداوندِ عالم اُس کا حساب آسان فرمائے گا۔“

اگر کوئی روزہ رکھنے پر قادر نہ ہو تو پھر ہر روز ان تسبیحات کو سو مرتبہ پڑھے۔

سُبْحَانَ الْاِلهِ الْجَلِيلِ سُبْحَانَ مَنْ لَا يَنْبَغِي التَّسْبِيْحُ اِلَّا لَهُ سُبْحَانَ الْاَعَزِّ الْاَكْرَمِ

سُبْحَانَ مَنْ لَيْسَ الْعَزْوُ هُوَ لَهُ اَهْلُ

گھرانوں میں شادیاں ہو جائیں اور ہمارا بیٹا راہ راست پر آ جائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

☆ رابعہ بیٹی! تمہارا مسئلہ پاکستان کے ہر دوسرے گھر کا مسئلہ ہے لیکن اس رب رحیم کی ذات سے مایوسی کفر ہے اور یہ "بندش" کا لفظ ان ڈھونگی باباؤں اور بہروپیوں کی اصطلاح ہے جو لوگوں کو بے وقوف بنا کر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہے ہیں۔ رابعہ بیٹی! اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے ہر کام کا ایک وقت موعین ہوتا ہے۔ تم تمہاری بیٹیاں اور شوہر پہلے تو بچ وقت نماز کی پابندی کریں۔ بیٹیوں سے کہو کہ وہ ہر روز بعد نماز عشاء سورۃ طہ ایک مرتبہ پڑھ لیا کریں۔ تم بھی فجر کی سنتوں کے بعد اور فرض نماز کے درمیان ایک مرتبہ سورۃ رحمن کا ورد کر لیا کرو اور بعد نماز مغرب ایک مرتبہ سورۃ واقعہ پڑھ لیا کرو۔ اپنے شوہر سے کہو کہ وہ بھی اسی طریقے پر عمل کریں۔ خالص شہد اگر کہیں سے مل جائے (ڈھونڈنے سے عموماً مل جاتا ہے۔) تو اپنے شوہر کو صبح شام کھانے کے دو پیچھے نیم گرم پانی میں ملا کر پلا دیا کرو۔ شہد میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے بے شمار بیماریوں کے لیے شفا رکھی ہے۔ اپنے بیٹے کے سلسلے میں یہ کرو کہ اس کا پیدائشی نام اور تاریخ پیدائش جو ابی لفافے کے ہمراہ مجھے بھیج دو۔ میں اس کے لیے بھی بزرگوں کا آزمودہ ایک تیرہ ہدف تعویذ روانہ کر دوں گا۔ تم اور تمہاری بیٹیاں اور شوہر اچھے بیٹھے چلتے پھرتے حسبنا اللہ و نعم الوکیل ۵ نعم المسلمین و نعم النصیر کا ورد رکھتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ کر فرمائے گا۔

☆ شاکستہ و حید لاہور۔

۵ محترم باباجی! السلام علیکم! میری عمر اس وقت اٹھارہ سال ہے۔ میں نے اس سال انٹرن

میڈیٹ کا امتحان دیا ہے۔ میری ایک خالد نے دو سال پہلے آپ سے اپنے مسئلے کا حل پوچھا تھا۔ آپ کے بتائے ہوئے وظیفے سے نہ صرف اُن کا مسئلہ حل ہو گیا بلکہ اُن کے حالات بھی پہلے کے مقابلے میں بہت اچھے ہو گئے۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے ایک کزن کو دیوانگی کی حد تک چاہتی ہوں لیکن وہ میری محبت کو کھتا ہی نہیں ہے۔ اس نے اسی سال ایم اے کر کے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کیا ہے۔ وہ میرا تایا زاد ہے اور ہمارے گھر آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ اب تو میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ جس دن میں اس کی صورت نہ دیکھوں مجھے کسی طور چین نہیں پڑتا۔ میری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بڑھ گئے ہیں۔ میں جتنا اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتی ہوں وہ مجھ سے اتنا ہی دور بھاگتا ہے۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں وہ کسی دوسری لڑکی کو پسند نہیں کرتا۔ میں اتنی بری بھی نہیں ہوں کہ بلکہ لوگ کہتے ہیں کہ میں بہت پرکشش ہوں۔ مجھے لباس پہننے کا سلیقہ آتا ہے اور میں خاصی فیشن ایبل مشہور ہوں۔ باباجی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ یا تعویذ بتائیں کہ میرا کزن بھی مجھ سے اتنی ہی محبت کرنے لگے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میں اپنی جان دے دوں گی۔ خدارا! میرے لیے کچھ کریں۔

☆ شاکستہ بیٹی! اگر دیکھا جائے تو سرے سے تمہارا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ تمہارا عم زاد اگر تم سے کھنچا کھنچا رہتا ہے تو اس کی بھی ضرور کوئی وجہ ہوگی۔ اس عمر میں لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ اس قسم کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ تم پہلا کام تو یہ کرو کہ شیخ وقتہ نماز پابندی سے اول وقت میں ادا کرو۔ ہر نماز کے بعد ایک ایک شیخ "سیخ فاطمہ" پڑھنا بھی ضروری ہے۔ بعد نماز فجر پانچ سو مرتبہ یا اللہ یا رحمن یا

رحیم کا ورد کرو اور اپنے تمام مسائل کے حل کے لیے اللہ جل شانہ سے گزرتا کرو اور رورو کرو عا ملو کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کی عاجزی بہت پسند ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ کرو کہ اپنی کسی قابل اعتبار دوست یا خاندان کے کسی بزرگ کے ذریعے اپنے تایا کو اس رشتے پر راضی کرنے کی کوشش کرو۔ خدارا! اب کوئی بھی کوشش خود نہ کرنا ورنہ کوئی ایسی ویسی بات ہوگی تو زندگی بھر کے پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ تم نے لکھا ہے کہ اگر تمہارا عم زاد تمہیں نہ ملا تو تم خود کوشی کر لو گی؟ خود کوشی کرنے والے تو بزدل ہوتے ہیں اور ویسے بھی خود کوشی حرام موت ہے۔ ایسا بھول کر بھی مت سوچنا کہ زندگی تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے۔ کوئی بندہ اس میں خیانت کرنے والا کون ہوتا ہے؟ میری بتائی ہوئی ہدایات پر پابندی سے عمل کرو اور تیس دن بعد مجھے حالات سے آگاہ کرو۔

☆ عبدالرحمان کراچی۔

☆ بیٹے عبدالرحمان! اللہ تمہیں مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور ڈرود شریف بہت پڑھو۔ مشکلات زندگی کا حصہ ہیں ان سے گھبراتا نہیں چاہیے جو ان سے گھبراتا ہے یہ اس پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ انسان اپنی قوت ارادی سے سب کچھ حاصل کر لیتا ہے لہذا اپنی سوچ مثبت رکھو۔ بکثرت بَسَّارِ حَمْدُنْ کا ورد کیا کرو۔ والدہ سے کہو نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمن پڑھ کر تم پر دم کر دیا کریں۔ اللہ ضرور اپنا کر فرمائے گا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☆ شاپین اختر مقام نامعلوم۔

۵ محترم باباجی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی لاتعداد مہربانیوں سے خیریت سے ہوں گے۔ باباجی! جب میری زندگی میں کوئی مشکل

مقام آیا میں نے اللہ کے بعد آپ سے رابطہ کیا جس میں آپ نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ باباجی! نہ جانے کیوں میری زندگی بہت مشکل اور تنگن ہے۔ اب ایک اور میری زندگی میں مشکل آن پڑی ہے۔ باباجی! میرے شوہر کا شناختی کارڈ نہیں بن رہا ہے شناختی کارڈ میں نادرا والوں نے آنکھیں لگا دیا ہے جبکہ ان کا پرانا کارڈ موجود ہے۔ ان کے کارڈ کی وجہ سے بچوں کا اسکول اور کالج میں بے شمار مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ میرا کارڈ بنا ہوا ہے۔ باباجی! اُن لوگوں کی اس حرکت کی وجہ سے ہم لوگوں کو کس قدر مشکلات کا سامنا ہے اس کا اندازہ آپ بخوبی لگا سکتے ہیں۔ آپ کوئی ایسا وظیفہ دیتیجئے کہ ان کا کارڈ بن جائے۔ اللہ کے کلام میں بے حد طاقت ہے۔

☆ بیٹی شاپین! تمہارا مسئلہ یقیناً اعصاب شکن ہے۔ جہاں انسان بے بس ہو اور کسی اور کی وجہ سے ذہنی اور مالی اذیت ہو رہی ہو وہاں زندگی مشکل ہو جاتی ہے مگر میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ اللہ سے مدد مانگتی رہو۔

☆ بی بی خلسائی۔ U.K.

☆ بیٹی خلسائی! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ وظیفہ پابندی کے ساتھ کرو اور خوب دُعا میں مانگا کرو۔ بچوں پر سے خوب صدقہ نکالا کرو۔ یہ عمل انسان کو مشکلوں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

☆ رقیہ نشور مان بٹ گرام۔

☆ بیٹی رقیہ! اللہ تمہیں اولاد کی نعمت سے نوازے۔ بیٹی! جو ابی لفافے کے ہمراہ مجھے خط لکھو تاکہ تمہیں تعویذ ارسال کیا جاسکے۔

☆ رشیدہ خاتون کراچی۔

۵ باباجی! گزارش یہ ہے کہ ہماری بیٹی صائمہ رزاق جس کی عمر 34 سال ہوئی ہے شادی کے سلسلے

میں بات کرنی ہے کہ ان کے بہت سے اچھے رشتے بھی آئے لیکن بہت سی جگہ پر بات بنتے بنتے رہ جاتی ہے۔ جانے کون سی رکاوٹ یا بندش ہے جس کی وجہ سے یہ پریشانی ہے؟ برائے مہربانی کچھ ایسا پڑھنے کے لیے بتائیے جس سے ہماری یہ پریشانی دور ہو جائے اور کہیں اچھی جگہ ان کا رشتہ ہو جائے۔

☆ بیٹی رشیدہ! مناسب ہوگا مجھ سے تعویذ منگواؤ۔ تعویذ کے لیے مکمل تفصیل ارسال کرو اور جوابی لفاظی بھی ارسال کرو تا کہ جواب براہ راست دیا جاسکے۔

◻ احمد فراز۔ دہلی۔

◻ باباجی! میں عرصہ چار سال سے یہاں دہلی میں نوکری کر رہا ہوں۔ گھر اور بچوں سے دور ہوں مگر حالات ایسے نہیں ہو پارہے کہ انہیں بھی یہاں بلا سکوں۔ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتائیے جو میں عشاء کے بعد کر سکوں۔

☆ بیٹے فراز! اللہ تمہاری مشکل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور عشاء کے بعد 101 بار پڑھو۔

وَالْقِيَامِ فِي يَمِينِكَ تَلَقَّفْ مَا صَنَعُوا
إِنْ صَانَعُوا كَيْدًا سِحْرًا وَلَا يَنْفُلِحُ
السُّحْرُ حَيْثُ آتَى ◻ (طحاہ: ۶۹)

اول و آخر دو در شریف 7-7 بار پھر دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔ حاجت قبول ہونے پر حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرنا۔

◻ زاہدہ۔ ہالینڈ۔

◻ عزت مآب جناب بزرگ! آپ جو نیکی کر رہے ہیں اللہ آپ کو اس کے بدلے دنیا و آخرت دونوں میں بلند رتبہ عطا فرمائے۔ میرا ایک مسئلہ جو بہت عرصے سے ہے اور اب شدید ہو گیا ہے۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے جو ماشاء اللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور بہت اچھی نوکری پر ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کی شادی کر دوں مگر وہ کسی طور تیار نہیں ہوتا۔ اس وقت اس کی عمر 34 سال ہو گئی ہے۔ جناب بزرگ! میرا اس کے علاوہ کوئی سہارا نہیں میں چاہتی ہوں اپنا یہ فرض جلد از جلد پورا کر دوں۔

☆ بیٹی زاہدہ! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دیکھنا نصیب فرمائے۔ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگواؤ اور بیٹے سے کہو مجھے اپنا دوست اپنا بڑا جان کر ضرور خط لکھے۔ انشاء اللہ یہ معاملہ حل ہو جائے گا۔ بیٹی تم اب کچھ عرصہ اس پر شادی کے لیے دباؤ مت ڈالنا۔

◻ صائمہ بیگم لاہور۔

◻ باباجی! اللہ آپ کو خوش رکھے اور آپ اسی طرح خلق خدا کی خدمت کرتے رہیں۔ باباجی! میرا نواسہ بہت بدتمیز اور غیر مستقل مزاج ہے۔ دنیا کی ہر سہولت حاصل ہے مگر پھر بھی بے زار بے زار سار ہوتا ہے۔ اس کی ماں بہت پریشان رہتی ہے۔ اکثر باپ سے بھی زبان چلاتا ہے۔ اسی وجہ سے گھر کا ماحول بہت خراب رہتا ہے۔ ماں کو پڑھنے کے لیے کچھ بتا دیجئے وہ گھر میں رہتی ہے۔

☆ عزیزہ صائمہ! سب سے پہلے تو بچے پر بے تحاشہ توجہ دینا کم کر دو۔ اس عمر میں لڑکے اکثر ایسے ہی رویہ رکھتے ہیں۔ ماں سے کہو نماز فجر اور عصر کے بعد 7-7 تسبیح پڑھے۔

حَسْبِنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ط عَلَيَّ اللَّهُ تَوَكَّلْنَا
پھر دُعا کرے۔ کوشش کرے کہ بہت روک ٹوک نہ ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

◻ ایم حنیف۔ مہجرات۔

◻ باباجی! پانچ سال ہو گئے ہیں لیکن پریشانی جانے کا نام نہیں لیتی قرض داروں کی ایک لائن لگ گئی ہے کچھ ایسا کریں کہ ان کے منہ بند ہو جائیں۔ پیسہ آنے پر میں خود ان کے گھر جا کر ان کا قرض ادا کر دوں گا۔ مجھے تو خود بڑی فکر ہے۔ خدا سے دن رات دُعا کرتا ہوں کہ باری تعالیٰ! دنیا کا قرض دنیا میں ہی ادا ہو جائے۔ اپنے بعد تو مجھے کوئی قرض ادا کرنے والا نظر نہیں آتا۔ بچے بہت چھوٹے ہیں۔ باباجی یہ سب باتیں تو ایک طرف سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے مجھے سود جیسی لعنت میں جکڑ دیا ہے اور ہر ماہ کے آخر تک مجھے ایک لاکھ روپے بھجوا دیتا ہے۔ باباجی! میں زندگی میں پہلی اور آخری غلطی کر چکا ہوں آئندہ مرتے دم تک ایسی لعنت میں نہیں آؤں گا اور نہ ہی

بچوں کو آنے دوں گا۔ باباجی! آپ کو اس پیارے خدا اور اس کے پیارے رسول کے حضور دعا کرنے کی التجا کرتا ہوں کہ اس لعنت سے میری جان چھوٹ جائے۔ اللہ تعالیٰ غیب سے کوئی مدد فرما دے۔ آپ سے خصوصی دعا کی التجا کرتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذریعے وسیلہ بنایا ہے۔

☆ بیٹے حنیف! جانتے بوجھتے تم نے وہ گناہ کیا جس کی بہت سخت سزا ہے۔ سو دلینا اور دینا بہت سخت گناہ ہے۔ بہر حال تم اپنے کیے پر شرمندہ ہو تو عہد کر لو کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کرو گے۔ نماز عشاء کے بعد 1100 مرتبہ پڑھو۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا

اول و آخر دو در شریف 11-11 بار پھر حاجت بیان کرو اور گڑگڑا کر دُعا کرو۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

◻ شائستہ جبین لاہور۔

☆ بیٹی شائستہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ حالات بے شک بہت مشکل ہیں مگر اللہ پر بھروسہ رکھو وہ نہایت مہربان آقا ہے۔ نماز عصر کے بعد سورۃ النعام آیات 51-50، 99-99 بار پڑھو اور دعا کرو۔ کوئی فیصلہ بھی جلد بازی میں مت کرنا نقصان ہوگا۔ تم صرف اپنی بچیوں کا سوچو۔ صرف ان کی ذمہ داری پوری کرو۔ اللہ بہتر اسباب پیدا کرے گا۔

◻ کنول ندیم ملتان۔

◻ محترم باباجی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری چھوٹی بہن نویں کلاس میں ہے اور نرسنگ کا کورس کرنے کی خواہش رکھتی ہے۔ میرے غریب والدین کی بھی یہی خواہش ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر ماں باپ کا سہارا بن جائے۔ باباجی! میری بہن کی

کا سیابی کے لیے دعا کریں اور اس کے لیے کوئی اچھا سا وظیفہ بھی بتادیں۔ باباجی ہمارے لیٹر کا جواب ضرور دینا میں منتظر رہوں گی۔

☆ بی بی کنول تمہارا پہلا مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ تم نماز فجر کے بعد 101 بار پڑھو۔

اللّٰهُمَّ اجْرِنِي مِنَ النَّارِ
پھر دعا کرو۔ مدت 41 روز ہے۔ بہن سے کہو نماز عشاء کے بعد 41 بار سورۃ فاتحہ پڑھے اور دعا کرے۔ خیال رہے وظیفہ کے دوران حدیث نبوی اور دروغ گوئی سے مکمل پرہیز کرنا ہے۔

☆ احمد نعیم کراچی۔
☆ بی بی نعیم اللہ تمہیں خوش رکھے۔ وظیفہ نماز کی پابندی کے ساتھ ایک ماہ کرو۔ بی بی خیال رکھو کہ نماز قضاء ہو۔
☆ صبوحی بنوں۔

☆ محترم باباجی میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ میرے شوہر جس دفتر میں کام کرتے ہیں وہ بند ہونے والا ہے۔ باباجی اگر ایسا ہو گیا تو ہم کیا کھائیں گے اور کہاں رہیں گے؟ یہ سوچ کر میں بہت روتی ہوں مگر مسئلہ کچھ حل ہوتا نظر نہیں آ رہا۔

☆ بی بی صبوحی رونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ پر بھروسہ رکھو رزق کا وعدہ اس کا ہے۔ نماز پابندی سے ادا کرو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 3-3 بار سورۃ فرقان پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

☆ ضیاء اللہ لاہور۔
☆ بی بی ضیاء اللہ تمہیں خوش رکھے۔ نماز عشاء کے بعد 41 بار سورۃ الناس پڑھو اور اپنے اوپر دم کر لیا کرو۔ تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ تم غلط کر رہے ہو تو بی بی وہیں رک جانے ہی میں عافیت

☆ بی بی جمیلہ استخارہ حق میں ہے۔ بی بی پر سے کچھ رقم خیرات کر کے رشتہ طے کر دو۔ اگر کوئی رقم کرنے جارہی ہو تو جون کی 3, 11, 21 تاریخیں مناسب ہیں۔

☆☆☆☆

بی بی کہانیاں
MINI MAG

کتاب تبصرہ

آپ کی ڈائری

خیال آرائی

پسند اپنی اپنی

آپ کی خبر

بازگشت

آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں سما سکتے ہیں

انتخاب

اللہ ارحم الراحمین ہیں

ماں بیٹوں کو نہیں پوچھتی، باپ اولاد کو نہیں پوچھتا، بھائی بھائیوں کو بھول چکے ہیں، یہ نیکی تو نے کیسے دے دی؟ تو وہ کہے گا۔ اے رب العالمین! میرے پاس تو تھی ہی ایک نیکی۔ میں نے سوچا کہ میرا تو کچھ بے گانہیں، یہ تیرا بندہ کیوں نہ جنت میں چلا جائے۔ حدیث میں ہے اللہ تعالیٰ فرمائیں گے تو نے دو سرے کا خیال کیا، جاؤ تم دونوں کو جنت میں بھیجتا ہوں۔“

سید عبدالمجید ندیم شاہ کی تصنیف ”جو اہرات ندیم“ سے اقتباس
انتخاب۔ اشعر جواڈ کراچی۔

چھوٹا کام

رزق کا بندوبست کسی نہ کسی طور پر اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے لیکن میری پسند کے رزق کا بندوبست نہیں کرتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری پسند کے رزق کا انتظام ہونا چاہیے۔ ہم اللہ کے لاڈلے تو ہیں لیکن اتنے بھی نہیں جتنے ہم خود کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے بابا جی کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی آدمی آپ سے سردیوں میں رضائی مانگے تو اس کے لیے رضائی کا بندوبست ضرور کریں کیونکہ اسے ضرورت ہوگی لیکن اگر وہ یہ شرط عائد کرے کہ مجھے فلاں قسم کی رضائی دو تو پھر اس کو گھر سے باہر نکال دو کیونکہ اس طرح اس کی ضرورت مختلف طرح کی ہو جائے گی۔ ایک مرتبہ جب ہم بابا جی کے پاس ڈیرے پر گئے تو انہوں نے

رسول پاکؐ کی ایک حدیث ہے کہ حشر میں ایک ایسا آدمی اللہ کی عدالت میں آئے گا کہ جس کے اعمال میں صرف ایک عمل کی کمی ہوگی تو حق تعالیٰ فرمائیں گے جاؤ اپنے عزیز رشتے داروں، بھائی، باپ سے ایک نیکی مانگ کر لاؤ۔ اگر ایک نیکی مل جائے تو تم جنت میں جا سکتے ہو۔ وہ برادری کے پاس جائے گا، دوستوں کے پاس جائے گا، والدین کے پاس جائے گا لیکن وہاں تو نفسا نفسی کی پکار ہو گی۔ کوئی اس کی نہیں سنے گا۔ نیکی نہیں ملے گی۔ وہ بے چارہ مایوس ہو کر جب واپس لوٹے گا تو ایک آدمی پیٹھا ہوگا وہ اسے دیکھے گا کہ وہ بڑا پریشان بڑا مضطرب آ رہا ہے تو وہ پوچھے گا کیا ہوا میاں، یہ کہے گا کہ ایک نیکی کم تھی اگر وہ مل جاتی تو جنت میں چلا جاتا لیکن کسی نے بھی نہیں دی۔ نہ بھائیوں نے نہ دوستوں نے یہاں تک کہ ماں باپ نے بھی آج نہیں پوچھا۔ تو وہ آدمی کہے گا کہ میرے پاس ایک ہی نیکی ہے اسے تولے جا، ایک اکلونی نیکی سے میرا کیا بنے گا؟ وہ بڑا خوش ہوگا۔ اس سے ایک نیکی لے کر وہ رب کے پاس حاضر ہو کر کہے گا کہ مجھے نیکی مل گئی۔ مجھے جنت عطا کیجئے حق تعالیٰ فرمائیں گے یہ نیکی تجھے کس نے دی؟ اس آدمی کو بلایا جائے گا جس نے نیکی دی تو رب العالمین فرمائیں گے۔ آج تو

ہمیں مٹر چھلنے پر لگا دیا۔ میں نے تھری پیس سوٹ پہن کر ٹائی لگا رکھی تھی لیکن مٹر چھیل رہا تھا حالانکہ میں نے ساری زندگی بھی مٹر نہیں چھیلے تھے پھر انہوں نے لہسن چھلنے پر لگا دیا اور میرے ہاتھوں سے بو آنا شروع ہو گئی پھر حکم ہوا کہ بیٹھی کے پتے اور ڈھسل اگ اگ کرو۔ اس مشقت سے تو اب خواتین بھی گھبراتی ہیں۔ ہماری ایک بیٹی ہے زونیرا اس کو کوئی چھوٹا سا کام کہہ دیں کہ بھی یہ خط پہنچا دینا تو کہتی ہے بابا! یہ معمولی سا کام ہے۔ مجھے کوئی بڑا سا کام دیں اتنا بڑا کہ میں آپ کو وہ کر کے دکھاؤں (کوئی مشل میں جانے جیسا کام شاید) میں نے کہا کہ یہ خط تو پہنچا دیتی، کہنے لگی یہ تو بابا جی بس پڑا ہی رہ گیا میرے پاس۔ چھوٹے چھوٹے کاموں سے باپ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہماری زندگی میں ڈسپن آئے۔

اشفاق احمد کی تصنیف ”زواہ“ سے اقتباس
رضوانہ کوثر، لاہور۔

ترقی

قیام پاکستان کے بعد ہم نے بڑی ترقی کی ہے جس کے پاس ایک کوٹھی تھی اس نے دو بنا لیں۔ پہلے ہمارے پاس ایک پاکستان تھا ہم نے دو بنا لیے۔ یہی حال سیاسی پارٹیوں کا رہا۔ مولانا مفتی محمود صاحب ایک جمعیت العلماء اسلام چھوڑ کر گئے تو مولانا فضل الرحمان صاحب نے بڑی مشکلوں سے دو کیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے دن رات ایک کر کے ایک جمعیت علماء پاکستان سے دو بنا لیں لیکن جماعت اسلامی ترقی نہ کر سکی ابھی تک ایک ہی ہے۔ سب سے زیادہ ترقی مسلم لیگ نے کی سواتی مسلم لیگیں مارکیٹ میں آئیں کہ اعلان کرنا پڑا نقالوں سے بچے۔

ڈاکٹر پولس بٹ کی تصنیف ”افرا ترقی“ سے اقتباس
انتخاب: عمران ہارون چھوٹانی، کراچی۔

سنہرے لوگ

ہم آفریدیوں اور قندھاریوں کے مابین شاہی دور میں ہمیشہ ٹکوار چلتی رہی۔ انہیں قندھاریوں میں ایک صاحب عبدالرحمن خان تھے جو میرے باپ کے پاس آیا کرتے تھے۔ انہیں آتے جاتے دیکھ کر مجھ کو اس بات پر تعجب ہوا کرتا تھا کہ قندھاریوں اور آفریدیوں کے درمیان تو ایک مدت سے عداوت چلی آ رہی ہے پھر وہ میرے باپ سے ملنے کیوں آتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ عجب اور پشیمانی آمیز آفسوس اس بات پر ہوتا تھا کہ عبدالرحمن خان کے آتے ہی میرے باپ کی آنکھیں کیوں جھمک جاتی ہیں۔ میں یہ سوچ سوچ کر دل ہی دل میں کڑھا کرتا تھا کہ میرے باپ شاید عبدالرحمن خان سے ڈرتے ہیں۔ جب ہی تو ان کو دیکھتے ہی آنکھیں پٹی کر لیتے ہیں لیکن ڈر کے مارے زبان سے کچھ نہیں بولتے تھے۔ جب بہت دن تک یہ تماشا ہوتا رہا تو مجھ سے ضبط نہ ہوا اور ایک روز ڈرتے ڈرتے میں نے پوچھا۔ ”میاں جی آپ عبدالرحمن خان سے آنکھیں کیوں نہیں ملاتے؟“

انہوں نے میرا سوال سن کر پہلے تو ادھر ادھر دیکھا اور مجھ کو اپنے قریب بٹھا کر فرمایا۔ ”بیٹا! عبدالرحمن خان ایک زمانے میں رئیس تھے۔ اب ان کے پاس کچھ بھی نہیں رہا ہے۔ اس لیے میں ان کو وظیفہ دیتا ہوں اور بیٹا شریفوں کی یہ آن ہے کہ جس کو وظیفہ دیتے ہیں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتے کہ وہ کہیں شرمندہ نہ ہو جائے۔“ اور جب میں آنکھوں میں آنسو بھر کر جانے لگا تو انہوں نے فرمایا۔ ”دیکھو بیٹا، میرے سر کی قسم یہ بات کبھی زبان پر مت لانا۔“

جوش ایچ آبادی کی تصنیف ”پادوں کی برأت سے“ اقتباس
انتخاب: نعیم احمد آکاش، حیدرآباد۔

افسوس کی حیرانگاہ

باتیں اشفاق احمد کی

☆ منزل قریب آنے پر مسافر ایک دوسرے سے اور ساربان سے دور ہونے لگتے ہیں۔ منزل بھی کیا محبوب ہے کہ جب قریب آ جاتی ہے تو محبت کرنے والے ایک دوسرے کے رقیب بن جاتے ہیں۔

☆ جب زندہ آدمی کا اندر مر جاتا ہے تو وہ بڑا خوش اخلاق اور شائستہ ہو جاتا ہے اور سچ زندگی کے پروانے اس سے نور حاصل کرنے کے لیے دور دور سے اڑ کر آتے لگتے ہیں۔

☆ راستہ جب پتھر یلا ہو سورج کی تمازت تیز ہو ہر قدم پر چڑھائی ہو تو مسافت مشکل سے طے ہوتی ہے۔

☆ سمجھوتے میں زبردستی کا عنصر ہوتا ہے مان لینے کی کیفیت نہیں ہوتی، سب کچھ جانتے ہوئے سمجھوتا کرنا بڑا تاب ناک ہے مگر ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں ہوتا۔

مرسلہ: شریل اقدس، جبکب آباد۔

اقوال ولیم شیکسپیر

☆ دوستی بہم رہنے سہنے اور کھانے پینے کا نام نہیں بلکہ یہ دو دلوں کے باہمی ربط کا نام ہے۔

☆ انسانیت کا زور نیک نامی ہے۔

☆ میں اپنی زندگی سے زیادہ اپنے مالک سے محبت کرتا ہوں۔

☆ زندگی ہر شخص کو عزیز ہے، لیکن بہادر انسانوں کے لیے عزت زندگی سے بھی عزیز ہوتی ہے۔

☆ بچے کے لیے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہی ہے خواہ بچے کی عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو۔

☆ بزدل اپنی موت سے قبل کئی بار مرتے ہیں

لیکن جرأت مند لوگ ایک ہی مرتبہ مرتے ہیں۔

☆ حسین صورت، نیک سیرت کے بغیر ایسی ہے جیسے خوشبو سے نبی دامان گلاب، عقل مند انسان کبھی بیٹھ کر اپنی تکلیف کا رونا نہیں روتا بلکہ اپنی تکلیف کے تدارک میں بخوشی مصروف عمل ہوتا ہے۔

☆ خوشامد کرنے والا اور ن کر خاموش رہنے والا دونوں کینے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو دھوکا دیتے ہیں۔

☆ عورتیں ایسی کتابیں ایسی تصویریں اور ایسی دبستان ہیں جو تمام دنیا کی پرورش اور تربیت کرتی ہیں۔

☆ سچی محبت کے راستے میں نشیب و فراز بھی ہوتے ہیں۔

☆ وہ لوگ جو اونچی جگہوں پر کھڑے ہوتے ہیں انہیں گرانے کے لیے بہت ہی تند و تیز ہوا میں آتی ہیں۔ اگر وہ گر پڑیں تو ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں۔

☆ دنیا آنکھوں سے نہیں دیکھتی، دل سے دیکھتی ہے، یہی وجہ ہے کہ محبت کا دیوانہ اندھا بتایا گیا ہے۔ دانش مند صرف وہی ہیں جو محبت میں اندھے نہ ہوں۔

☆ قطرہ قطرہ بھی مسلسل گراتے ہوئے رہو تو چٹان آپ کے عزم سے چکنا چور ہو جائے گی۔

☆ جب حسن بولتا ہے تو بڑے بڑے عالم اور دانش ور گونگے ہو جاتے ہیں۔

مرسلہ: کنول عمران خان، کراچی۔

خیال جدائی

☆ شب بچر، شب بچر، جد ہونا اتنا میٹھا نم ہے کہ جب تک صبح نہیں ہوتی، میں تمہیں شب بچر کہتا رہوں گا۔ (ولیم شیکسپیر)

☆ محبت میں چند گھنٹے مہینوں کے برابر اور چند دن برسوں کے برابر لگتے ہیں اور ایک لمحے کی جدائی ایک عمر کی جدائی محسوس ہوتی ہے۔ (جان ڈرائی ڈن)

☆ موت کی طرح جدائی بھی محبوب کی یاد کو دھندلا دیتی ہے اور ہمیں محسوس بھی نہیں ہوتا کہ وقت نے سچ میں کیسی کیسی دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ (ایبورگولڈ اسمتھ)

☆ جدائی دل کی پیاس بڑھا دیتی ہے۔ (بیلی)

☆ جدائی بعض اوقات دوستی میں رس گھول دیتی ہے اور اسے زیادہ میٹھا بنا دیتی ہے۔ (بے ہوویل)

☆ جانے والا ان لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتا ہے جنہیں وہ چھوڑ جاتا ہے۔ (ایڈورڈ ڈیولاک)

☆ ہر جدائی موت سے مشابہت ہے۔ (چارل ایلیٹ)

☆ مرسلہ: ثانیہ بھیسیا لکوث۔

☆ **انمول موقوفی**

☆ وقت صالح تو ہے ہی، لیکن یہ نصیب کی پرچھائیاں اپنے دامن کیوں بھگوتی ہیں؟

☆ تم تو دامن وقت کے سائے تلاش کرتے ہو، کبھی وقت کا دامن خود کو بھلا پائے گا؟

☆ شکستہ آرزوؤں کی پناہیں لیے میں اسی رتب کے آگے جاؤں گا جس کے گھر میں داخل ہونا بھی ایک سال بعد نصیب ہوا۔

☆ وقت مرہم تو ہے ہی، دوائی لگنے کے بعد زخم آہستہ آہستہ کیوں بھرتا ہے؟

☆ اور لو کی خوشیوں میں خالی ہونے والے دامن دولت سے نہیں۔ رتب کریم عزوجل کی رحمت سے بھرا کرتے ہیں۔

☆ وقت کے انمول رنگوں کی پہچان وہی کرتے ہیں جو انمول کو بے مول بنا دیتے ہیں۔

☆ محبت کے نام پہ ملا ہوا ہوا کا جھونکا تمام تر ساعتوں سے بھاری ہوتا ہے۔

☆ تسلیم کی ہوئی غربت مانگی ہوئی دولت سے بہتر ہے۔

☆ حاصل کے بعد جذبول کی قدریں مجھ کیوں ہو جاتی ہیں؟

☆ اندھی خواہشیں خواب سراب سے بڑھ کر "میرا ہے" ہونے کا پتا دیتی ہیں۔

☆ مرسلہ: سدرہ انور علی جھنگ۔

☆ **عورت کیا ہے.....؟**

☆ عورت ماں کے روپ میں رحمت ہے۔

☆ بہن کے روپ میں شرافت ہے۔

☆ بیٹی کے روپ میں باوندوست ہے۔

☆ ویرانے میں چمن ہے۔

☆ عورت محبت کرتی ہے تو بڑی مشکل سے لیکن نفرت پل بھر میں کرنے لگتی ہے۔

☆ اندھیرے میں نور اور روشنی کی کرن ہے۔

☆ مرسلہ: یاسمین شمعون کراچی۔

☆ **ذوالحسک اور اپٹھے نشانہ**

☆ ایک گاؤں میں ایک تھیز کمپنی آئی۔ اس کے ایک فنکار نے وقفے کے دوران خنجر پھینکنے کا کرب دکھانا شروع کیا۔ اس نے اپنی سامھی فنکارہ کے چاروں طرف آہستہ آہستہ اس مہارت سے خنجر پھینکے کہ وہ چمکتے ہوئے خنجروں کے درمیان سچ سلامت رہی جبکہ کبھی بھی تو خنجر اس کے صرف بال برابر دور رہ جاتا۔ تمام حاضرین دم سادھے اس مظاہرے کو دیکھتے رہے کہ ہال کے عقبی حصے سے غصے میں بھری ایک آواز ابھری۔ "بل! چلو یہاں

سے چل پڑو۔ اس بے وقوف نے اپنا نشانہ پھر ضائع کر دیا۔"

☆ مرسلہ: فہیم صدیقی کراچی۔

☆ **مجبوری**

☆ "میرے امی ابو میرے لیے ایک چھوٹی سی بہن لائے ہیں۔" بچے نے اپنی بچھڑ کو بتایا۔

☆ "کیا وہ آپ کو اچھی لگتی ہے؟" بچھڑ نے پوچھا۔

☆ "ہاں! اچھی تو لگتی ہے، لیکن وہ لڑکا ہوتی تو زیادہ مزہ آتا۔" بچہ بولا۔

☆ "تو آپ اپنے امی ابو سے کہیے کہ اُسے بدل کر آپ کو بھائی لادیں۔" بچھڑ نے مسکرا کر کہا۔

☆ "اب اُسے بدلا نہیں جا سکتا۔" بچے نے افسردگی سے کہا۔ "اب تو ہم چاروں اُسے استعمال بھی کر چکے ہیں۔"

☆ **نمائندگی**

☆ امریکا کی ایک سڑک پر ایک جنازہ جا رہا تھا۔ ایک ہندوستانی کو یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ تابوت کے ہمراہ گولف کھیلنے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اُس نے جنازے میں شریک ایک شخص سے دریافت کیا۔ "یہ شخص یقیناً زندگی میں گولف کا اچھا کھلاڑی رہا ہوگا؟"

☆ "رہا ہوگا سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" اُس نے جواب دیا۔ "وہ اچھا کھلاڑی ہے، یہی آج کا فائٹل کھیلنے کی وجہ سے وہ اپنی بیوی کے جنازے میں شریک نہیں ہو سکا اس لیے اس کے گولف کا سامان نمائندگی کی صورت ہمراہ ہے۔"

☆ بلال احمد کراچی۔

☆ **بدقسمتی**

☆ ایک نوآموز وکیل اپنا پہلا مقدمہ لڑ رہا تھا۔ عدالت کے روبرو دلائل دیتے ہوئے وہ خاصا نروس

ہو گیا۔ "مائی لارڈ! میرا بد قسمت موکل....." اس نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ ذہن الجھ گیا اور سمجھ میں نہ آیا کہ آگے کیا کہے۔ اس نے دوبارہ پھر سہ بارہ کوشش کی لیکن ہر بار وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ پایا۔ "مائی لارڈ! میرا بد قسمت موکل....." یہ دیکھ کر فاضل جج آگے جھکا اور اس کی حوصلہ افزائی کے لیے مسکراتے ہوئے بولا۔ "کہیے کہیے جناب! رک کیوں گئے؟ یہاں تک تو عدالت آپ سے پوری طرح متفق ہے۔"

☆ ساجدہ خان۔ کوسید۔

☆ **مناسب موقع**

☆ اسی ڈرامے کے دوران ایک کارندہ ہانپتا ہوا دوڑا دوڑا پروڈیوسر کے پاس پہنچا۔ پروڈیوسر اُس وقت ڈریسنگ روم میں ہیروئن کے ساتھ کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔ "کیا بات ہے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" پروڈیوسر نے پوچھا۔

☆ "سزوہ ہیرو نے اُن کو گولی ماری لیکن ولن نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر مجھے یہ چٹ تھما دی ہے۔" کارندے نے ایک چٹ پروڈیوسر کو دے دی۔ اُس پر لکھا تھا۔ "میرے بقایا چاٹ پچھلے پردے کے نیچے سے چپکے سے مجھے دے جاؤ ورنہ میں گولی کھانے کے باوجود نہیں مروں گا۔"

☆ مرسلہ: دادا مشتاق جمالی حیدرآباد۔

☆ **خبر**

☆ ایک شیر جنگل میں سو رہا تھا کہ ایک بندر ادھر آ نکلا۔ جنگل کے بادشاہ کو سوتے دیکھ کر بندر کو شرارت سوچی اور وہ اسے ایک ٹھنڈا مار کر بھاگ گیا۔ اس پر شیر کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس کے پیچھے بھاگا۔ بندر بھاگتا ہوا ایک پارک میں گھس گیا جہاں لوگ بچپوں پر بیٹھے اخبار پڑھنے میں مشغول تھے۔ بندر نے بھی ایک اخبار پکڑا اور اُن کے درمیان میں بیٹھ

گیا۔ اتنے میں شیر ہانپتا ہوا وہاں پہنچا اور بندر کے پاس کھڑے ہو کر بولا۔ ”تم نے یہاں کوئی بندر دیکھا ہے؟“

بندر اخبار کی آؤٹ سے بولا۔ ”تم اس بندر کے بارے میں تو نہیں پوچھ رہے ہو جو شیر کو پھنسا مار کر بھاگا ہے؟“

یہ سن کر شیر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ ”کیا یہ خبر اخبار میں شائع ہوئی ہے؟“

مرسلہ: کاشف خان پشاور۔

بزم آرائی

☆

یہ چراغ بے نظر ہے یہ ستارہ بے زباں ہے
ابھی تجھ سے ملتا جلتا کوئی دوسرا کہاں ہے
وہی شخص جس پہ اپنے دل و جاں نثار کردوں
وہ اگر خفا نہیں ہے تو ضرور بدگماں ہے
کبھی پاکے تجھ کو کھونا، کبھی کھو کے تجھ کو پانا
یہ جنم جنم کا رشتہ ترے میرے درمیان ہے
مرے ساتھ چلنے والے تجھے کیا ملا سفر میں
وہی دکھ بھری زمیں ہے وہی غم کا آسمان ہے
میں اسی گماں میں برسوں بڑا مطمئن رہا ہوں
ترا جسم بے تغیر مرا پیار جاوداں ہے
انہی راستوں نے جن پر بھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے
(ایشیہ بدر)

حسن انتخاب: قرۃ العین زینب ملتان۔

☆

جو بھی مشکل کام تھا، کرنا اچھا لگا
اس نندی کے پار اتنا اچھا لگا
لفظوں میں تصویر بنا کر چاہت کی
اس میں رنگ معانی بھرنا اچھا لگا

ہم نے دیکھا اُس کو ایک بلندی پر
اور وہاں پر اُس کا ڈرنا اچھا لگا
وہ خوشبو کی صورت آ کر پھیلا تو
ہمیں بھی اپنا اور بکھرنا اچھا لگا
جس رستے سے سارے لوگ پلٹ آئے
اس رستے سے مجھ کو گزرنے اچھا لگا
جس منظر پر دھیان کیا، وہ ڈوب گیا
میری خشک آنکھوں سے جھرنے اچھا لگا
سعد بگاڑ کی صورت اس نے پیدا کیا
جس کو بننا اور سنورنا اچھا لگا

(سعد اللہ شاہ)

حسن انتخاب: عائشہ اشعر، کراچی۔

☆

دیکھ کر دور اُسے ایسے پکارا میں نے
جس طرح دل میں کوئی خواب اتارا میں نے
پہلے اشکوں سے کیا درد کا صحرا سیراب
پھر تری یاد کو جنگل سے گزارا میں نے
رات بھر چہرہ ترا بھیگتی آنکھوں میں رہا
چاند دیکھا نہ میری جان، ستارہ میں نے
کیا بتاؤں ترے یک لخت بچھڑ جانے پر
کتنی مشکل سے دیا خود کو سہارا میں نے
میں جو نکلا ہی نہیں دکھ کے سمندر سے کبھی
خواب میں دیکھا ترے ساتھ کنارے میں نے
ورنہ یہ لوگ کہاں ملنے کے لائق تھے میرے
تیری خاطر کیا ہر شخص گوارہ میں نے

(فرحت عباس شاہ)

حسن انتخاب: ام عادل، کراچی۔

مگر تمہیں کیا

میں آڑے ترچھے خیال سوچوں
کوئی بے ارادہ کتاب لکھوں
کوئی شناسا غزل تراشوں

کوئی اجنبی انتساب لکھوں
گنوا دوں اک عمر کے زمانے
کہ ایک پل کا حساب لکھوں
میری طبیعت پہ منحصر ہے
میں جس طرح کا نصاب لکھوں
یہ میرے اپنے مزاج پر ہے
عذاب سوچوں، ثواب لکھوں
طویل تر ہے سفر تمہیں کیا
میں جی رہا ہوں مگر تمہیں کیا
مگر تمہیں کیا کہ تم تو کب سے
میرے ارادے گنوا چکے ہو

جلا کے سارے حروف اپنے

میری دعائیں بچھا چکے ہو

میں رات اور صبحوں کہ نہ چاہوں

تم اپنی رسمیں اٹھا چکے ہو

سنائے کہ سب کچھ بھلا چکے ہو

تو پھر مرے دل پہ جبر کیا

رد دل تو حد سے گزر چکا ہے

گزر چکا ہے مگر تمہیں کیا

خزاں کا موسم ٹھہر چکا ہے

ٹھہر چکا ہے مگر تمہیں کیا

مگر تمہیں کیا کہ اس خزاں میں

میں جس طرح کے بھی خواب لکھوں

(حسن نقوی)

حسن انتخاب: اشعر جواد، کراچی۔

نشو و نما

میں بھول جاؤں تمہیں

اب یہی مناسب ہے

مگر بھلانا بھی چاہوں تو کس طرح بھولوں

کہ تم تو پھر بھی حقیقت ہو

کوئی خواب نہیں

یہاں تو دل کا یہ عالم ہے، کیا کہوں
کم بخت.....!

بھلا نہ پایا یہ وہ سلسلہ ●

جو تھا ہی نہیں

وہ اک خیال

جو آواز تک گیا ہی نہیں

وہ ایک بات

جو میں کہہ نہیں سکا تم سے

وہ ایک ربط

جو ہم میں بھی رہا ہی نہیں

مجھے یہ یاد وہ سب

جو بھی ہوا ہی نہیں

(جاوید اختر)

حسن انتخاب: کرن شبیر، کراچی۔

برسا کا گیت

بچھڑ کے جانے والے لوگو!

جب بھی رات کو بادل برسے

ہم کو دھیان میں لا کر اتار دو کہ

آنکھوں کا کا جل

بہہ کر

سُند گال بھگودے

بچھڑ کے جانے والے لوگو!

جب بھی رات کو بجلی جھکے

چاہت کے سنگیت سنا کر ہمیں بلاؤ

ہم بھی ہوا کے جھونکوں میں

ہرا جڑے ٹکر میں جاتے ہیں

اور گیت پرانے گاتے ہیں

(میر نیازی)

حسن انتخاب: صائمہ شاہ، حیدرآباد۔

☆ ☆

تبصرہ اور تذکرہ | کتابوں پر تبصرے اور ادیبوں کی گفتگو، باتیں، یادیں

بارش میں شریک Companion in the Rain



تصویر عطا تراب مصوری فائزہ خان
Poetry by Ais Turab & Painting by Faiza Khan

عطا تراب کی شاعری اُن کی تخلیقی شخصیت کی مظہر ہے۔ عطا تراب کی کامیابی یہ ہے کہ وہ بڑی سہولت سے اپنی بات بیان کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ اُن کی غزل اور نظم دونوں اپنے انداز بیان اور موضوعات کی انفرادیت میں اپنی مثال آپ ہے۔ عطا جانتے ہیں کہ فداکارانہ اظہار کا حسن سادگی اور بے ساختگی میں پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزل کی جلوہ سامانیاں دیکھنے کے لائق ہیں۔

عطا تراب کی غزل کے اچھوتے پن نے انہیں اپنے ہم عصر شاعروں سے نمایاں اور الگ مقام بنانے میں آسانیاں فراہم کی ہیں..... ”بارش میں شریک“ صرف نام کی حد تک ہی منفرد نہیں بلکہ اپنی شاعری کے لحاظ سے بھی منفرد الگ مقام کی حامل ہے۔ عطا تراب کی شاعری محض الفاظ اور اوزان کی جمع، تفریق سے حاصل ہونے والی شاعری نہیں ہے۔ اُن کی غزل اور نظم دل پر اثر کرتی ہے اور زندہ

عطا تراب کا شعری مجموعہ

”بارش میں شریک“

پر تجزیاتی نوٹ

عکاشہ سحر

مجھے جب کوئی شعری تخلیق موصول ہوتی ہے تو میں اُس میں یہ چند امور ضرور تلاش کرتی ہوں..... شاعر کا پیرایہ بیان، اسلوب میں جاذبیت، کوئی نیا پن موجود ہے! وہ کن تلازمات کے ساتھ اپنے اسلوب کو دلکش بناتا ہے؟ اور افکار و مضامین میں کہاں تک تلاش اور تنوع کا عنصر موجود ہے؟

اِس ماہ ”کتاب تبصرے“ کے لیے مجھے ایک بہت خاص اور اعلیٰ کتاب موصول ہوئی ہے..... اور میں اس کشش میں ہوں کہ کیا لکھوں ہو ایسے عطا تراب کی شاعری سے میری آشنائی تو چند سالوں سے ہے۔ یہ بہت عمدہ غزل کہتے ہیں اور نظم کے بھی اعلیٰ شاعر ہیں۔

”بارش میں شریک“ عطا تراب کی خوبصورت شاعری سے سچا پہلا مجموعہ کلام ہے جسے فائزہ خان کی مصوری نے مزید دلکش بنا دیا ہے۔ عطا تراب کے قلم سے نکلے ہوئے لفظوں کو فائزہ خان نے تصویری پیرہن عطا کر کے ایک حسین امتزاج بخشا ہے۔ مصوری سے دلچسپی رکھنے والے فائزہ خان کے نام سے ضرور واقف ہوں گے آپ بہت باکمال مصورہ ہیں۔ ان کے بنائے ہوئے بے حد دلکش نامیائل کے ساتھ ”بارش میں شریک“ ایک نہایت خوبصورت مجموعہ کلام ہے۔

حقائق کی امین ہونے کے ساتھ ساتھ واقعاتی صدقاتوں کی مظہر بھی ٹھہرتی ہے۔ وہ بیک وقت غزل اور نظم کہہ رہے ہیں اور دونوں اصناف سخن کے ساتھ ان کی انصاف پسندی کا یہ عالم ہے کہ واضح طور پر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر ان دونوں میں سے کون سی صنف سخن میں ان کا اظہار زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ ”بارش میں شریک“ میں شامل نظمیں اور غزلیں ان کی فنی ریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

☆☆

اے مری جان تمنا یہ تمنا ہے مری
داغ کوہ میں ہم دونوں ہوں بارش میں شریک
رنگ اڑتے ہوئے دیکھے ہیں گلابوں کے تراب
وہ پری چہرہ تھا پھولوں کی نمائش میں شریک

☆☆

اُس کا بدن تھا میر کا مصرع بنا ہوا
ہم میں بھی جتوئے معانی غضب کی تھی

☆☆

عطا تراب کی نظمیں اپنے منفرد موضوعات و مضامین دونوں طرح سے قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے میں کامیاب رہتی ہیں۔ ان کی نظم میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ دیکھنے کو ملتا ہے اور یہی رکھ رکھاؤ ان کی نظم کی اپنی الگ پہچان بنانے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ موضوع کی مناسبت سے مناسب الفاظ کا چناؤ اور ان کی ترتیب کو پوری دلچسپی اور سنجیدگی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچانا ان کے فن کا خاصہ ہے۔ یہ ان کی نظم سے سنجیدہ وابستگی کا نتیجہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑے موضوع کو بھی چند لائنوں میں سمو کر مطلب کی بات پڑھنے والے تک پہنچا دیتے ہیں۔

عطا تراب کی نظموں میں عشق و رومان کے

موضوعات بھی ملتے ہیں مگر پوری نفاست اور شائستگی کے ساتھ..... ایک نظم بعنوان ”ہجر کا مارا دمبہر“ ملاحظہ فرمائیے۔

تمہارے لہس کا سورج
نجانے وقت کے کس گھاٹ اتر اے
درختوں کو دریدہ چیر بن کرتی
زمنستانی ہوائیں
جب اکیلے جسم پر درے لگاتی ہیں
تمہارے ہجر کا مارا دمبہر
یوں ٹھہرتا ہے

کہ جیتا ہے نہ مرتا ہے
ایک اور نظم ”انتظار“ ملاحظہ فرمائیے۔
نگار حزن کو جبر نہیں
کہ دشت نیوا میں
ایک اشک بے نوا

ہنوز چشم گریہ کن کو رو رہا ہے

”بارش میں شریک“ کی شریک فائزہ خان کی

شاہکار مصوری اور ان کے نظموں کے انگلش تراجم نے کتاب کو ایک نیا رنگ دیا ہے۔ ”بارش میں شریک“ کا مطالعہ کرتے ہوئے میں خود کو کسی اور ہی دنیا میں محسوس کر رہی ہوں۔ رنگ خوشبو اور فطری مناظر سے بھر پور ایک دلکش دنیا..... مناظر فطرت سے گہری محبت اور وابستگی عطا تراب کی نظموں کا خاصہ ہے..... آہ کو صورت نغمہ بنانے والا یہ شاعر زندگی کے گہرے تاریک کھروارے اور سپاٹ مناظر کو بھی اپنے تخلیقی جمال سے رنگین کرنا چلا جاتا ہے..... اور اس کے ساتھ ہی انکشاف اور کرب ذات کا در بھی عطا تراب کی شاعری میں وا ہوتا ہے۔

”اچھی ہوں نا!!“ اس نظم میں کرافٹ کی بلندی

دیکھیے!

ہم جو طوافِ حسن کو آئے
سمت سفر ہی بھول گئے ہیں
آنکھوں کے گرد اتنے گہرے
کالے حلقے!
”اچھی ہوں“ کا کیا مطلب!

ہاں!!

سنگھ کی گہری سانسیں اور بھر پوری نیند
ان کے لیے بھی وقت نہیں ہے!
اتنا بھی کیا لگھنا پڑھنا!
ایسی بھی کیا خانداری!

مجھے نظم کے حوالے سے عطا تراب کی فکر اور انفرادیت نے بہت متاثر کیا ہے۔ عطا کی کچھ نظموں میں زمانے کی مادیت پرستی خود غرضی، منافقانہ رویہ تنگ نظری، سماجی شکست و ریخت کے موضوعات بھی ملتے ہیں۔

”خود سوزی کی ایک خطا“

ساٹھ روپے کا

ایک کھلوتا

لخت جگر کو

دے نہ سکا تو

غربت مارے

باپ نے آخر

طیش میں آ کر

اسی روپے کے

سگرٹ چھوٹے

عطا تراب کی نظمیں جہاں ان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں وہاں عصری حالات اور ان میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور تغیرات کی سماج کی کچی تصویر کی صورت عکاسی بھی کرتی ہیں۔ وہ جبر و استحصال کے ایک ایک جزو پر گہری نظر رکھتے ہیں..... یہ جبر مظلومیت کے کیسے کیسے دکھ بھیرتا ہے!

”غیرت کے نام پر“

ستم ظریف عہد ہے

سگان کم نژاد

بھیڑیوں سے رابطلوں کی

تہمتیں لگا کے

آہواں خوش جمال

کا شکار کر رہے ہیں

اور منصفی سے اب تلک

شعور کی وہ منزلیں ہی طے نہیں ہوئیں

کہ جن کے بعد

خوف و حرص سے گھٹی

گواہوں سے پار دیکھنے کی ریت ہو

سوقا تلوں کو منصفوں سے

رحم کی امید ہے

کہ ناک کے لیے رگ حیات کٹ گئی تو کیا

ستم ظریف عہد ہے

یہ بد نصیب عہد ہے

ان نظموں میں جن مسائل کی تصویر کشی کی گئی ہے، ہم ان کے بارے میں بخوبی جانتے ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ تصویر کا جو رخ وہ دکھاتے ہیں، ہم اس پر کھل کر بات کرنے سے نہ جانے کیوں گریز کرتے ہیں.....؟ شاعر کے زیر تصرف ہر لفظ چاہتا ہے کہ اُس کے وجود کی پوری طرح پذیرائی ہو۔

تیل کی ندرت اور اظہار کی جدت کا امتزاج عطا

تراب کے کلام کا خاصہ ہے۔ ان کی غزل کی کامیابی

کی دو بنیادیں ہیں..... پہلی خوبی یہ ہے کہ ان کی

ترتیب غزل کی اعلیٰ اور زندہ روشنیوں میں ہوئی.....

اور دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کی بلا کی انفرادیت

اجتماعی شعور سے بے نیاز نہیں ہے۔ عطا تراب ایسے

کامیاب اور خوش نصیب شاعر ہیں کہ ان کے مشہور

شعر ہماری اعلیٰ غزل گوئی کے تنقیدی معیار پر پورے

سچے کامیاب

244

سچے کامیاب

245

سچے کامیاب

سچے کامیاب

سچے کامیاب

سچے کامیاب

سچے کامیاب

سچے کامیاب

اترتے ہیں۔ دراصل یہ امتیاز ایک اچھے شاعر کی پہچان ہے۔

☆☆

ایوان صدر میں یہ صدا تھی فقیر کی
ہم لوگ مانگتے ہیں مگر لونتے نہیں

☆☆

کتی بے صبر ضرورت تھی کہ اس گھر کے لوگ
بچ آئے ہیں شجر کاٹ کے پھل سے پہلے

☆☆

یہاں ہماری ریاضت بھی رائیگاں ٹھہری
یہ عہد عہد تجارت ہے کیا کیا جائے

☆☆

سماجی لحاظ سے عطا تراب کی شاعری میں ان
دکھوں کو نظم کیا گیا ہے جو وہ اپنے ارد گرد دیکھتے اور
محسوس کرتے ہیں۔ یہ دکھ منظروں کی صورت میں
بھی ہیں اور لفظوں کی صورت میں بھی..... وہ ان
مسائل کو بیان کرتے ہوئے کسی ایک سماجی حقائق کو
مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے شعروں
میں بہت سے سوال ہیں!!

تو ہی لب کھول وہ کس سمت میں بھاگے دریا
پیچھے سیلاب ہو جس شخص کے آگے دریا
ہم یہ سیلاب نے شب خوں تو نہیں مارا تھا
جرم اپنا ہے کہ ہم دہرے سے جاگے دریا
اس لیے دشت میں پانی کا گماں ہوتا ہے
لوگ کہتے ہیں یہاں بہتا تھا آگے دریا
ایسی تقسیم یہ شکوہ تو ضروری ہے تراب
سو گئے خط زدہ لوگ تو جاگے دریا

☆☆

عطا تراب کی نظم ”سیلاب میں گھرے یتیم بچے
کی روداد“ کی چند لائیں ملاحظہ فرمائیے اور دکھ درد کی
شدت کو دل سے محسوس کیجیے!

رخصت ہوئی ماں نے مجھ سے اتنا کہا تھا
رو نامت!

رونے سے سیلاب کا پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے
ماں کا حکم تو سراسر آنکھوں پر
لیکن یہ سیلاب کا پانی!!!!

☆☆

غزل کی روایت ہماری تہذیب کی مضبوط
روایت ہے۔ اردو غزل کی ابتدا سے فیش و فراق تک
ہر سچے شاعر نے غزل کی مقررہ لفظیات میں اپنی
انفرادیت کے نقش ابھارے ہیں۔ عطا تراب کی
غزل کا مفرد انداز ہی غزل کی خوبصورتی ہے.....

عصری حقیقتوں کا ادراک معاشرتی مسائل کی عکاسی
غزل کا خالص رومانی اسلوب کا خوبصورت امتزاج
ہے۔ ان کی غزل و سنج کیونوں کی غزل ہے۔ عطا
تراب اپنے عہد کی شہری روایات، جمالیات اور ادبی
تحریکات کے رمز شناس ہیں انہوں نے اپنی غزل
میں وہ سارے نقوش ابھارے ہیں جن میں ان کا
عہد کروٹیں لیتا ہے..... عطا کے ہاں غزل اپنے
سارے لوازم کے ساتھ آئی ہے اور کتنے ہی جہانوں
کو اپنے باشعور قاری پر متکشف کرتی ہے..... عطا
تراب کا قافلہ فکر رواں دواں ہے اور ان کی غزل کو
ابھی اور جہانوں میں سفر کرنا ہے.....!

زندگی عشق میں آسمان بھی ہو سکتی ہے
میری قاتل ہی مری جان بھی ہو سکتی ہے
اس محبت کو جو ایمان سمجھتی ہے تراب
اس محبت پہ پشیمان بھی ہو سکتی ہے

☆☆

میں نے تو خواب میں یہ حقیقت بھی دکھی لی
سورج بجھے ہوئے ہیں گر بیان وقت میں
جو گرد باؤم میں کہیں کھو گئے تراب
وہ پل ملیں گے خاک بیابان وقت میں

☆☆

موت اب ناگزیر ٹھہری ہے
زہر جیون کا پی چکا ہوں میں

☆☆

شدت غم سے کیا رقص تو اڑا اڑ کے بڑی
عشق میں گریہ کنائں میر کے دیوان پہ خاک
عطا تراب کے اشعار آفاقی صدائوں کی خبر

دیتے ہیں وہ سچائی کے طلب گار اور حسن باطنی کے
پرستار ہیں وہ اپنے عہد کے المیوں پر نظر دوڑاتے
ہیں تو ان کی شاعری اپنے عہد کا ایک ”دل سوز نوحہ“
بن جاتی ہے۔

تدریجی نسل نشی

دھواں دھواں ہے زندگی
نفس نرس میں زہر کے ہیں ذائقے گھلے ہوئے
یہ خود کشی عجیب ہے

کہ اپنی آئی نسل کی ہیں مرگ پر تے ہوئے

☆☆

عطا تراب کا اسلوب ہم عصر شعراء سے مختلف
ذائقہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے قاری کو پہلے ایک خاص فطری
ماحول میں لے جاتے ہیں اور پھر اس کے جذبات و
احساسات کو اپنے لفظوں کا اسیر کر لیتے ہیں۔

☆☆

افسوس! مانگ بیٹھا دُعا میں سکون کی
حد ہو گئی ہے آج تو اپنے جنون کی

☆☆

عطا تراب نئے سے نئے مضامین کو باندھنے
میں اپنا ثانی نہیں رکھتے، ان کی شاعری میں فارسی
تراکیب اور رکھ رکھاؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ”بارش میں
شریک“ میں شامل غزلیات کی ایک اور خوبی یہ ہے
کہ مترنم جوار کے ساتھ ساتھ الفاظ کے صوتی اثرات
کا بھی خاص خیال رکھا گیا ہے۔

اب ترے لوٹ کے آنے کی کوئی آس نہیں
تو جدا مجھ سے ہوا آنکھ سے آنسو کی طرح
اب ہمیں اپنی جہالت پہ ہنسی آتی ہے
ہم کبھی خود کو سمجھتے تھے ارسطو کی طرح
ہاں تجھے بھی تو میسر نہیں تجھ سا کوئی
ہے ترا عرش بھی ویراں مرے پہلو کی طرح

☆☆

عطا تراب کی نظمیں وجودی صورت حال، عصری
اور سماجی حقائق کی لمبی جلتی کیفیات کا تلخ اور شدید
اظہار یہ ہیں۔ نظموں کی ترانے سے اس بات کا اندازہ
ہوتا ہے کہ ”بارش میں شریک“ کے خالق نے طویل فنی
و فکری سفر طے کیا ہے۔ ان کے لفظی اور فائزہ خان
کے تصویری پیکر بہت باکمال ہیں۔ عطا تراب کا
طرز شاعری ایسے الفاظ و تراکیب کی مدد سے اپنی
تعمیل کرتا ہے جن میں تاثیر بھری ہوئی ہے مثلاً.....!

میں اپنی حوا

سے کب کہوں گا

کہ تجھ سے نام

ہے تیرا آدم

☆☆

”تعارف“

تراب تم بھی عجیب مشکل سے آدی ہو

کہ کوئی کتنا ہی خوبصورت ہو

کوئی کتنا ہی دلربا ہو

کہ کوئی چاہے ہزار جانیں

تمہارے دل پر کرے نچھاور

برایک مدت سے بڑھ کے تم نے

بھی محبت نہیں نبھائی

تراب تم بھی عجیب مشکل سے آدی ہو

☆☆

عطا تراب کے ہاں حساسیت، ظلم کے خلاف

بھی نہیں کہ کسی کو دو بول محبت کے ہی کہہ سکے۔ چہرے پہ چہرے بدلتے لوگ کیا جانیں محبتوں کے رشتے کیسے ہوتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی نے یہ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی لوگ صرف دولت شہرت سے محبت کرتے ہیں حسن کے پجاری جسموں سے کھلنے والے کیا جانیں دل کیا ہوتا ہے۔ کاش کوئی اندر کے دکھ بھی بانٹ لیتا۔ بہت کم لوگ دنیا میں ایسے ملتے ہیں جو کسی کے درد کو محسوس کرتے ہیں۔ انسان میں صرف لالچ اور مکاری بھگری ہے ہر چیز کھو کھلی ہوگئی ہے رشتوں کی پہچان ختم ہوگئی ہے لوگ زندگیوں سے کھیلنے ہیں اور دلوں کو کھلونا سمجھتے ہیں پتائیں انسان ایسا کیوں کرتا ہے؟ شاید اپنی انا کے لیے؟ لیکن میری دعا ہے کہ ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے ہوں نفرتوں کے جال نہ ہوں، محبتیں عام ہو جائیں دکھ درد ختم ہو جائیں، کبھی ایک ہو جائیں اور ایک دوسرے کے غموں کو بانٹ لیں اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔ ذرا اس بارے میں سوچئے گا۔

ڈرامہ بازی

کرن شہیر، کراچی

موجودہ دور میں ڈراموں کی بھرمار ہے لیکن ڈراموں کا معیار پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے۔ آج سو ڈیڑھ سو اقساط پر مبنی طویل ڈرامے پیش کیے جاتے ہیں جنہیں ”ڈیلی سوپ“ کا نام دیا جاتا ہے گران کے آغاز اور اختتام کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ کہانی غیر منطقی انداز سے آگے بڑھتی ہے ڈرامہ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو شیطان کی آنت کی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ڈرامے کو بڑھانے کے لیے غیر ضروری مناظر کا سہارا لیا جاتا ہے جن سے کہانی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا جبکہ بعض اوقات تو کہانی کا ہی پتہ نہیں چلتا۔ ڈرامے اتنے طویل ہو جاتے ہیں کہ ایک کردار کو کوئی دوسرا ادا کار کرنے لگتا ہے۔ کیبل ٹی وی کی وجہ سے غیر ملکی چینلوں کی بھرمار ہوگئی ہے۔ بڑی ملک کے ٹی وی ڈراموں میں کوئی مقصد کی بات نظر نہیں آتی۔ گھریلو سازشوں، ساس بہو کے لڑائی جھگڑے، فیشن، فاشی بے راہ روی سے آراستہ یہ ڈرامے ہماری نسل کے اخلاق و کردار کے بگاڑ کا سبب بن رہے ہیں۔ ان میں کوئی مثبت پہلو نظر نہیں آتا۔ ذہنوں پر غلط اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ان کی تقلید میں ہمارے یہاں بھی ایسے ہی بے سرو پا ڈرامے بن رہے ہیں۔ ڈرامے انہیں کہا جاتا ہے چونکہ معیار پر بھی پورے اثریں اور اخلاق کے معیار پر بھی اور جنہیں پوری توجہ کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنے میں کوئی شرمندگی محسوس نہ ہو۔

میری ساتھی

شیخ معظم العلی لاہور

میری ساتھی میری ہم سفر ہر طرح کا ساتھ دینے والی شاید کوئی دنیا میں ہوگی۔ اتنی سادہ شرمیلی میں نے آج تک نہیں دیکھی، میری ساتھی کی ہنسی رنگت خوبصورت مسکراہٹ اور نیلا ہٹ مائل سبز جھلک دیتی آنکھیں کسی بہت ہی اچھے نوٹو گرافر کے کمال فن کا نمونہ تھیں۔ اس کے سیاہ لمبے بال کمر سے نیچے تک لہراتے تھے وہ جوڑا باندھ کر نکلتی تھی بے حد سادگی میں اس کا حسن اور بھی اٹوکھا ہو جاتا۔ وہ ہر روز تیار ہو کر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر فخریہ اپنا جائزہ لیا کرتی تھی۔ وہ میک اپ نہیں کرتی تھی اس کے نزدیک میک اپ قدرتی حسن کی توہین تھا۔ اس کا لباس بھی سادہ ہوا کرتا تھا، بعض اوقات میک اپ نہ کرنے اور جدید فیشن کے لباس استعمال نہ کرنے پر اس کا خوب مذاق اڑایا جاتا تھا مگر اس نے کبھی بھی اس مذاق کا برا نہیں منایا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی کہ میں دوسو برس پرانی عورت ہوں مجھے اس کی یہ بات اچھی لگتی تھی کیونکہ سادگی میں جو بات ہے وہ فیشن میں نہیں ہے۔ سادگی کا اپنا حسن ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ 16 اکتوبر 1996ء کو میری ساتھی، میری ہمدرد شریک حیات کا جب انتقال

ہوا تو وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ابھی ابھی سوئی ہے تھوڑی دیر کے بعد وہ جاگ جائے گی۔ میں ہمیشہ اُس کے لیے دعا گو رہوں گا اور اسے کبھی بھلا نہ پاؤں گا۔

نماز

سہیل خان کورنگی

نماز جنت کی کنجی ہے۔ جس نے نماز کو اپنی زندگی میں شامل کر لیا تو میرا ایمان ہے اللہ بھی اُس بندے پر اپنی مہربانیاں فرماتا ہے اور اللہ اُسے اپنے سوا کسی کا محتاج نہیں کرتا۔ نماز کے الفاظ پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ن سے نبی م سے محمد الف سے اللہ ز سے زندگی یعنی اللہ نے اپنے نبی اور محمد کو ہماری زندگی میں نماز کی صورت شامل کر دیا ہے۔ جب یہ سب ایک جگہ جمع ہو جائیں تو اُس بندے کی زندگی ہی سنور جائے گی۔ وہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو گیا کیونکہ جب بندے کو اس دنیا سے اٹھایا جائے گا تو سب سے پہلا سوال نماز کا ہی ہوگا۔ نماز ہی پریشانیوں اور مصیبتوں کا حل ہے۔ نماز ہی سب بیماریوں کا علاج ہے۔ نماز ہی کے ذریعے بندہ اپنے رب سے مخاطب ہوتا ہے اور اللہ اسے سب پریشانیوں سے نجات دے دیتا ہے کیونکہ نماز پڑھنے سے بندہ پاک ہوتا ہے اور اُس کی موت بھی اچھی حالت میں ہوتی ہے۔ نماز پڑھنے سے آدمی کی ورزش بھی ہو جاتی ہے جو کہ صحت کے لیے بھی ضروری ہے۔ میں جب سے نماز کا پابند ہوا ہوں اللہ نے مجھے پریشانی اور غموں سے دور کر دیا ہے۔ ہمت اور توانائی دی ورنہ جو غم مجھے ملے ہیں اگر میں نماز کا پابند نہ ہوتا تو آج ریت کی طرح بکھر چکا ہوتا۔ جب بچہ تھا تو میں نے جوان باپ کا جنازہ اٹھایا جو ٹی بی کی بیماری میں انتقال کر گئے۔ جب جوان ہوا تو جوان بھائی کا جنازہ اٹھایا جو کینسر کا شکار بنا۔ میرا ایک ہی بھائی تھا جب بڑھا پلے میں قدم رکھا تو جوان بیٹا جو کہ ایک ہی ہے، ایب نارمل ہو گیا جو کہ نہ چل سکتا ہے نہ بول سکتا ہے۔ اسے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتا ہوں اور اپنے ہی ہاتھ سے ہاتھ روم اٹھا کر لے جاتا ہوں۔ ہر وقت اس کے لیے سوچتا ہوں مگر نماز نے نہ تو مجھے کبھی مایوس کیا نہ اکیلے پن کا احساس ہونے دیا کہ میرا کوئی سہارا نہیں ہے نہ کبھی یہی محسوس ہوئی۔ خدا کی قسم! یہ نماز کی طاقت تھی جس نے میرے حوصلے بلند کیے اور اللہ پر یقین رکھا۔ جب بھی یہ چیزیں آئیں نماز کا سہارا لیا اور رو کر اللہ سے دعا مانگی اور اللہ نے وہ دعا پوری کی اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے جب بھی دعا مانگی اور وہ پوری نہ ہوئی ہو۔ اگر میرے رب نے مجھے غم دینے تو صبر بھی اس نے ہی دیا۔ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ نماز ہی میرا سہارا ہے لہذا نماز کو اپنی زندگی میں شامل کر لو گے تو انشاء اللہ آپ کی پریشانی بھی دور ہو جائے گی۔ نماز پڑھنے سے ایمان مضبوط ہوتا ہے اور اللہ پر یقین پکا ہوتا ہے۔ اگر میری تحریر میں غلطی ہوگی، ہو تو اللہ مجھے معاف کرے کیونکہ میں کوئی لکھاری نہیں ہوں جو میرے دل میں ہے اور جو میں نے نماز میں بایا وہ لکھ دیا۔ بس میری اللہ سے دعا ہے کہ میرے ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ کا اثر کسی ایک پر ہو جائے تو میرے لکھنے کا مقصد پورا ہو جائے۔

ایک انسان دُورخ

محمد آصف ریاض ملت کالج

دور حاضر کا انسان تھکا تھکا، اداس، بوجھل، مایوس و بے زار دکھائی دیتا ہے جیسے اس دنیا میں اُس کے لیے کوئی کشش نہیں، شخص اداسیاں اس کا مقدر ہیں۔ یہ اداسیاں دراصل طویل محرومیوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ایک بچہ جسے کھلونوں کی خواہش ہے ان سے مسلسل محرومی اسے اداس کر دیتی ہے۔ وہ بھی کبھی خوش بھی دکھائی دیتا ہے لیکن اندرونی طور پر ایک آہ کالج اس کے من میں پھوٹ چکا ہوتا ہے۔ جوں جوں وہ زندگی کی منازل طے کرتا جاتا ہے

بے شمار ایسی خواہشات اس کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہیں اور خواہشات کا وہ تھا سا ہوا ایک تناور درخت بن جاتا ہے۔ خواہشات نے موجودہ انسان کو کچھ زیادہ ہی اپنی غلامی میں لے لیا ہے وہ بغیر کسی کوشش کے اپنی ہر خواہش کی تکمیل چاہتا ہے۔ اس نے اپنی خواہشات کو اتنا وسیع کر لیا ہے کہ وہ انہی کی تکمیل میں اندر سے ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ موجودہ انسان الدین کے چراغ کا تمنائی ہے تاکہ صرف رگڑنے سے جن کو حاضر کر لے اور جھٹ پٹ اپنی خواہش اس پر ظاہر کر دے۔ ہو سکتا ہے کبھی ایسا بھی ہو کہ چراغ کو رگڑنے کے لیے بھی اسے ایک نوکر کی ضرورت ہو۔ ایک انسان نے دوسرے انسان کا سانس لینا بھی دو بھر کر دیا ہے۔ ہر لمحہ ایک نئی آرزو کی تکمیل کی فکر میں گھل رہے ہوتے ہیں۔ ایک عجیب سا معیار سب لوگوں نے اپنا لیا ہے۔ ان چمکتے اور سجے چہروں کو ذوق برق لباس زیب تن کرنے والوں کو اونچے لوگ خیال کر کے اُن پر دل و جان نچھاور کیے جاتے ہیں جبکہ خود یہ چمکیلے چہرے نجانے کتنے غم تہہ در تہہ اور کتنی آرزوئیں ناقصا دل میں چھپائے پھرتے ہیں۔ سادگی ایک لفظ ہے جو کتا بوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ ایک سادہ لوح اور سادگی پسند شخص کے لیے اس معاشرے میں کوئی مقام نہیں۔ اس کے سادہ لباس کو دیکھ کر یہ بناؤنی چہرے اس پر دل ہی دل میں تہمت لگاتے ہیں اور آنکھوں سے طنز کے ایسے تیر چلاتے ہیں کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ کسی محفل میں جانے کے لیے چہرے کو میک اپ کی اتنی تہوں تلے چھپا دیا جاتا ہے کہ اصلی چہرہ ناقابل پہچان ہو جاتا ہے اور جب تک شریک محفل رہیں تہمتوں پر تہمت لگا کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا جاتا ہے۔ عجب احمقانہ باتیں سنا کر دوسروں کو بھی تہمت لگانے پر مجبور کیا جاتا ہے اور پھر یہ مصنوعی تہمت لگانے والے جب گہروں کو لومٹے ہیں تو ان تہمتوں کا حساب رات کے اندھیرے میں آنسوؤں سے چکاتے ہیں۔ ان انگلیاں آنکھوں سے غموں کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہری و باطنی انسان میں کوسوں کا فاصلہ دکھائی دیتا ہے۔ بیرونی انسان ہر لمحہ خوش و شادمان اور بے فکر سادگمانی دیتا ہے جبکہ اندرونی انسان بے شمار دکھوں کا بوجھ سہتے سہتے ختم ہو جاتا ہے۔ غریب کو غربت پریشان کیے ہوئے ہے تو امیر کو دولت میں اضافے کی فکر چین سے سونے نہیں دیتی۔ ایک بے چینی کی لہر ہے جو ہر ذی روح میں سرایت کر گئی ہے۔ اوپر سے خوش اور اندر سے افسردہ یہ انسان آخر تک زندگی کے شب و روز ایسی طرح بسر کرتا رہے گا کب تک؟؟

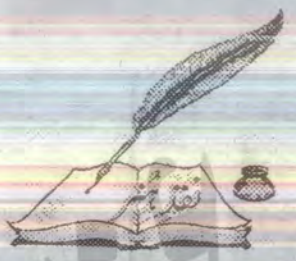
میٹھے بول کا جادو

مہر نسیم اسلام آباد

جس طرح کوئی بھی میٹھی چیز زبان کو اور سارے منہ کو شیریں کر دیتی ہے اسی طرح انسان کی زبان سے نکلے میٹھے بول ارد گرد کے ماحول کو امن اور محبت کا گہوارہ بنا دیتے ہیں۔ ہماری زبان سے نکلنے والے چند پیار بھرے جملے کسی بھی انسان کی زندگی کو خوشگوار اور حسین بنا سکتے ہیں۔ ایک بلکتے ہوئے انسان پر میٹھے بول جادو کا اثر کرتے ہیں، کسی بھی اداس انسان کی زندگی کو جگمگا سکتے ہیں۔ خدا را! اپنی زبان سے زہر آلود جملے نہ نکالے۔ میٹھے بول ہی کسی کی زندگی کو بچا سکتے ہیں، کسی کو زندگی دے سکتے ہیں، کسی کی زندگی کو خوشیوں سے ہم کنار کر سکتے ہیں یہ معمولی معاملہ نہیں ہے، معمولی بات نہیں ہے۔ آج اگر میٹھے بول کے جادو کا اثر جان لیں تو معاشرے سے آدمی سے زیادہ برائیاں ویسے ہی ختم ہو جائیں گی کیونکہ اکثر مسائل اس زبان کے سبب ہی پیدا ہوتے ہیں۔

زبان شیریں ملک گیری
محبت فلاح عالم

☆☆☆



چراغ لینا

خدا کے لیے شائب تم
چراغ کے جانا
وہ خواب جس کو کسی نے دیکھا
ہمارے ہر کہوں نے تعبیر ڈھونڈی
لہو لبہاں تم نے تعبیر کر دی
مگر خدا کے لیے بچانا
کہ خواب سچا
کہ خواب ورثہ
تم اس خواب کو اب چراغ لینا
علی آذر - کراچی

میں اور.....!

میں اور میری تنہائی
اور ساتھ ہوتی ہیں
تیری یادیں
زندگی کے اس طویل سفر میں
آنسو کہیں رکھتے نہیں
ساری رات
اور پھر صبح کا آغاز ہوتے ہی
دل کو بے چینی ہونے لگتی ہے
پھر شام..... اور اس شام.....!
و حلیے و حلیے تڑپاتی ہے
رلاتی ہے دل کو جلاتی ہے
اور پھر وہی
میں اور میری تنہائی ہوتی ہے!
مور شاہد حسین، کراچی۔

چہرے

لا تعداد چہرے!
جیسے تھکن زدہ یہ جزیرے
ان چہروں پر بہتے کہرے دکھ.....
لہروں کی صورت سانس لیتے ہیں!
تشنہ تھکی سیالکوٹ۔

سنو.....!

سنو تم سے کچھ کہنا ہے
مگر ڈرتا ہوں
کہ نہیں پاتا
تجسس دیکھوں تو یوں لگتا ہے
چاند اس دھرتی پر آ آیا ہو جسے
تیری باتوں کی خوشبو سے
میرے دل کا آنگن مہکتا ہے
یہ سب تم سے کہنا ہے
بہت پیار ہے تم سے
یہ کہ نہیں پاتا
کیونکہ
مجھے ڈر ہے
ٹھکرانے جانے کا.....

ممتاز احمد، سرگودھا۔

پھول

ایک پھول مر چھایا تو کیا
فضائے کسے بخشا ہے
دوسرا بھی آیا تو کیا.....!

پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار ادبی ذوق کے آئینہ دار

امبر ظفر..... کراچی
چوٹ پر چوٹ کھا رہا ہے دل
یہ حقیقی چٹان ہے خرم
کامران عباسی..... حیدرآباد
اتنا گھٹا دیا ہے مجھے دنیا کی حرص نے
اعد سے آج اپنے برابر نہیں ہوں میں
زرگس جمال..... حیدرآباد
بجز تیرے کوئی نہیں دوسرا
بس اک ٹوٹی ہوئی ہے یہاں ہر طرف
عبداللہ شاہد..... حیدرآباد
زلزلہ سیہ کو پاؤں کی زنجیر کر چکا
قاتل ہمارے قتل کی تدبیر کر چکا
مرضی ہے جو سلوک روا اس سے تم رکھو
جو شخص اپنے آپ کو تقدیر کر چکا
شازیہ..... کراچی
ان کی آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں عدم
ہم یہ تصنیف اک کتاب کرو
غلام حیدر و لٹاڈ..... بلتستان
ٹوٹی ہے مری نیند مگر تم کو اس سے کیا
بچتے رہیں ہواؤں سے دم توڑ کر اس سے کیا
فراز..... لاہور
سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے
سدرہ انور علی..... جنگ
اپنے ہاتھوں کی لکیروں پہ بگڑ جاتے ہیں
ہم تو پاگل ہیں ہواؤں سے بھی لڑ جاتے ہیں
تم بھند ہو کہ چلو ساتھ ہمارے لیکن
ہم تو مسافر ہیں ہواؤں سے بھی لڑ جاتے ہیں

فرید عالم نقشبندی..... کراچی
تصور میں چلے آؤ کہ میں دیدار ہی کر لوں
تمنا تم سے ملنے کی پوری ہو نہیں سکتی
شازیہ عارف..... ساہیوال
کیا بڑی افتاد آخر کہتے سنتے ماجرا
کہتے سنتے ماجرا بے ماجرا کیوں ہو گئے
نعمت دنیا و دین کیا یہ بھی سے کوئی مزہ
سب مزے اک اک کر کے بے مزہ کیوں ہو گئے
گہمت میر..... ادا کاڑھ
ہم یہ کیسا سماج رکھتے ہیں
لغو رسم و رواج رکھتے ہیں
سب رتوں میں ہرے نہیں رہتے
زخم اپنا مزاج رکھتے ہیں
حنالطیف..... کراچی
تم جو غیروں کی بات کرتے ہو
میری چاہت میں کچھ کمی ہوگی
بابر الیاس..... کراچی
وہ شخص جسے ملتی رہیں ماں کی دعائیں
وہ زیست میں کچھ بھی بھی ہارا نہیں ہوگا
جن رشتوں کی اخلاص یہ بنیاد نہ ہوگی
ان رشتوں کا کوئی بھی سہارا نہیں ہوگا
یاسین اعوان..... کوپرا
الفتوں میں سدا خسارہ رہا
نہ کبھی کوئی ہمارا رہا
ہار اپنا نصیب بنتی رہی
جیت کا لمحہ بس تمہارا رہا
یاسین..... پورے والا
نہیں ہے اب ترے وعدوں پہ اعتبار کوئی
جو ہو سکے تو پرانے وہ خواب دے دے مجھے

جگنو
تیری یاد کا جگنو جب جگمگاتا ہے
زیر بناتا ہے رگوں میں ابو
دل ٹھہرا جاتا ہے
جاوید عثمان زندانی۔ کراچی۔
کیوں!
نا جانے کیوں؟
وہ لوگ ریت کی طرح
ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں
جن کو ہم زندگی سمجھتے ہیں
کبھی کھونا نہیں چاہتے!
لیلیٰ مرادہ اقبال۔ سیالکوٹ۔
کتنا آسان ہے
کتنا آسان ہے
برے دنوں کا آجانا
اچھے وقت کا بدل جانا
محبتوں کا نفرتوں کے خوف سے
سمٹ جانا
اور.....!
مخفلوں کا تنہائیں میں
بٹ جانا
دکھ مناظر کا یوں
چلتے چلتے رک جانا
محبت سے جدائی کا جیت جانا
اور
پیار کے حسین دور کا جیت جانا
کتنا آسان ہے
کتنا آسان ہے
ارباب قربان علی ایری بھاگ شہر
آباد
دہ مجھے یاد نہیں کرتا
ہاں مگر
یہ بھی جگ ہے
کہ اس کے خیالوں میں
آباد ہیں ہم.....!
ماریہ جلال۔ کراچی۔
اے انسان.....!
اے انسان
کیا سب ہے اس تکبر کا جو
تیرے دل میں
گنڈی مار کر بیٹھا ہے
کیا تو نے نہیں دیکھا
ان پتوں کو
جو پت جھڑ میں جھڑ جایا کرتے ہیں
نئے پتے ان کی جگہ
آ جایا کرتے ہیں
ڈاکٹر حنا عبدالقیوم خان۔ حیدرآباد۔
☆☆☆

شانہ..... سیالکوٹ
درد کا کہنا، حیح اٹھو دل کا کہنا، وضع نبھاؤ
سب کچھ بہنا، جب رہنا کام ہے عزت داروں کا
حضور بخش گنول..... ظاہر بے پیر
دل میں ہوتا تو بھلا دیے فراز
وہ محض دور تک بسا ہے مجھ میں
حیات خان..... یونیور
تھے کب پکارا نہیں جا رہا
فراق اب سہارا نہیں جا رہا
عجب نے کئی ہے، پس عشق بھی
یہ لمحہ گزرا، نہیں جا رہا
رضوانہ کوثر..... لاہور
ہماری صبح کسی شام سے نہیں ملتی
یہ وہ چمکن ہے جو آرام سے نہیں ملتی
انعام الہی عارف..... کراچی
وہ آنکھ جس میں کوئی خواہش وصال نہ تھی
ہزار بار اٹھی حسن کی سلائی کو
کوثر اسلم..... راولپنڈی
حوصلہ دینے جو آتے ہیں، بتائیں انہیں کیا
ہم تو ہمت ہی نہیں، خواب بھی ہارے ہوئے ہیں
وفا عباسی..... ہری پور ہزارہ
زمانہ جس کو ڈرائے مسافتوں سے قتل
مرا خدا اسے جلنے کو پاؤں دیتا ہے
عبدالقیوم..... کراچی
اڑتے پرندوں کو کوئی قید نہیں کر سکتا
جو اپنے ہوتے ہیں، خود ہی لوٹ آتے ہیں
صبا صغیر..... کراچی
یہ سوچ لیا ہے اب اس کو آواز نہیں دینی حسن
اب کے میں بھی تو دیکھوں وہ میرا طلبگار ہے کتنا
آسیہ خان..... ہارون آباد
تیرے لوٹ کے آنے کا امکان نہیں ہے پھر بھی
رت جگا اپنا مقدر بنا لیا میں نے

عائشہ آصف..... کوئٹہ
آج تم یاد بے حساب آئے
آنکھ سے پھر ٹوٹ کے برسا سادوں
سلطان قریشی..... فیروز پورہ
بے جا تجاویزات میں کچے مکاں گئے
معدوم کوئی اونچی عمارت نہیں ہوئی
فرحیہ خان..... پشاور
جسے بہار کے مہمان خالی چھوڑ گئے
وہ اک مکان ابھی تک مکین کی چاہ میں ہے
مشعل..... کراچی
کچھ دن تو میرا عکس رہا آئینے میں نقش
پھر یوں ہوا کہ میرا یہ چہرہ بدل گیا
فرح خان..... اسلام آباد
اتر رہی ہیں عجب خوشبوئیں رگ و پے میں
یہ کس کو چھو کے مرے شہر میں صبا آئی ہے
بشری مغل..... ملتان
کناروں کے دل کچھلے تو دریا ہوئے جاری
اور لوگ یہ کہتے ہیں کہ پتھر نہیں روتے
ناظم وقاص..... لاہور
محبت میں زخم جگر چاہتا ہوں
میں لہجے میں اپنے اثر چاہتا ہوں
رہو سامنے تم نگاہوں کے میری
بہی بس میں شام و سحر چاہتا ہوں
علقمہ سحر..... پشاور
محبت ایک جیسی ہے، وفائیں ایک جیسی ہیں
یہاں موسم بدلنے پر ہوا میں ایک جیسی ہیں
عجب شہر سخن آباد ہے مچری سماعت میں
عجب شہر محوشاں ہے صدا میں ایک جیسی ہیں
سید فرحان احمد..... کراچی
یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گریز سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
☆☆.....

آپ کی خبر

♦..... انتقال پر ملال.....♦

دو شیزہ کی دیرینہ لکھاری تسنیم منیر علوی کے شوہر
منیر الدین علوی گزشتہ دنوں دہلی میں نقصانے الہی
سے انتقال کر گئے۔ دکھ کی اس گھڑی میں ہم تسنیم
سے دلی تعزیت کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ خدا
مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور
لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین!) قارئین
سے بھی دعائی خصوصی درخواست ہے۔

♦..... دُعاے صحت.....♦

امریکہ میں مقیم معروف سینئر رائٹر قمر علی عباسی کو
دل کا دورہ پڑا ہے۔ وہ بستری عیال پر ہیں۔ قارئین
سے گزارش ہے کہ ان کی صحت یابی کے لیے خصوصی
دعا کریں۔ ہم بھی دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہیں
کہ خدا انہیں شفاء عطا فرمائے۔ (آمین!)

ہماری سینئر لکھاری اور شاعرہ رضوانہ کوثر کی
بہو عظمیٰ جمال اور بھانجی شکر یہ نذیر بیمار ہیں۔
قارئین سے التماس ہے کہ دونوں کی صحت یابی
کے لیے دُعا کریں۔ ہم بھی دُعا گو ہیں کہ خدا
انہیں جلد از جلد شفاء کے کاملہ و عاجلہ عطا فرمائے۔
(آمین!)

☆..... مبارک باد.....☆

ہمارے بہت اچھے دوست اور سچی کہانیاں کے
قاری غلام حیدر و شاہد کو خدا نے بیٹے کی نعمت سے
نوازا ہے۔ ہماری طرف سے حیدر کو بہت بہت
مبارک باد قبول ہو۔ دُعا ہے کہ خدا انہیں مولود کو خوشیوں
سے بھری لمبی عمر عطا فرمائے۔ (آمین!)

☆..... سالگرہ مبارک.....☆
رضوانہ کوثر کی بھانجی شکر یہ نذیر کی سالگرہ اور
بھانجے عمر کی شادی کی سالگرہ 29 جون کو ہے۔ ہماری
طرف سے دونوں کو بہت ہماری دُعاؤں کے ساتھ
بہت بہت مبارک باد قبول ہو۔

ہماری دوست لکھاری مینا تاج 3 جون کو اپنا جنم
دن منارہی ہیں۔ ہماری طرف سے مینا کو بہت بہت
مبارک باد! ہم دعا کرتے ہیں کہ مینا کی زندگی کا سفر
خوشیوں، مسرتوں، کامیابیوں اور کامرائیوں کے
ساتھ جاری و ساری رہے اور اسی طرح ان کے قلم
سے ایک سے بڑھ کر ایک شاہکار تخلیق ہوتا رہے۔
(آمین!)

📖..... کتاب خبر.....📖

📖 ہماری بہت پیاری اور سینئر رائٹر صفیہ
سلطانہ مغل کا افسانوں اور ناولٹ پر مشتمل مجموعہ
”مشت خاک کا سفر“ شائع ہو گیا ہے۔ ہماری طرف
سے صفیہ کو ڈھیروں ڈھیروں مبارکباد۔ دُعا ہے کہ وہ
شاہراہ ادب پر اسی طرح کامیابیوں کے سنگ میل
عبور کرتی رہیں۔ (آمین!)

📖 ہمارے دیرینہ دوست لکھاری اشعر جواد کا
شعری مجموعہ ”مفہوم“ منظر عام پر آ گیا ہے۔ ہم
انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتے
ہیں اور دعا گو ہیں کہ ان کی کامیابیوں کا سفر یونہی
جاری و ساری رہے۔

”آپ کی خبر“ کا حصہ بننے کے لیے
تمام رائٹرز اور قارئین بلا جھجک اپنی خبریں ادارے کو
بھیج سکتے ہیں۔

نوٹ: اب شعر کے ساتھ شاعر کا نام لکھنا ضروری
نہیں۔ اچھے اور معیاری اشعار ارسال کریں۔